



# نیب مغرب

## سچ جو ہم سے چھپایا گیا

راجہ مبین اللہ خان



سوال یہ ہے کہ نظام کون چلا رہا ہے ؟ اگر سب  
کچھ اشرافیہ کے کنٹرول میں ہے تو پھر  
جمهوریت اور آزادی کا کیا مطلب رہ جاتا ہے ؟

سید حسن عباسی

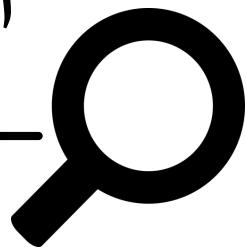
"اُس بچے کے نام جسے امن دیکھنا نصیب نہیں ہوا۔"

"مغرب نے دنیا کو اپنی نظریاتی یا اخلاقی برتری سے نہیں بلکہ منظم تشدد کے استعمال میں برتری کی بناء پر فتح کیا۔ مغربی لوگ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں، مگر غیر مغربی کبھی نہیں بھولتے۔"

سیموئیل پی ہنٹنگٹن

ابواب

1



جنوبی امریکہ

1

افریقہ

2

ایشیا

3

یورپ

4

تجزیہ

5

## پیش لفظ

مغرب کو جمہوریت، انسانی حقوق اور آزادی اٹھار کا علمبردار سمجھا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مغرب نے اپنے ملکوں میں مضبوط جمہوری ادارے قائم کیے اور شہری آزادیوں کا ایک مؤثر نظام بنایا۔ مگر سوال یہ ہے کہ کیا یہی اصول وہ دنیا کے دوسرے ملکوں پر بھی لاگو کرتے ہیں؟

یہ یہ ہے کہ جہاں اپنے ملکوں میں وہ جمہوریت اور حقوق کے محافظ نظر آتے ہیں، وہیں دوسری قوموں میں انہوں نے بدترین آمریتوں کی حمایت کی، فوجی حکومتوں کو طاقت دی اور آزادیوں کو کچلا۔ اس کتاب کا مقصد اسی تضاد کو ظاہر کرنا ہے۔

یہ کتاب تاریخ نہیں ہے۔ میں نے مورخ بننے کی کوشش نہیں کی بلکہ صرف وہ واقعات یکجا کیے ہیں جو مغربی ذرائع، یعنی انہی کے اپنے میڈیا اور ریکارڈ میں موجود ہیں۔ میں نے ذاتی رائے کو محدود رکھنے کی کوشش کی ہے۔ مقصد صرف یہ ہے کہ جو کچھ مغربی ذرائع خود تسلیم کرتے ہیں، وہ ایک جگہ جمع ہو جائے تاکہ قاری خود دیکھ سکے کہ ان کے قول و فعل میں کتنا فرق ہے۔

اسے ایک تاریخی یا نویں بلکہ ایک دستاویز سمجھیں، جو دکھاتی ہے کہ وہ خود اپنے بارے میں کیا مانتے ہیں، اور انہی تسلیم شدہ حقائق کی روشنی میں ان کا کردار کیسا ہے۔ آخر میں فیصلہ آپ نے خود کرنا ہے کہ مغرب کے جمہوریت، انسانی حقوق اور آزادی کے دعوے کتنے سچے ہیں۔

بس یہی اس کتاب کا مقصد ہے۔

# جنوبی امریکہ



کوستاریکا 1

کولمبیا 2

پیراگوئے 3

گواتئمالا 4

کیوبا 5

ایکواڈور 6

برازیل 7

ڈومینیکن ریپبیک 8

بولیویا 9

یوروگوئے 10

چلی 11

ارجنتینا 12

نکاراگوا 13

السلوادور 14

سورینام 15

# جنوبی امریکہ



بیٹی

16

پاناما

17

وینیزویلا

18

ہونڈوراس

19

بولیویا

20



ملک: کوستاریکا

سال: 1948

فائل: SA-01

آج سے صرف ستر سال پہلے تک کوستاریکا کی فوج تھی، پھر ایک دن ایک آدمی نے دستخط کر کے اسے ختم کر دیا۔ یہ دنیا کا واحد ملک بن گیا جس نے اپنی فوج کو آئینی طور پر ختم کر دیا۔ اور اس کی کہانی بہت دلچسپ ہے۔

یہ سب کوستاریکا میں ایک ایسے ڈاکٹر صدر کے انتخاب سے شروع ہوا جہنوں نے غربیوں کے لیے ہسپتال اور سو شل سیکورٹی سسٹم بنایا۔ لیکن ان کا کمیونسٹ پارٹی کے ساتھ اتحاد امریکا اور وہاں کی امیر کافی کے مالکوں کو پسند نہیں آیا۔ جب 1948 کے انتخابات میں ان کے مخالف ایلی ایلی جیت گئے تو کانگریس نے جیت کو كالعدم قرار دے دیا۔

یہاں سے جنگ چھڑ گئی۔ ہوزے فیگرس نامی ایک کافی کے کاشتکار نے اپنی فوج بنالی اور چوالیں دن کی لڑائی کے بعد دارالحکومت پر قبضہ کر لیا۔ لیکن اس لڑائی کا سب سے اہم کردار امریکا کا تھا۔ خفیہ دستاویزات سے پتہ چلتا ہے کہ امریکی سفارتکاروں نے فیگرس کو خفیہ مددی۔ انہوں نے اس کے صریف کو ہتھیار خریدنے سے روکا اور جب نکارا گوانے بمباری کی تو امریکا نے اسے فوراً روک دیا۔ آخر کار امریکی سفیر نے آخری وارنگ دی کہ اگر فوری طور پر ہتھیار نہ ڈالے گئے تو امریکا فیگرس کی حکومت کو تسلیم کر لے گا۔

اس جنگ کے بعد فیگرس نے اقتدار سنبھالا اور سب سے پہلا فیصلہ یہ کیا کہ فوج کو ہی ختم کر دیا۔ فیگرس نے کوٹاریکا کو امریکہ کی ایک کالونی بناؤ لے۔ اسکے پچھے امریکی خفیہ ایجنسی سی آئی اے کی پلانگ تھی۔

آج کوستاریکا امن ہے، لیکن اس کی قیمت ہے۔ فوج نہ ہونے کی وجہ سے وہ امریکا کے دفاعی فیصلوں پر انحصار کرتا ہے، جیسا کہ اسی کی دہائی میں نکارا گوا کی جنگ کے وقت ہوا۔ آج بھی کوستاریکا کے لوگ بحث کرتے ہیں کہ کیا یہ صحیح فیصلہ تھا۔ کیا کسی ملک کی خود مختاری کا انحصار کسی دوسری طاقت پر ہونا چاہیے؟

ملک: کیوبا

سال: 1951

فائل: SA-02

---

ایک ہزار پانچ سو گیارہ جوان اپنے وطن کو آزاد کرنے کے جذبے سے ساحل پر اترے اور اڑتا لیں گئے بعد ان میں سے ایک سو اٹھارہ شہید اور باقی کے بارہ سو کے قریب قیدی بن چکے تھے۔ یہ صرف ایک جنگ نہیں تھی دوستو، یہ وہ لمحہ تھا جس نے دنیا کی تاریخ بدل کر رکھ دی۔

یہ کہانی شروع ہوتی ہے 1959 میں جب فڈل کاسترو نے کیوبا میں ایک انقلاب برپا کیا۔ شروع میں تو امریکہ نے بھی اس انقلاب کی تعریف کی لیکن جب کاسترو نے امریکی کمپنیوں کی زینیں ضبط کیں اور سو شلسٹ پالیسیاں اپنانی شروع کیں تو تعلقات بگڑ گئے۔ صدر آنزن ہاور نے خفیہ طور پر کیوبا کے جلاوطنوں کو تربیت دینے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ جا کر کاسترو کی حکومت کا تختہ الٹ سکیں۔

پھر 18 اپریل 1961 کی صبح ہوئی۔ امریکی سی آئی اے کی تربیت یافتہ بریگیڈ کے جوان پلائی گیر ون کے ساحل پر اترے۔ انہیں یقین تھا کہ وہاں کے عوام ان کا ساتھ دیں گے اور امریکہ کی فضائی مدد بھی ان کے ساتھ ہوگی۔ لیکن ہوا اس کے بالکل برعکس۔ کاسترو کو پہلے ہی سے اس حملے کا پتہ چل چکا تھا۔ اس نے اپنے جنگی جہاز محفوظ مقامات پر منتقل کر دیے تھے۔ صدر کینیڈی نے ڈر کے مارے فضائی حملے روک دیے۔

تین دن تک جنگ جاری رہنے والی اس جنگ میں حملہ آور بہادری سے لڑے لیکن ان کے پاس نہ کوئی مدد پہنچی نہ ہی کوئی راستہ بچا۔ آخر کار انہیں ہتھیار ڈالنا پڑے۔ کاسترو نے ان قیدیوں کے بدے امریکہ سے بچوں کی خوراک اور ادویہ وصول کیں۔ یہ امریکہ کی تاریخ کی سب سے بڑی رجیم چینچ آپریشن کی ناکامی تھی۔

اس مہم جوئی نے کاسترو کو سوویت یونین کے مزید قریب کر دیا۔ خروشیف نے کیوبا کی حفاظت کے لیے اپنی میزائل نصب کیے جو 1962 کے کیوبائی میزائل بحران کا سبب بنا اور دنیا اپنی جنگ کے دہانے پر پہنچ گئی۔ کیوبا میں کاسترو کی طاقت مزید مضبوط ہو گئی اور ملک میں مکمل سو شلسٹ نظام نافذ ہو گیا۔

آج بھی اس ایک واقعے کے اثرات ہماری دنیا پر نظر آتے ہیں۔ امریکہ اور کیوبا کے تعلقات پر اب بھی اس سانحے کے گھرے سائے منڈلا رہے ہیں۔ کیوبا میں آج بھی ہر سال اس جنگ کو یاد کیا جاتا ہے اور بچے ساحل پر اس کی دوبارہ enactment کرتے ہیں۔ میامی میں کیوبن نژاد امریکیوں کا ایک طاقتوروٹ بینک ہے جو اس واقعے کے بعد ہی وجود میں آیا۔ اس کے بعد امریکہ باز نہیں آیا بلکہ اس نے کیوبا پر غیر انسانی اقتصادی پابندیاں عائد کر دیں جو آج بھی کیوبا کے عوام کی زندگیوں کو عذاب بنائے ہوئے ہیں۔ یہ سو شلسٹ نظام اور کمیونسٹ بھائی چارہ ہے جو 64 سالہ استھصال کا مقابلہ کر رہا ہے۔

-----فائل SA-02 کا اختتام-----

ملک: کولمبیا

سال: 1953

فائل: SA-03

---

13 جون 1953 کی صبح کولمبیا میں ایک بھی گولی نہیں چلی، پھر بھی حکومت کا تختہ الٹ دیا گیا۔ جنرل گستاؤ و روہاس پیمانے آسانی سے اقتدار پر قبضہ کر لیا کیونکہ اس بغاوت کی کامیابی کے پچھے امریکی منظوری، فوجی امداد اور واشنگٹن کی تیز رفتار حمایت تھی۔ صرف چوبیس گھنٹے میں امریکہ نے تی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ اور یہی لمحہ تھا جب لاٹینی امریکہ میں فوجی آمریت اور امریکی مفادات کا نیا رشتہ پیدا ہوا۔

آئین پہلے پس منظر سمجھتے ہیں۔ اس وقت کولمبیا میں خانہ جنگی چل رہی تھی جسے لوگ "لاویو لینسیا" کہتے تھے۔ 1946 سے 1953 تک دو لاکھ لوگ مارے جا چکے تھے۔ صدر لوریانو گومیز نے ملک کو انتہا پسندی میں جھونک دیا تھا۔ اس نے سپین کے آمر فرانکو کی تعریفیں کیں اور پولیس کے قاتل گروپوں کو مخالفین کے خلاف استعمال کیا۔ آدھا ملک حکومت کے کنٹرول سے باہر تھا۔ جب گومیز بیمار ہوا تو اقتدار چند سخت گیر لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا۔ فوج ہی وہ واحد ادارہ بچا تھا جسے عوام اب بھی ایک منظم قوت سمجھتے تھے۔ اس فوج کی تربیت امریکہ میں ہوئی تھی کیونکہ کولمبیا نے کوریا کی جنگ میں اقوام متحده کے ساتھ مل کر حصہ لیا تھا۔

روہاس انہی فوجی افسروں میں سے تھا جو کوریا سے تمنے سجا کر واپس آیا تھا۔ 13 جون کی صبح وہ اپنے فارم سے نکلا، ہواں جہاز میں بیٹھ کر دارالحکومت بگوٹا پہنچا، اور چند گھنٹوں میں اقتدار پر قابض ہو گیا۔ صدر گومیز پہلے ہی امریکہ بھاگ گیا تھا۔ کائینہ نے استغفار دیا، عدالتِ عظمی کے حج نے حلف لیا، اور آئین خاموشی سے ایک طرف رکھ دیا گیا۔ اس دن کسی نے مراجحت نہیں کی۔ نخلے ہوئے سیاستدانوں نے سوچا کہ شاید فوج ہی ملک کو بچا سکتی ہے۔

امریکی سفارتخانے نے فوراً واشنگٹن کو اطلاع بھیجی کہ سب کچھ صحیح چل رہا ہے، فوج نے کنٹرول کے لیا ہے، اور فتحی حکومت کو جلد تسلیم کرنا چاہیے۔ صرف دو دن میں امریکہ نے باضابطہ طور پر حمایت کا اعلان کر دیا۔ یہی وہ تیزی تھی جو ثابت کرتی ہے کہ امریکہ ہی اصل میں اس ڈیکٹیٹر شپ کے پیچے کھڑا تھا۔

سی آئی اے کے ذریعے دی گئی فوجی امداد نے اس بغاوت کو ممکن بنایا تھا۔ بغاوت سے پہلے ہی امریکہ نے ہزاروں رائفلیں، مشین گنزا اور مارٹر بھیجی تھے۔ چند ہفتوں بعد واشنگٹن نے آٹھ ملین ڈالر کا قرض معاف کر دیا اور مزید پینتیس ملین ڈالر کی فوجی امداد منظور کی۔ سینکڑوں کولمبیائی افسران کو امریکہ میں تربیت دی گئی۔ ایک روپورٹ میں فخر سے لکھا گیا کہ "کولمبیا کی فوج اپنی تاریخ میں کبھی اتنی منظم اور طاقتور نہیں رہی۔"

روہاس نے اقتدار سنبھال کر عوامی انداز اپنایا۔ اس نے عام معافی کا اعلان کیا، ہزاروں باغیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ عورتوں کو ووٹ کا حق ملا، سڑکیں بنیں، ٹی وی آیا، مزدوروں کے لیے سرکاری یونین بنائی گئی۔ لیکن اسی امداد سے اس نے جبر کا نظام بھی کھڑا کیا۔ ایک خفیہ ادارہ بنایا گیا جس کے نام "سیکیشن تھری" تھا۔ اس ادارے نے امریکی آلات اور تربیت سے لیس ہو کر مخالفین کی فہرستیں بنائیں۔ جب معيشت دوبارہ گری، تو روہاس نے پارلیمنٹ بند کر دی، اخباروں پر پابندی لگادی اور ہزاروں لوگوں کو قید کر دیا۔ امریکی وزیر خارجہ ڈلس نے کہا کہ روہاس کی حمایت کا اعلان کیا۔

1957 تک عوامی غصہ پھٹ پڑا۔ طلبہ اور مزدور سڑکوں پر نکل آئے۔ دو بڑے سیاسی رہنماء، ایک لبرل اور ایک کنٹرولویٹو، ملک میں واپس آئے اور فوج کو راضی کیا کہ روہاس کو ہٹا دیا جائے۔ دس مئی کو فوجی جرنیلوں نے اسے معزول کیا۔ وہ جلاوطن ہو گیا۔ امریکہ نے فوراً آنے حکومت کو تسلیم کر لیا۔ ایک سیاسی معاہدہ ہوا جس نے سولہ سال تک صرف دو پارٹیوں کو اقتدار میں رکھا اور بائیں بازو کو ہمیشہ کے لیے باہر پھینک دیا۔

لیکن کہانی یہاں ختم نہیں ہوئی۔ جن باغیوں نے 1953 میں ہتھیار نہیں ڈالے تھے وہ پہماؤں میں واپس چلے گئے۔ انہی علاقوں میں بعد میں "فارق" نامی تنظیم پیدا ہوئی جسے 1964 میں امریکی بمبار طیاروں سے نشانہ بنایا گیا۔ وہی امریکی طیارے جو اسی امداد کے سلسلے میں آئے تھے جو روہاس کے دور میں شروع ہوئی تھی۔

اسی دور نے کولمبیا کی فوج کو مکمل طور پر امریکی ماؤل کے مطابق ڈھالا۔ 1960 کی دہائی میں امریکی جنگ و لیم یار بورو نے کولمبیا آکر مشورہ دیا کہ مقامی "دفاعی گروپ" بنانے جائیں۔ انہی گروپوں نے بعد میں بیر امٹری فورسز کی شکل اختیار کی۔ 1953 سے 1965 کے درمیان امریکہ نے کولمبیا کو ایک سودس ملین ڈالر کی فوجی امداد دی۔ چھ ہزار سپاہیوں کی فوج پہنچیں ہزار کی تربیت یافتہ فوج بن گئی۔ وہی تربیت اور وہی ذہنیت آج بھی اس فوج میں زندہ ہے جو اب امریکی بلیک ہاک ہیلی کاپڑوں سے اپنی کارروائیاں کرتی ہے۔

آج بھی کولمبیا کی سیاست میں فوج کو وہی حیثیت حاصل ہے جو اس وقت ملی تھی۔ ہر صدر، چاہے وہ دائیں بازو کا ہو یا بائیں، فوج سے مصالحت کیے بغیر نہیں چل سکتا۔ بھی فوجی بالادستی آج کے کولمبیا کے سیاسی ڈھانچے میں رچی بسی ہے۔

دنیا کی حالیہ تاریخ ہمیں یہی بتاتی ہے کہ ایک ملک جب اپنی تقدیر خود لکھنے کی کوشش کرتا ہے، تو کہیں نہ کہیں ایک خاموش امریکی منظوری یا مخالفت اس کہانی کا حصہ بن جاتی ہے۔ روہاں کی بغاوت نے ثابت کیا کہ لاٹینی امریکہ میں طاقت کا راستہ ہمیشہ واشنگٹن سے ہو کر گزرتا ہے، اور وہ روش آج بھی نہیں بدلتی۔ جمہوریت، آزادی، انسانی حقوق، آزادی اظہار، یہ سب دوسرے ممالک کیلئے ہیں جیسے انٹر نیشنل کورٹ آف جسٹس اور انٹر نیشنل کریمنل کورٹ مغرب مخالفین کیلئے ہیں۔

-----فائل SA-03 کا اختتام-----

ملک: گوئٹے مالا

سال: 1954

فائل: SA-04

ستائیں جون 1954 کی شام میں گوئٹے مالا کے صدر جیکوب و آرینز نیشنل پلیس کی بالکونی پر آئے۔ نیچے عوام کا ہجوم تھا، مائیک پر ان کی آواز کپکپا رہی تھی، اور وہ اعلان کر رہے تھے کہ فوج نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ پھر انہوں نے کہا کہ وہ مزید خون غراہب روکنے کے لیے استغفار دے رہے ہیں۔ چند گھنٹوں بعد وہ میکسیکن ایم بیسی کی ایک پرانی کار میں بیٹھے، سرحد عبور کی اور جلاوطنی کے چالیس سالہ سفر پر روانہ ہو گئے۔ یہ بغاوت بظاہر چھوٹی تھی، محض ڈیڑھ سو کرائے کے فوجی کرنل کارلوس کاستیلو آرمس کی قیادت میں ہونڈوراس سے داخل ہوئے، لیکن اس کے اثرات آج تک گواٹے مالا، وسطی امریکہ اور واشنگٹن کی پالیسیوں پر چھائے ہوئے ہیں۔

کہانی ستر سال پہلے امریکی مداخلت سے شروع ہوتی ہے۔ 1823 میں جاری ہونے والے موزو ڈاکٹر ان نے اعلان کیا تھا کہ امریکہ اس خط پر غیر ملکی اثر نہیں بروادشت کرے گا۔ وقت کے ساتھ یہ پالیسی بدل کر براہ راست غالبے میں بدل گئی۔ 1899 میں یونائیٹڈ فروٹ کمپنی نے گواٹے مالا کی معیشت پر قبضہ کر لیا۔ ریلوے، بندرگاہ، تار، سب کچھ انہی کے ہاتھ میں تھا۔ حکومتیں آتی جاتی رہیں، اصل طاقت بوسٹن کے ان دفتروں میں تھی جہاں سے یہ کمپنی چلتی تھی۔ 1931 میں صدر جارج او بیکو آیا، جو کھلے عام موسولینی اور ہتلر کی تصاویر میز پر رکھتا تھا۔ کسانوں پر ایک ظالمانہ قانون مسلط کیا گیا جس کے تحت ہر بے زین شخص کو سال میں سو دن زینداروں کے کھینتوں پر جبری مشقت کرنا پڑتی تھی۔

اکتوبر 1944 میں او بیکو کی آمیت کا خاتمہ ہوا اور "گوئٹے مالا کی بہار" شروع ہوئی۔ فلسفی صدر خوان آریو الونے یونیز کو قانونی تحفظ دیا، نیا لیبر کوڈ بنایا اور پانچ سالہ دور میں پچیس بغاوتوں کا سامنا کیا۔ ان کے بعد 1950 میں جیکوب و آرینز آئے، ایک نوجوان فوجی افسر، جو تاریخ میں پہلی بار عوامی ووٹ سے اقتدار میں آئے۔ انہوں نے ایک فیصلہ کن قدم اٹھایا۔ 17 جون 1952 کو فرمان

900 جاری کیا گیا، جس کے تحت 673 ایکڑ سے بڑی غیر استعمال شدہ زمینیں حکومت لے کر بے زین کسانوں میں تقسیم کرنے لگی۔ صرف یونائیٹڈ فروٹ کمپنی ہی چار لاکھ ایکڑ زمین کھونے والی تھی۔ یہی وہ لمحہ تھا جس نے امریکہ کے اعصاب ہلا دیے۔ امریکی وزیر خارجہ جان فوستر ڈلس، جن کی سابقہ لا فرم یونائیٹڈ فروٹ کے مفادات سے جڑی تھی، نے گوتے مالا کو "سوویت خطرے کا پہلا قلعہ" قرار دے دیا۔ سی آئی اے نے 1952 میں ایک خفیہ منصوبہ بنایا، جسے پہلے PBFORTUNE کہا گیا، مگر آئزن ہاور کے آنے کے بعدیہ PBSUCCESS بن گیا۔ دو اعشاریہ سات ملین ڈالر کا بجٹ، کرنل کارلوس کا سٹیلو آرمز کا کوڈ نام "کالیگیریس" اور 58 افراد کی قتل کی فہرست تیار کی گئی۔ امریکی میڈیا میں پروپیگنڈہ پھیلایا گیا کہ گوتے مالا میں سوویت آبوزیں کھڑی ہیں، مایا دیہاتوں میں کمیونسٹ تربیت دی جا رہی ہے۔ سی آئی اے کے اہلکار اپنے ہاونٹ نے "آزادی کی آواز" کے نام سے خفیہ ریڈیو اسٹیشن بنایا، جوہر رات یہ خبریں نشر کرتا کہ آزادی کی فوج ہر سمت سے آ رہی ہے۔

اٹھارہ جون 1954 کو پہلی بمباری کی گئی۔ امریکی پائلٹوں کے اڑائے ہوئے پرانے سی 47 طیاروں نے دارالحکومت پر بم گراۓ۔ دراصل زیادہ تر بم پرانے پریکش بم تھے مگر خوف پھیلانے کا کام کر گئے۔ کا سٹیلو آرمز کے ڈیڑھ سو آدمی ہونڈوراس سے داخل ہوئے۔ ریڈیو پر جھوٹے اعلانات ہوتے رہے کہ پانچ مختلف محاذوں سے بغاوتی فوج آ رہی ہے۔ اصل کھیل فوجی کرنلز کی خرید و فروخت کا تھا۔ سی آئی اے نے مہینوں پہلے ہی انہیں رشوت دے دی تھی۔ 25 جون کو جب امریکہ نے گوتے مالا کے امریکی بینک اکاؤنٹ منجمد کر دیے تو فوجی قیادت نے آریزنا سے صاف کہہ دیا کہ وہ اب نہیں لڑیں گے۔ دو دن بعد آریزنا نے استغفاری دے دیا اور میکسیکو میں جلاوطنی اختیار کی۔

یکم جولائی کو کا سٹیلو آرمز امریکی آشیرباد کے ساتھ فاتح کی طرح گوتے مالا آیا۔ زمین اصلاحات کا قانون ختم کر دیا گیا، یونائیٹڈ فروٹ کو ڈیڑھ ملین ایکڑ زمین واپس دے دی گئی اور ایک نئی کمیٹی بنائی گئی جو مبینہ کمیونسٹوں کے خلاف فائلیں تیار کرنے لگی۔ اگلے چند دہائیوں میں گوتے مالا میں ایک بعد ایک فوجی حکومت آئی، اور امریکی تربیت یافتہ اسپیشل فورس اور گرین بیریٹس کے ساتھ مل کر لاکھوں لوگوں پر ظلم ڈھایا۔ 1954 سے 1990 تک تقریباً ایک لاکھ عام شہری قتل کر دیے گئے۔

اس بغاوت کے اثرات تباہ کن تھے۔ زین دوبارہ چند ہاتھوں میں مرکز ہو گئی، 1979 کے صرف دو فیصد لوگ دو تہائی قابل کاشت زین کے مالک تھے۔ ہزاروں مایا کسانوں کو بے دخل کر کے پھاڑی بستیوں میں دھکیل دیا گیا۔ بے زین، محروم اور ناراض لوگ بالآخر گوریلا تنظیموں میں شامل ہو گئے، جیسے ای جی پی اور او آرپی اے، جنہوں نے 36 سالہ خانہ جنگلی کو ہوا دی۔ امریکہ کے لیے بھی یہ کامیابی اہم ثابت ہوئی۔ ڈس برادران کی اس "فتح" نے واشنگٹن کو یہ یقین دلایا کہ خفیہ آپریشنز کے ذریعے سستے میں حکومتیں بدلی جاسکتی ہیں۔ یہی سوچ بعد میں کیوبا، برازیل اور چلی تک پھیل گئی۔ مگر ہر جگہ نتیجہ یکساں نہیں نکلا۔ آج بھی گوتے مala اس بغاوت کے ساتے میں جی رہا ہے۔ 1996 کے امن معابدوں میں کھل کر کہا گیا کہ 1954 کی زرعی کاؤنٹر ریفارمز اس جنگ کی جڑ تھیں۔ 1999 میں اقوام متحده کی رپورٹ نے صاف لکھا کہ اس بغاوت کے بعد ہونے والے مظالم نسل کشی کے زمرے میں آتے ہیں۔ آج جب ہزاروں گوتے مala کے شہری قافلوں کی صورت میں امریکہ کی طرف ہجرت کرتے ہیں تو ان کے نعروں میں اکثر آریزنا کا نام آتا ہے، اس ادھورے خواب کا حوالہ ملتا ہے جو زین کی اصلاح اور مساوات کا تحا۔ ستائیں جون ہر سال دارالحکومت کے نیشنل پیلس کے باہر ہزاروں لوگ جمع ہوتے ہیں، ہاتھوں میں موم بتیاں ہوتی ہیں اور سب ایک ہی سوال دھراتے ہیں۔ کیا کبھی وہ دن آتے گا جب گوتے مala کے تمام شہریوں کو حقوق ملیں گے، جیسا کہ آریزنا نے وعدہ کیا تھا۔

-----فال 4-SA کا اختتام-----

# ملک: پیرا گوئے

سال: 1954

فائل: SA-05

چار مئی 1954ء۔ ایک ایسا دن جس نے پورے پیرا گوئے کی تاریخ بدل دی۔ صبح کے وقت جزل الفریڈو استروسن نے بغیر ایک بھی گولی چلائے صدر فدریکو چاویز کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ پورا ملک ہی ران رہ گیا۔ لیکن اس کہانی کو سمجھنے کے لیے ہمیں تھوڑا سچھے جانا پڑے گا۔

ایسوسیں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں پیرا گوئے ایک زخمی ملک تھا۔ ٹریپل الائنس کی جنگ میں اس نے اپنی آدھی سے زیادہ آبادی کھو دی تھی۔ برازیل، ارجنتائن اور یورپ گوئے کے خلاف لڑی گئی اس جنگ نے صرف آبادی کم کی بلکہ ملک کو سیاسی، معاشری اور سماجی طور پر توڑ کر رکھ دیا۔ ایک طرف غربی اور بدحالی تھی، دوسری طرف ایک مضبوط اشرافیہ نے سیاست پر قبضہ جمایا تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں پیرا گوئے بار بار فوجی مداخلت، چھوٹے چھوٹے جمہوری تجربات اور خانہ جنگی ہیسے حالات سے گزرا۔

ایس سوبئیس سے پہنچیں تک پیرا گوئے نے بولیویا کے خلاف چاکو جنگ لڑی۔ یہ جنگ تیل سے مالا مال علاقوں کے لیے تھی۔ پیرا گوئے نے یہ جنگ تو جیت لی، لیکن ملک مزید کمزور ہو گیا۔ فوج کی طاقت اور سیاست پر اثر بڑھ گیا۔ اس دوران نیشنل ریپبلکن ایسو سی ایشن یعنی کلوراڈو پارٹی نے دھیرے دھیرے سیاست پر مکمل کنٹرول حاصل کر لیا۔ دھونس، دھاندلی، رشوت اور سختی کے ذریعے یہ جماعت اقتدار میں رہی۔

ایس سواتا لیس میں فدریکو چاویز صدر بنے۔ ایک سویلین صدر ہونے کے باوجود وہ فوج کے دباو میں تھے۔ پارٹی کے اندر وہ اختلافات، عوامی بے چینی اور معاشری بدحالی نے ان کی حکومت کو کمزور کر دیا۔ اور یہی وہ لمحہ تھا جسے جزل استروسن نے استعمال کیا۔

چار مئی 1954 کو جنرل استروسنر نے صدر چاؤیز کو گھیر کر استعفی دینے پر مجبور کر دیا۔ فوج نے کانگریس تحلیل کر دی، ایم جنسی لگا دی اور چند دنوں میں کلور اڈو پارٹی نے استروسنر کو صدارتی امیدوار نامزد کر دیا۔ گیارہ جولائی انیس سو چون کو وہ صدر منتخب ہوا۔ لیکن یہ انتخاب نام کا انتخاب تھا، اصل میں پورے نظام پر فوج اور کلور اڈو پارٹی کا قبضہ تھا۔ اسی دن سے پہلے اگوئے کی تاریخ کے سب سے طویل آمرانہ دور کا آغاز ہوا۔

استروسنر نے ایک ایسی ریاستی مشینری بنائی جہاں خوف، نگرانی اور تشدد عام تھا۔ اس کے خفیہ ادارے اور پولیس ہر اس شخص پر نظر رکھتے جو اس کی حکومت کے خلاف سوچتا بھی تھا۔ اپوزیشن رہمنا، مزدور رہمنا، صحافی، حتیٰ کہ اس کی اپنی پارٹی کے اختلاف رکھنے والے لوگ بھی جیلوں میں ڈالے گئے، تشدد کا نشانہ بننے یا جلاوطن کر دیے گئے۔

سنہ 1956 میں ایک ناکام بغاوت کے بعد استروسنر نے اپنی پارٹی اور فوج دونوں پر مکمل کثروں قائم کر لیا۔ اس نے آئین میں ایسی تبدیلیاں کیں جن کے بعد بار بار صدارتی انتخابات جیتنا اس کے لیے محض ایک رسمی عمل بن گیا۔ سنہ 1958 سے 1987 تک وہ مسلسل آٹھ بار صدر منتخب ہوا اور ہر بار اسی فیصد سے زیادہ ووٹ لینے کا دعویٰ کیا۔

اس کے دور میں پہلے اگوئے میں بڑے ترقیاتی منصوبے بھی ہوئے۔ سنہ 1975 میں برازیل کے ساتھ مل کر ایتا نیو ڈیم کا منصوبہ شروع کیا گیا جو آج بھی دنیا کے سب سے بڑے پن بھلی منصوبوں میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی کرپشن کی انتہا ہو گئی۔ ہزاروں دیہاتی اور مقامی قبائل کو جبراً بے دخل کیا گیا۔ زینوں پر قبضے ہوئے اور ایک چھوٹے سے طبقے نے بے پناہ دولت اکٹھی کر لی۔

استروسنر کا دور بظاہر مسٹحکم لگتا تھا، لیکن اندر سے ایک خوناک حقیقت چھپی ہوئی تھی۔ پانچ سو سے زیادہ سیاسی قتل، ہزاروں گرفتاریاں، تشدد، جلاوطنی اور انسانی حقوق کی کھلی خلاف ورزیاں۔ پہلے اگوئے دوسرے جنوبی امریکی آمرانہ حکومتوں کے ساتھ مل کر آپریشن کونڈور کا حصہ بھی بنا، جس کے تحت مخالفین کا سراغ لگا کر انہیں قتل کیا جاتا۔

آخر کار 1980 کی دہائی میں حالات بدلنے لگے۔ معیشت بحران کا شکار ہوئی، قرضے بڑھے اور عوامی ناراضگی کھل کر سامنے آئے لگی۔ مذہبی رہمنا حکومت کے خلاف بولنے لگے۔ دنیا بھی بدل رہی تھی۔ لاطینی امریکہ کے کئی ممالک میں آمریتیں ختم ہو رہی تھیں اور سرد جنگ کا اختتام قریب تھا۔ امریکہ، جو پہلے استروسنر کا حمایتی تھا، اب انسانی حقوق کی بنیاد پر دباؤ ڈالنے لگا۔

آخر کار تین فروری 1989 کو جنرل اینڈریس روڈریگر، جو استروسنر کا قریبی ساتھی تھا، فوجی بغاوت کے ذریعے اقتدار میں آیا۔ استروسنر کو جلاوطنی پر مجبور کر دیا گیا اور وہ برازیل چلا گیا جہاں وہ 2006 تک زندہ رہا۔

استروسنر کے جانے کے بعد پیراگوئے میں جمہوریت کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ سنہ 1992 میں نیا آئینہ بنا، اپوزیشن جماعتوں کو آزادی ملی اور انتخابات کا نظام بہتر کیا گیا۔ لیکن کلوراڈو پارٹی اقتدار سے غائب نہیں ہوئی۔ سنہ 1989 سے 2008 تک مسلسل یہ جماعت اقتدار میں رہی۔ کرپشن، زینوں پر قبضے اور پرانی اشرافیہ کا اثر و رسوخ آج بھی ختم نہیں ہو سکا۔

آج بھی پیراگوئے کی سیاست، میشیٹ اور معاشرت پر استروسنر کے دور کے اثرات دھائی دیتے ہیں۔ زینوں کی غیر مساوی تقسیم، کمزور ادارے، بد عنوانی اور عوامی بے اعتمادی اب بھی وہی پرانے زخم ہیں جو اس آمریت نے دیے۔ لیکن ایک ثابت پہلو بھی ہے۔ نوجوان نسل ماضی سے سبق سیکھ رہی ہے، انصاف کا مطالبہ کر رہی ہے اور بہتر مستقبل کے لیے آواز بلند کر رہی ہے۔

مزے کی بات یہ ہے کہ 1954 کے مارشل لاءِ لگانے والے ڈکٹیٹر کے چچے بھی امریکہ کا کردار تھا۔ امریکہ کی سازش نے کتنی نسلوں کی تقدیر بدل دی۔ آمریت کے زخم اتنے گھرے تھے کہ ان کا اثر آج تک قائم ہے۔

-----فائل SA-05 کا اختتام-----

ملک: ایکواڈور

سال: 1963

فائل: SA-06

جو لائی 1963 کی رات تھی۔ ایک سرکاری عشاںیے میں صدر کارلوس جولیو آرو سیمینا نے نشے میں کھڑے ہو کر امریکی سفیر کی طرف دیکھا اور کہا کہ میں امریکی عوام کے نام پر جام اٹھاتا ہوں نہ کہ امریکی حکومت کے نام پر۔ لمحے بھر میں ماحول بدل گیا۔ چند دن بعد ہی ٹینک سڑکوں پر آگئے، فوج نے صدارتی محل کا محاصرہ کیا اور آرو سیمینا کو زبردستی جہاز میں بٹھا کر پانامہ بھیج دیا۔ یوں ایک نئے دور کا آغاز ہوا جو اگلی دو ہائیوں تک ایکواڈور کی سیاست، معیشت اور سماج پر چھایا رہا۔

انیس سو پچاس کی دہائی کے آخر تک ایکواڈور دنیا بھر میں سب سے زیادہ کیلے برآمد کرتا تھا۔ امریکی کمپنی یونائیٹڈ فروٹ اور چند مقامی پارٹریز کی دولت آسمان کو چھوڑ رہی تھی، مگر یہ پسہ ملک کے پہاڑی دیہات یا ساحلی بستیوں تک کبھی نہیں پہنچا۔ غریب کسان بدستور زمین سے محروم رہے اور گوایا کیل کے اطراف جھگیلیاں پھیلتی رہیں۔ اسی دوران پانچ بار منتخب ہونے والے پاپولسٹ صدر ویلاسکو ایبارا نے عوام کو امید دلائی مگر ان کے دور کا نتیجہ زیادہ تر سیاسی عدم استحکام اور فوجی بغاوتوں کی شکل میں نکلا۔ فوجی ادارے، جو پہلے ہی امریکی تربیت کے زیر اثر تھے، ہر سیاسی بحران میں خود کو "آخری فیصلہ ساز" سمجھنے لگے۔ اس پس منظر میں سرد جنگ کا دباو بھی موجود تھا۔ امریکہ کو خدشہ تھا کہ کہیں ایکواڈور بھی کیوبا کی طرح کیونزم کی طرف نہ جھک جائے۔

پھر منظر میں کارلوس آرو سیمینا آئے، جونومبر 1961 میں ویلاسکو کے معزول ہونے کے بعد صدر بنے۔ شروع میں واشنگٹن کو لگا کہ وہ معتدل شخصیت ہیں مگر جلد ہی انہوں نے کیونسٹ پارٹی کو قانونی حیثیت دے دی، ماسکو سے تعلقات بحال کیے اور جو لائی 1962 میں چی گویرا کو صدارتی محل میں خوش آمدید کہا۔ یہ سب امریکیوں کے لیے ناقابل قبول تھا۔ پھر آیا وہ مشہور عشاںیہ جس

نے حالات کو بھڑکا دیا۔ فوج کے اعلیٰ افسران، جو پہلے ہی آر و سیمنا کی آزادانہ پالیسیوں سے ناراض تھے، تین دن بعد ٹینک لے کر سڑکوں پر آگئے۔ اقتدار فوجی جنتا نے سنبھال لیا اور اگلے چار سال ایکواڈور کو ایک سرد جنگی تجربہ گاہ میں بدل دیا۔ سنہ 1963 سے 1966 تک کا فوجی دور سخت سنسر شپ، مارشل لاء، اور کمیونسٹ پارٹی پر پابندیوں کا زمانہ تھا۔ امریکہ نے فوراً بیل آؤٹ پیٹکچ دیا، مگر اس کے بدے میں حکومت پر دباؤ ڈالا کہ بیل سیکٹر کی ملازمتیں کم کرے، پیٹرول پر ٹیکس لگائے اور یونائیٹڈ فروٹ جیسی امریکی کمپنیوں کو مزید رعایتیں دے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ چند ہاتھوں میں دولت سمٹتی گئی اور عام لوگوں کی زندگی مزید مشکل ہو گئی۔ پھر 1964 میں کیلئے کی قیمتیں گر گئیں، معیشت بحران میں گئی، بحث خسارہ بڑھا اور عوامی احتجاج نے ملک کو ہلا کر رکھ دیا۔ مارچ 1966 میں ایک عام ہڑتال کے دوران پولیس نے مظاہرین پر فائزگ کی جس میں پانچ افراد مارے گئے۔ عوامی دباؤ کے تحت فوجی حکومت ختم ہوئی اور انتخابات کا راستہ کھلا۔

مگر جمہوریت دیر پا ثابت نہ ہوئی۔ ویلاسکو ایبارا ایک بار پھر 1968 میں صدر بنے مگر اس بار بھی معاملات بگڑ گئے۔ مہنگائی بے قابو ہو گئی، تیل کی نئی ڈیلز امریکی کمپنیوں کو فائدہ دینے کے لیے طکی گئیں اور جون 1970 میں ویلاسکو نے پارلیمنٹ توڑ کر آئیں معطل کر دیا۔ اس نے فوج کو مزید مشتعل کر دیا۔ 15 فروری 1972 کی صبح، کرنل گیر مور ڈریگیز لارا نے فوجی بغاوت کی قیادت کی اور ویلاسکو کو جلاوطنی پر مجبور کر دیا۔ فوجی حکومت نے تیل کے وسائل پر کنٹرول کا نعرہ لگایا، قومی تیل کارپوریشن قائم کی اور رائلٹی بڑھا کر ریاستی آمدنی میں اضافہ کیا۔ مگر اس دولت نے کرپشن کو جنم دیا۔ چند سال بعد ہی جو نیز افسران اپنے سینئر زکے نئے ساحلی محلات اور لگثری گاڑیوں پر سوال اٹھانے لگے۔ 1975 میں ایک ناکام فوجی بغاوت میں درجنوں فوجی مارے گئے اور روڈریگیز لارا کو ہٹا دیا گیا۔ اس کے بعد ایک اور فوجی جنتا نے اقتدار سنبھالا اور آئی ایم ایف کے ساتھ ایسے معاملے کیے جن کے تحت سب سیڈیز کم ہوئیں، کرنی کی قدر گرائی گئی اور ملک مزید قرضوں میں ڈوب گیا۔

اس طویل دور کے اثرات گھرے اور دیر پا تھے۔ سیاست میں فوج خود کو اقتدار کا اصل ضامن سمجھنے لگی۔ ہر آئین میں فوج کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ "اداروں کے تحفظ" کے لیے مداخلت کر سکتی ہے۔ عام سیاسی جماعتیں فوج کو خوش رکھنے کے لیے اندر وطنی فوجی کمیٹیاں بناتی رہیں۔ معیشت میں عدم استحکام نے لمبی منصوبہ بندی کو تقریباً ناممکن بنادیا۔ سنہ 1963 سے 1979 تک فی کس آمدنی کی ترقی کی رفتار لاطینی امریکہ کے اوست سے نصف رہی اور غیر ملکی قرضہ چار گنا بڑھ گیا۔ سماجی طور پر دیہی اور شہری

طبقوں کے درمیان خلیج بڑھتی گئی۔ زین کی اصلاحات کے منصوبے مسلسل مؤخر ہوتے رہے اور لاکھوں کسان گوایا کیل کے مضافات یا ایمیزون کے تیل کے علاقوں کی طرف ہجرت پر مجبور ہوئے۔ وباں ماحولیاتی تباہی اور استھصال نے نئے احتجاجی گروہوں کو جنم دیا۔

بین الاقوامی سطح پر یہ دور ایکواڈور کو امریکی اثر میں مزید جکڑ گیا۔ 1962 سے 1976 کے درمیان ملک کو امریکی فوجی امداد ملی، سینکڑوں افران نے امریکی تربیت حاصل کی اور آئی ایم ایف کے معاشی پروگراموں نے ہر آنے والی حکومت کی پالیسیوں کو باندھ دیا۔ آج بھی پیٹرو ایکواڈور انہی ایمیزون بلاکس میں کام کرتا ہے جہاں ٹیکسا کو نے پہلی بار تیل نکالتا تھا اور غیر ملکی قرضے بڑھتے جا رہے ہیں۔

آج جب صدر گیلرمو لاسو معاشی بحران اور عوامی احتجاج کے درمیان اقتدار سنبحا لے ہوئے ہیں تو فوج اب بھی پس پرده طاقت رکھتی ہے۔ 2022 کے احتجاج کے دوران حکومت اور عوام کے درمیان ثالثی کا کردار فوج نے ادا کیا، جیسے ماضی میں کرتی آئی ہے۔ تیل کی ڈیلز، سبزیوں کی پالیسیاں اور غیر ملکی قرضے اب بھی ویسے ہی مسائل ہیں جو 1963 کے بعد ہر دور میں دھرا نے گئے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ مستقبل کس سمت جائے گا۔ یا تو پرانا ماذل دھرا یا جائے گا جہاں فوج "قومی نجات" کے نام پر مداخلت کرے گی، یا پھر شہری اور مقامی تحریکیں اتنی طاقتور ہو جائیں گی کہ آئین میں بڑے سیمانے پر اصلاحات کے ذریعے اس چکر کو توڑ دیں۔ سنہ 1963 کا وہ لمحہ جب نئے میں ایک صدر نے امریکی حکومت پر تنقید کی تھی، اب بھی ایکواڈور کی سیاسی تاریخ کا نقطہ آغاز ہے۔ امریکی مداخلت نے ایکواڈور کو کبھی نہ ختم ہونے والی غلامی کے دلدل میں دھکیل دیا تھا۔

-----فائل 06-SA کا اختتام-----

# ملک: ڈو مینیکن ریپبلک

سال: 1963-1965

فائل: SA-07

تیس اپریل 1965 کو صرف دو دن کے اندر امریکہ نے تیسیں ہزار فوجی ڈو مینیکن ریپبلک میں اتار دیے تھے۔ یہ لاطینی امریکہ میں ویتنام سے پہلے کی سب سے بڑی امریکی مداخلت تھی۔ ایک چھوٹے سے ملک پر یہ پر زور امریکی حملہ تھا۔ کہانی سمجھنے کیلئے تھوڑا سمجھے چلتے ہیں۔

ڈو مینیکن ریپبلک پر اکیس سال تک امریکی حمایت یافتہ ایک شخص کا قبضہ رہا۔ رافائل ٹروہیلو، جو اتنا طاقتور تھا کہ اس نے دارالحکومت کا نام بھی اپنے نام پر رکھا ہوا تھا۔ ملک کی معیشت کا تین چوتھائی اس کے قبضے میں تھا۔ اس نے اپنے آمرانہ دور میں ہزاروں مخالفین کو قتل کروایا، 1937 میں یہی کے میں ہزار باشندوں کا قتل عام بھی اسی کے حکم پر ہوا تھا۔ لیکن 30 سویں 1961 کی رات چند انقلابیوں نے اس کی گاڑی پر انداھنگو لیاں بر سائیں۔ وہ وہیں پر مر گیا، مگر اس کا بنایا ہوا نظام زندہ رہا۔ ٹروہیلو کے بعد اس کے خاندان نے اقتدار سنبھالنے کی کوشش کی مگر اندر ورنی انتشار اور یہ ورنی دباؤ کے باعث سب کچھ بکھرنا لگا۔ امریکہ جو ٹروہیلو کو کمیونزم کے خلاف قلعہ سمجھتا تھا اور اسکی مکمل حمایت کرتا تھا اسے آخر کار ٹروہیلو کو خاندان کی حمایت سے پچھے ہٹا پڑ گیا۔ نومبر 1962 میں ٹروہیلو کا خاندان ملک چھوڑ گیا اور جمہوریت کیلئے پھلا دروازہ کھلا۔

یہ وہ لمحہ تھا جب خوان بوش واپس وطن آئے۔ ایک دبالتا، چشمہ لگانے والا ادیب، جو پچھس سال جلاوطنی میں گزارنے کے بعد ڈو مینیکن ریپبلک کے پہلے منتخب صدر بنے۔ 27 فروری 1963 کو بوش نے 59 فیصد ووٹ لے کر تاریخ بدلتی۔ انہوں نے زینوں کی تقسیم، مزدوروں کے حقوق اور سو شیل جسٹس کا ایجنڈا پیش کیا۔ انہوں نے کمیونسٹ پارٹی کو قانونی حیثیت دی، آئین میں مزدوروں کے منافع میں حصہ دار بنانے کی شق ڈالی اور بڑے بڑے شوگر اسٹیٹس توڑنے کے لیے زرعی اصلاحات کا اعلان کیا۔

لیکن یہ سب طاقتور حلقوں کے لیے خطرہ تھا۔ واشنگٹن کو بوش ایک نئے فیڈل کاسترو لوگنے لگے اور ٹروہیلو کے تربیت یافتہ فوجی افسروں کے لیے بوش کی آزادا پالیسیوں کا مطلب تھا افراتقری۔ صرف سات مہینے بعد 25 ستمبر 1963 کو فوجی ٹینک دار الحکومت میں داخل ہوئے۔ کرنل ایلیاس ویسن وے ویسن کی قیادت میں فوج نے بوش کو ہٹایا اور انہیں جلاوطنی پر مجبور کر دیا۔ ایک سویلین جنتابنائی گئی مگر اصل اقتدار فوج کے ہاتھ میں رہا۔

یہ عبوری حکومت کمزور تھی۔ میشت تباہ ہو رہی تھی، مہنگائی بڑھ رہی تھی، اور عوام بوش کی واپسی کے خواب دیکھ رہے تھے۔ بالآخر اپریل 1965 میں ایک چنگاری نے پورے ملک کو جلا ڈالا۔ سان ایسیدرو ائریس کے کچھ نوجوان فوجی افسروں کو شبہ ہوا کہ انہیں جلاوطن کرنے کا منصوبہ بنایا جا رہا ہے۔ 24 اپریل کی صحیح کرنل فرانسکو کائیمانو اور اس کے ساتھیوں نے بغاؤت کر دی۔ انہوں نے دار الحکومت کا کنٹرول سنبھال لیا، قیدی بننے ہوئے رہنماؤں کو رہا کیا اور اعلان کیا کہ ہم خون بوش کو واپس لائیں گے۔

سرٹکوں پر لاکھوں لوگ نکل آئے۔ نعرے لگ رہے تھے "آئین چاہئے، فوج نہیں"۔ چند گھنٹوں میں ہی حکومت کا کنٹرول ختم ہو گیا۔ لیکن ٹروہیلو کے پرانے وفادار جنرل ویسن وے ویسن نے بھی اپنی فوجی طاقت کو جمع کیا۔ دار الحکومت دو حصوں میں بٹ گیا۔ پلوں پر مارٹر گر رہے تھے، چرچ کی میناروں پر سناپر میٹھے تھے، اور تین دن میں تین سو سے زیادہ لوگ مارے گئے۔

اسی دوران واشنگٹن میں سازش تیار ہو نے لگی۔ صدر لندن جانسن جو پہلے ہی ویتنام میں فوجیں بھیج رہا تھا اس نے 28 اپریل کو امریکی فوجی ڈو مینیکن ریپبلک میں اتار دئے۔ پہلے 400 میرینز، پھر دو دن میں یہ تعداد تینیس ہزار تک پہنچ گئی۔

امریکہ نے بار بار وضاحتیں بد لیں۔ کبھی کہا اپنے شہریوں کی حفاظت کر رہے ہیں، کبھی کہا کمیونسٹ قبضہ روک رہے ہیں، کبھی کہا امن قائم کرنا مقصد ہے۔ اصل میں امریکہ ایک آزاد اور بائیں بازو کی حکومت کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

کائیمانو کے دستے لڑتے رہے، لیکن امریکی توپوں اور بھری جہازوں کے سامنے زیادہ دیر نہیں تک سکے۔ 22 مئی کو ایک آغوشی بڑا حملہ ہوا، مزید چھ سو لوگ مارے گئے، اور پھر اوسے ایس کی نگرانی میں فائز بندی ہو گئی۔

امریکی فوج سولہ ماہ تک ڈو مینیکن رپبلک میں رہی۔ بوش کے حامیوں کو نکال دیا گیا، آئین دوبارہ لکھا گیا، فوج کو واشنگٹن کے ماتحت بنادیا گیا۔ 1966 کے انتخابات میں ٹروہیلو کے پرانے آدمی جو کین بالاگر کو کامیاب کرایا گیا، جبکہ بوش کے حامیوں نے انتخابات کا بائیکاٹ کیا۔

اس مداخلت کے اثرات دہائیوں تک رہے۔ زرعی اصلاحات رک گئیں، بڑے شوگر اسٹیٹس پر پرانے مالکان کا قبضہ برقرار رہا، اور امریکی سرمایہ ملک میں سیاحت اور نیکی کی کان کنی میں لگا دیا گیا۔ ترقی ہوئی، لیکن عام لوگ اور غریب کسان مزید پسماندہ رہ گئے۔ فوج کو امریکی تربیت اور اربوں ڈالر ملے اور وہ ہر حکومت کی اصل طاقت بن گئی۔

اس جنگ کا صدمہ آج تک ڈو مینیکن معاشرے میں زندہ ہے۔ ہر سال 24 اپریل کو لوگ "آئینی انقلاب" کو یاد کرتے ہیں۔ سو شل میڈیا پروائز ہونے والی تصاویر اور نوجوانوں کی کہانیاں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ یہ زخم اب تک نہیں بھرے۔ آج بھی ڈو مینیکن رپبلک میں امریکی اثر نمایاں ہے۔ فوج کا بحث، معیشت کی سمت، حتیٰ کہ غیر ملکی پالیسی تک واشنگٹن کی ترجیحات کے مطابق چلتی ہے۔ لیکن ایک نئی نسل اب سامنے آ رہی ہے۔ یہ نسل آزاد خیالات رکھتی ہے، سو شل میڈیا کے ذریعے جڑی ہوئی ہے، دو زبانیں جانتی ہے اور پرانے زخموں کی کہانی ٹک ٹک پر دیکھتی ہے۔ اس نسل کا خواب امریکہ سمیت کنٹرول سے مکمل آزادی ہے۔

کیا یہ نسل بوش کے خواب کو پورا کر سکے گی؟ کیا وہ زین کی منصغanza تقسیم، فوج پر آئینی کنٹرول اور خود مختار پالیسی کو ممکن بنائے گی؟ یا پھر ڈو مینیکن رپبلک کے عوام ہمیشہ امریکی غلامی کا طوق پہن کر ایسے ملک میں رہیں گے جہاں واشنگٹن کے فصیلے کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا؟

-----فائل 07-SA کا اختتام-----

ملک: برازیل

سال: 1964

فائل: SA-08

اکتیس مارچ انیں سوچونسٹھ کی صبح برازیل کی فوج کے خفیہ ریڈیو سکنر نے اعلان کیا کہ آپریشن فارو پیلها شروع ہو چکا ہے۔ صرف اڑتا لیں گھنٹوں میں صدر ژاؤ گولارٹ ملک چھوڑ کر یوراگوئے پہنچ گئے اور جنل ہمیئر ٹو کاسٹیلو برانکو نے تی فوجی حکومت سن بھال لی۔ یہ بغاوت بظاہر برازیلی فوج نے کی لیکن اس کی تیاری اور ڈیلیوری واشنگٹن نے کرانی۔ امریکہ کے لیے یہ لاطینی امریکہ میں اپنی مرضی کی حکومتیں بٹھانے کا ایک کامیاب ماذل ثابت ہوا اور کتنی نسلوں تک امریکہ اور برازیل کے تعلقات پر اس کا سایہ رہا۔

پس منظر بہت دلچسپ ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد برازیل جنوبی امریکہ کا سب سے بڑا صنعتی ملک بن کر ابھرا۔ امریکہ نے قرضے دیے، شاہراہیں بنوائیں، اسٹیل ملیں لگوائیں، تاکہ برازیل سرمایہ دارانہ ترقی کی روشن مثال بنے اور برا عظم میں کیوںزم کو روکا جاسکے۔ مگر یہ ترقی تضادات لے کر آئی۔ شہری مزدور طبقہ وارگاس کے قوانین کا حامی تھا، جاگیر دارانہ زمینوں پر کسانوں کی محرومیاں بڑھ رہی تھیں، اور اشرافیہ کو ان دونوں سے خطرہ تھا۔ افراط زر بڑھا، سرمایہ کار غیر مقینی میں پھنسے، اور برازیلی سیاست میں کشمکش تیز ہو گئی۔

اسی ماحول میں ژاؤ گولارٹ ابھرے، وارگاس کے شاگرد اور گاؤچو پس منظر کے مالک۔ وہ نائب صدر بنے اور انیں سو اسٹھ میں صدر کا منصب سن بھالا تو امریکی پریشانی بڑھ گئی۔ گولارٹ نے سوویت یونین سے روابط رکھئے، زین کی اصلاحات کا منصوبہ بنایا اور ناخواندہ عوام کو ووٹ کا حق دینے کا اعلان کیا۔ واشنگٹن میں انہیں فیدل کاسترو جیسا خطرہ سمجھا جانے لگا۔ کینیڈی انتظامیہ نے دوہری حکمت عملی اپنائی۔ سامنے سے سفارت کاری کی باتیں ہوتیں لیکن خفیہ طور پر سازش تیار ہوئی۔ سی آئی اے کے افسران برازیلی جنزوں سے رابطے میں تھے۔ ایک خفیہ منصوبہ بنایا گیا جسے "برادر سیم" کہا گیا۔ امریکی بحری بیڑے کو تیار کھا

گیا تاکہ فوجی بغاوت کو ضرورت پڑنے پر فوری سپورٹ دی جاسکے۔ مارچ انیس سو باسٹھ سے مارچ انیس سو چونسٹھ کے درمیان امریکہ نے گولارٹ مخالف جماعتوں، یونیزراور میڈیا کو خفیہ فنڈز دیے۔

تیرہ مارچ انیس سو چونسٹھ کو گولارٹ نے ریو ڈی جنرل میں ایک بڑے جلسے سے خطاب کیا۔ انہوں نے جاگیرداروں کی زینیں ضبط کرنے، ناخواندہ افراد کو ووٹ کا حق دینے اور فوجی جوانوں کو سیاسی حقوق دینے کا اعلان کیا۔ یہ تقریر براہ راست نشر ہوئی اور واشنگٹن کے تجزیہ کاروں نے اسے کیوبا کی مونکاڈا تقریر سے تشبیہ دی۔ اسی رات فیصلہ ہو گیا۔ بغاوت اکیس مارچ کی صح شروع ہوئی۔ جنرل موراؤ فلہو کی فوجی ڈوبٹن روکی طرف بڑھ گئی۔ سی آئی اے کے قریبی ایڈمن نے بھریہ کو کٹھول کر لیا۔ امریکی سفیر لنکن گورڈن نے فوری طور پر واشنگٹن کو اطلاع دی۔ صدر لنڈن جانسن نے مداخلت کی منظوری دے دی۔ گولارٹ نے جب دیکھا کہ فوجی چھاؤنیاں ان کے خلاف ہو چکی ہیں تو وہ یوراگوئے فرار ہو گئے۔ بغاوت ستائیس ہلکتوں کے ساتھ مکمل کامیاب رہی۔

فوجی حکومت نے اقتدار سنبھالتے ہی کمیونسٹ پارٹی پر پابندی لگادی، ہزاروں افسروں اور پروفیسروں کو برطرف کر دیا اور آئینی ترامیم کے ذریعے صدر کو ڈکری جاری کرنے کے لامحدود اختیارات دے دیے۔ انیس سو اڑسٹھ کے بعد تو پارلیمنٹ بھی بند کر دی گئی۔ اگلے اکیس سالوں میں انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیاں ہوئیں۔ سینکڑوں افراد ہلاک یا غائب ہوئے، ہزاروں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ تشدد کے مرکز میں امریکی مشیر بھی موجود رہتے تھے۔ اس دوران واشنگٹن کی مالی مدد سے معیشت میں تیز رفتار ترقی ہوئی جسے برازیلی مجhzہ کہا گیا لیکن دولت کی تقسیم مزید غیر مساوی ہو گئی۔ غریب کسان مزید دب گئے اور امریکی کارپوریشنز نے زرعی زمینوں پر قبضہ کر لیا۔

شقافتی دنیا بھی متاثر ہوئی۔ حکومت نے فلموں، ڈراموں اور گانوں پر پابندیاں لگاتیں۔ نوجوان فنکاروں نے خفیہ طور پر مراجحت جاری رکھی۔ مذہبی حقوق میں بھی آزادی الہیات کی تحریک اٹھی جس نے فوجی آمریت کو چیلنج کیا۔ واشنگٹن کو اپنی پالیسیوں کا فائدہ یہ ہوا کہ برازیل نے کیوبا سے تعلقات توڑ دیے، امریکی فوجی آپریشنز میں شرپک ہوئے اور یمنٹاگوں کو ایمیزوں میں نگرانی کی سہولت ملی۔ مگر ستر کی دہائی کے آخر میں امریکہ کو خود تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ جب کارٹر حکومت نے انسانی حقوق پر دباؤ ڈالا تو

برازیل نے کہا کہ آپ نے یہ مسئلہ خوبیدا کیا ہے۔ سی آئی اے کی مداخلت پر امریکی سینیٹ میں تحقیقات ہوئیں جنہوں نے سب کچھ بے نقاب کر دیا۔

انیس سو پچاسی میں فوجی حکومت ختم ہوئی لیکن اس کے اثرات ختم نہ ہوتے۔ نیا آئین فوج کو اب بھی سیاست میں مداخلت کا حق دیتا ہے۔ دو ہزار بارہ میں بننے والے نیشنل ٹریک کمیشن نے سینکڑوں لاپتہ افراد کی فہرست شائع کی لیکن پرانے جرائم کے ذمے دار آج تک سزا سے بچے ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ موجودہ دور میں بھی اس تاریخ کا سایہ قائم ہے۔ سابق صدر بولسونارو نے فوجی بغاوت کو ہیروز کی کاروائی کہا جبکہ صدر لولانے امریکی مداخلت کی تفصیل بتانے والی ہزاروں دستاویزات عام کر دیں۔ آج بھی برازیل میں سیاست، فوج اور عوام کے درمیان کشمکش جاری ہے۔ آٹھ جنوری دو ہزار تیس کے فسادات نے یہ ثابت کر دیا کہ تاریخ کے زخم ابھی بھرے نہیں۔

انیس سو چونٹھ کی بغاوت نے برازیل کی سیاست، میشیٹ اور معاشرت کو بدل کر رکھ دیا۔ اس نے ملک کو زیادہ مرکزیت پسند، فوجی اثرات والا اور عدم مساوات سے بھرپور بنایا۔ امریکی مداخلت کے خلاف گہری تفریت اب بھی سیاسی شفاقت کا حصہ ہے۔ آج جب برازیل زینی اصلاحات، پشن سسٹم اور ڈیجیٹل نگرانی جیسے مسائل پر بحث کرتا ہے تو ماضی کا سایہ ساتھ چلتا ہے۔ ہر احتجاج میں آنسو گیس سونگھنے والا شہری سوچتا ہے کہ شاید تاریخ دوبارہ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔

-----فال 8-SA کا اختتام-----

ملک: بولیویا

سال: 1971

فائل: SA-09

کبھی آپ نے سوچا ہے کہ امریکہ کیسے اتنی آسانی سے جمہوری حکومتوں کا تختہ اٹادیتا ہے؟ ایک صدر کو کیسے قتل کیا جاتا ہے؟ یہ صرف ایک گولی سے نہیں ہوتا۔ پہلے اس ملک کی معیشت کو ختم کیا جاتا ہے، اس ملک کے دوستوں کو الگ کیا جاتا ہے، پھر اس کی عوام کو ڈرایا جاتا ہے۔ پوری پلانگ کی جاتی ہے۔ یہی کچھ 1971 میں بولیویا کے صدر خوان خوسے تورس کے ساتھ ہوا تھا۔

یہ کہانی اس وقت شروع ہوتی ہے جب بولیویا میں ایک عام آدمی کی آواز اٹھنی شروع ہوئی۔ صدر تورس ایک ایسے رہنماء تھے جو غریبوں، کسانوں اور مزدوروں کے حقوق کے لیے کھڑے ہوئے۔ انہوں نے امریکی کمپنیوں کو وہاں سے نکالا، غیر ملکی فوجی اڈے بند کیے، اور ملک کی دولت عوام میں باٹنے کی کوشش کی۔ ان کا خواب ایک ایسا بولیویا تھا جو با اختیار ہو، جو کسی بیرونی طاقت کا محتاج نہ ہو۔

لیکن دوستو، امریکہ کو یہ بات بالکل پسند نہیں آئی۔ صدر نکسن نے فوری طور پر بولیویا پر معاشری پابندیاں لگا دیں۔ بین الاقوامی بینکوں نے قرضے دینے بند کر دیے۔ ملک میں مہنگائی آسمان کو چھوٹے لگی۔ یہ سب ایک منصوبے کے تحت ہو رہا تھا۔ اس منصوبے کا نام تھا "آپریشن ماریا ڈافونٹے"۔

پھر ایک آدمی سامنے آیا۔ ہیو گوینزر۔ ایک جنرل جو اسکول آف امریکا میں پڑھا تھا، اور جو ارجمندینا میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا۔ اسے مکمل امریکی حمایت حاصل تھی۔ اٹھارہ اگسٹ کو وہ بھیس بدلت کر بولیویا واپس آیا۔ اس کے ساتھ بر ازیل کی فوجی حکومت نے ہتھیاروں سے بھرے ہوئے جہاز بھیجے، جنہیں سانتا کروز کے ہوائی اڈے پر اتار گیا۔

بیس اگست کی رات لاپاز شہر میں خون کی ہولی کھیلی گئی۔ صدر تورس نے عوام سے مزاحمت کی اپیل کی۔ مزدوروں اور کسانوں نے پرانی بندوقیں اٹھا کر حکومتی محل کا دفاع کیا۔ لیکن وہ بیچارے امریکی ہتھیاروں سے لیس فوج کا مقابلہ کیسے کرتے؟ ہو ٹلوں کی چھتوں پر مشین گنیں لگائی گئی تھیں، جو بے گناہ عوام پر گولیاں برساری تھیں۔

صحیح ہوتے ہوئے صدر تورس کے پاس صرف ایک وفادار مسجروہ گیا تھا۔ انہیں مجبوراً ایک چھوٹے ہواں جہاز میں بیٹھ کر پروکی طرف نکلا پڑا۔ جب جہاز اڑا، تو لوگوں نے پلانا مریلو چوک پر قومی ترانہ گایا اور نعرے لگائے۔ "تورس زندہ ہے، جدو جہد جاری ہے"۔ سرکاری طور پر ایک سو دس افراد مارے گئے، مگر حقیقی تعداد کہیں زیادہ تھی۔

اس کے بعد بینز نے سترہ سال تک ملک پر حکومت کی۔ اس نے تمام ترقیاتی منصوبے ختم کر دیے۔ مزدور یونینوں پر پابندی لگا دی۔ ہزاروں لوگ مارے گئے یا غائب کر دیے گئے۔ معیشت کو مکمل طور پر امریکی مفادات کے لیے کھول دیا گیا۔ یہ دور تھا جب پورے لاطینی امریکہ میں آپریشن کونڈور چل رہا تھا، جس میں امریکہ کی سی آئی اے مختلف ملکوں کی فوجی حکومتوں کو اپنے مخالفین کو ختم کرنے میں مدد دے رہی تھی۔

صدر تورس کو ارجمندینا میں جلاوطنی کے دوران چھ جون 1976 کو قتل کر دیا گیا۔ یہ قتل بھی آپریشن کونڈور کا حصہ تھا۔ ان کی ہاتھ پاؤں بند ہمی لاش ایک کچرے کے ڈھیر پر ملی۔

آج بولیویا میں 19 اگست یوم جمہوریت کے طور پر منایا جاتا ہے۔ صدر ایوو مورالس نے صدارتی محل کا نام تبدیل کر کے "پالاسیو کیماڈو خوان خو سے تورس" رکھ دیا ہے۔ کان کن ہر سال ان کے نام پر چھم اٹھاتے ہیں اور وہی نعرہ لگاتے ہیں "تورس زندہ ہے، جدو جہد جاری ہے"۔

-----فال 09-SA کا اختتام-----

ملک: بولیویا

سال: 2006-2019

فائل: SA-10

جب امریکہ کا حکم ہو تو فوج کا سربراہ اپنے ہی صدر سے کہہ سکتا ہے کہ "ہم آپ سے استعفی مانگتے ہیں؟" یہ 9 نومبر 2019 کا واقعہ ہے جب بولیویا کی فوج کے کمانڈر جنرل ولیم کالیمان نے صدر ایوو مورالس کے سامنے یہ جملہ کہا۔ یہ کوئی مشورہ نہیں تھا بلکہ یہ فوجی بغاوت کا باقاعدہ آغاز تھا۔

اس کی کہانی کچھ پچھے سے شروع ہوتی ہے۔ ایوو مورالس بولیویا کے پہلے ریڈ انڈین صدر تھے۔ ان سے پہلے تقریباً دو سو سال تک ملک پر یورپی نسل کے لوگوں کی حکومت رہی تھی۔ مورالس نے ملک کے قدرتی وسائل کو قومی ملکیت میں لیا، خاص طور پر گیس کے ذخائر۔ اس سے حکومتی آمدنی دس گناہ بڑھ گئی اور غربت میں بہت کمی آئی۔ لیکن ان پالیسیوں سے امریکہ اور ملک کے امیر طبقے میں شدید نیچجی بیدا ہو گئی۔

سنہ 2019 میں مورالیس نے ایک بار پھر انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔ آئین میں صرف دو مدت کی حد تھی، لیکن ان کے حامیوں نے عدالت سے ایک فیصلہ لے لیا کہ وہ دوبارہ انتخاب لڑ سکتے ہیں۔ اکتوبر میں ہونے والے انتخابات کے ابتدائی نتائج میں جب مورالیس فاتح نظر آئے تو مخالفین نے دھاندلی کا الزام لگادیا۔ امریکی تنظیموں نے بھی فوری طور پر الزامات لگادیے، حالانکہ بعد کی ایک تحقیق میں ثابت ہوا کہ کوئی دھاندلی نہیں ہوئی تھی۔

پھر کیا ہوا؟ سڑکوں پر پرشدہ مظاہرے شروع ہو گئے۔ سانتا کروز کے امیر علاقے سے تعلق رکھنے والا ایک شخص لوئیس فرنینڈو کامajo، جس کے پاس بڑی بائیبل تھی، لاپاز آیا اور کہا کہ وہ "خدا کو محل میں واپس لے کر آئے گا"۔ پولیس بغاوت پر اتر آئی۔ فوج نے صدر کو استعفی دینے کے لیے کہا۔ اور پھر 9 نومبر کو مورالس کو اپنی زندگی بچانے کے لیے ملک چھوڑنا پڑا۔

اس سارے عمل میں امریکہ کا ہاتھ صاف نظر آ رہا تھا۔ صدر ٹرمپ نے فوج کو "عوام کی مرضی" کی خدمت پر مبارکباد دی۔ بعد میں یہ انکشاف ہوا کہ امریکہ نے مخالفین کو مالی مدد فراہم کی تھی۔ یہاں تک کہ کامپو اور امریکی سینیٹرز کے درمیان میں فون کالز کے ثبوت بھی سامنے آئے۔

مورالس کے جانے کے بعد ایک نئی عبوری حکومت بنی جس نے انتقام کا بازار گرم کیا۔ فوج کو مظاہرین پر گولیاں چلانے کی مکمل چھوٹ دے دی گئی۔ ساکا با اور سینکھا میں کسانوں اور کان کنوں پر فائزگ کی گئی جس میں چھتیس سے زیادہ افراد مارے گئے۔ مقامی لوگوں کے پرچم کوٹی وی پر جلاتے ہوئے دھایا گیا۔ یہ واضح طور پر نسل پرستانہ تشدد تھا۔

لیکن کہانی یہاں ختم نہیں ہوتی۔ اکتوبر 2020ء میں ہونے والے نئے انتخابات میں مورالس کی جماعت ایک بار پھر کامیاب ہوئی۔ تو س آرسی نئے صدر بننے اور مورالس واپس آگئے۔ عبوری صدر جینین اینیز کو بعد میں قتل کے الزام میں دس سال قید کی سزا سنائی گئی۔

اس واقعے کے گھرے اثرات ہیں۔ اس نے ثابت کیا کہ آج بھی لاطینی امریکہ میں جمہوریت کو بیرونی قوتیں اپنے مفادات کے لیے استعمال کر سکتی ہیں۔ بولیویا کی میشت اب بھی انفارسٹرچرل قرضوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ سب سے اہم بات یہ کہ ملک کا lithium جو دنیا بھر میں الیکٹرک کاروں کے بیٹریوں کے لیے انتہائی اہم ہے، اب ایک نئی جغرافیائی جنگ کا مرکز بن چکا ہے۔ امریکہ ان وسائل پر نظریں گاڑے ہوئے ہے۔

-----فائل 10-SA کا اختتام-----

# ملک: یوروگوائے

سال: 1973

فائل: SA-11

ستائیں جون 1973 کی صبح مونٹی ویڈیو کے لوگ جا گے تو انکا شہر بدل چکا تھا۔ ٹینک شہر کے بیچوں نیچ کھڑے تھے، فوجی اہم سرکاری عمارتوں پر قابض تھے اور جمہوریت کا چراغ ایک ہی دن میں بجھ چکا تھا۔ یہ یوروگوائے کی تاریخ کا سب سے برا دن تھا، اور یہ کہانی سن کر آپ کو اندازہ ہو گا کہ کس طرح ایک ملک جسے کبھی "امریکہ کا سوئزر لینڈ" کہا جاتا تھا، اچانک آمریت کے اندر ہیروں میں دھکیل دیا گیا۔

یوروگوائے بیسویں صدی کے آغاز سے ہی لاطینی امریکہ میں ایک مثال تھا۔ یہاں فلاہی اصلاحات کی گئی تھیں، یونیورسل تعلیم کا نظام تھا، مزدوروں کے حقوق تسلیم کیے گئے تھے اور جمہوری ادارے مضبوط تھے۔ اس ملک کا معیار زندگی خطے کے دوسرے ممالک سے کہیں بہتر تھا اور اسے امن، خوشحالی اور جمہوری استحکام کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ لیکن 60 کی دہائی کے آخر ملک حالات بدلنے لگے۔ میشیست جمود کا شکار ہو گئی، افراط زر آسمان کو چھو نے لگا، تختوں میں کم ہوتیں اور مزدور تحریکیں تیز ہو گئیں۔ اسی ماحول میں ایک نیا عنصر سامنے آیا، جس نے یوروگوائے کی سیاست کو ہلا کر رکھ دیا۔

یہ تھے "پیamaros"۔ یہ ایک شہری گوریلا گروپ تھا جو نوجوانوں اور بائیں بازو کے دانشوروں پر مشتمل تھا۔ انہوں نے حکومت کی کرپشن کو بے نقاب کرنے کے لئے مسلح جدوجہد شروع کی۔ انہیں غریب عوام کی بہت ہمدردی ملی، لیکن جیسے جیسے ان کی سرگرمیاں بڑھتی گئیں، مٹل کلاس اور امیر طبقے میں خوف پھیل گیا۔ حکومت نے سختی سے کھلنے کا فیصلہ کیا۔ صدر جارج پاشیکو آریکو نے ہنگامی قوانین نافذ کیے، سنسر شپ لگائی، ہزاروں لوگوں کو گرفتار کیا اور آہستہ آہستہ فوج کو داخلی سلامتی کے معاملات میں شامل کرنا شروع کر دیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جہاں سے فوج کی طاقت بڑھنے لگی۔

مارچ 1972 میں جب خوآن ماریا بوردا بیری صدر بننے تو ملک پہلے ہی بھر ان میں ڈوبا ہوا تھا۔ معیشت تباہی کے دہانے پر تھی، افراط زر 80 فیصد سے زیادہ ہو چکا تھا، اور تپاماروس ابھی بھی ایک بڑا خطرہ تھے۔ بوردا بیری نے شروع میں جمہوری اقدار بحال کرنے کا وعدہ کیا، لیکن جلد ہی سخت گیر فوجی قیادت کے دباؤ میں آکر انہوں نے فوج کے ساتھ ہاتھ ملا لیا۔ فروری 1973 میں فوج نے صدر کو الٹی میٹم دیا کہ یا تو انہیں اندر وнутی سلامتی پر مکمل کنٹرول دیا جائے یا پھر وہ خود اقتدار سنبحال لیں گے۔ بوردا بیری نے ہتھیار ڈال دیے اور ٹی وی پر آکر آئینی آزادیوں کی معطلی کا اعلان کر دیا۔ یہ جمہوریت کے خاتمے کی شروعات تھی۔

پھر 27 جون 1973 کا وہ منحوس دن آیا جب فوج نے دارالحکومت کے وسط میں پارلیمنٹ کو گھیر لیا۔ بوردا بیری نے پارلیمنٹ سے کہا کہ سیاسی جماعتوں پر پابندی لگائی جائے اور ایک نئی غیر جمہوری نظام کی بنیاد رکھی جائے جس میں اقتدار فوج اور چند سویلینز کے ہاتھوں میں ہو۔ پارلیمنٹ نے انکار کر دیا۔ اس کے جواب میں بوردا بیری نے فوج کی مدد سے پارلیمنٹ کو تخلیل کر دیا۔ اس دن نہ کوئی گولی چلی نہ خون بہا، لیکن یوروگوانے کی جمہوریت کا خاتمه ہو گیا۔ فوجی قیادت نے اقتدار پر قبضہ کر لیا اور بوردا بیری محض کٹھپتلی صدر بن کر رہ گئے۔

اگلے دس برس یوروگوانے کے لیے ایک ڈراؤنا خواب بن گئے۔ فوجی حکومت نے کمیونزم اور دہشت گردی کے نام پر ایسا جبر کیا کہ دنیا میں شاید ہی کوئی مثال ہو۔ ہر دس میں سے ایک بالغ مرد کو جیل میں ڈال دیا گیا۔ سیاسی قیدیوں کی تعداد آبادی کے تناسب سے دنیا میں سب سے زیاد تھی۔ خفیہ حراستی مرکز میں تشدد کا ایسا سلسلہ چلا کہ لوگ غائب ہونے لگے۔ طالب علم، اساتذہ، مزدور رہنماء، صحافی، حتیٰ کہ صرف بائیں بازو کی ہمدردی رکھنے والے لوگ بھی نشانہ بنے۔ تپاماروس کو تو 1975 تک ختم کر دیا گیا، مگر جبر بندہ ہوا۔

جون 1976 میں فوج نے بوردا بیری کو بھی ہٹا دیا کیونکہ وہ ایک ایسا غیر منتخب نظام بنانا چاہتے تھے جو فوج کو مکمل اختیار دے دیتا۔ جنرل اپاریسیو مینڈیز صدر بننے اور یوروگوانے ایک "بیورو کریکٹ آمریت" میں بدل گیا۔ معیشت کو سنبحانے کے لیے نجکاری اور آزاد منڈی کی پالیسی اپنائی گئی، لیکن اس سے معاشی ناہمواری اور بھی بڑھ گئی۔

مگر ظلم ہمیشہ نہیں چلتا۔ 1980 میں فوج نے ایک نیا آئین ریفرنڈم میں عوام کے سامنے رکھا تاکہ اپنی طاقت کو مستقل بنایا جاسکے، لیکن عوام نے اسے مسترد کر دیا۔ یہ پہلا بڑا دھچکا تھا۔ آہستہ آہستہ ملک میں احتجاج بڑھنے لگا، عالمی سطح پر یوروگوانے تہاڑ پڑے۔

گیا، اور فوج کو احساس ہوا کہ اب اقتدار چھوڑنے کے سوا کوئی راستہ نہیں۔ 1984 میں ایک معاهدے کے تحت انتخابات ہوئے اور یوروگوانے کی جمہوریت واپس آئی۔

مگر آمریت کے زخم بہت گہرے تھے۔ ہزاروں لوگ آج تک اپنے لاتسیسیاروں کی تلاش میں ہیں۔ 1986 میں فوجی جرائم پر عام معافی کا قانون لایا گیا، جس پر آج تک بحث ہوتی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ تحقیقات دوبارہ شروع ہوئیں، کئی فوجی رہنماؤں کو سزا ملی، حتیٰ کہ سابق صدر بورڈا بیری کو بھی 30 سال قید کی سزا ہوئی۔

آج یوروگوانے لاٹینی امریکہ کی سب سے مستحکم جمہوریتوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہاں میڈیا آزاد ہے، ادارے مضبوط ہیں اور انسانی حقوق کا شعور گہرا ہے۔ لیکن 27 جون 1973 کا سبق آج بھی زندہ ہے۔

اب آتے ہیں امریکہ کے کردار کی طرف۔

امریکہ کا کردار اس پوری کہانی میں بظاہر خاموش تھا، مگر حقیقت میں نہایت فیصلہ کن ثابت ہوا۔ ستر کی دہائی سرد جنگ کا دور تھا، اور امریکی پالیسی کا مقصد یہ تھا کہ جنوبی امریکہ میں کوئی بھی تحریک یا حکومت جو سو شلزم یا کمیونزم کی طرف جا سکتی ہو، اسے ہر قیمت پر روکا جائے۔ یوروگوانے میں ٹوپاماروس کی تحریک کو بھی اسی زاویے سے دیکھا گیا۔

بعد میں منظر عام پر آنے والی سی آئی اے کی دستاویزات سے پتہ چلا کہ امریکہ نے یوروگوانے کی فوج کو براہ راست تربیت، خفیہ معلومات، اور سیاسی حمایت فراہم کی۔ کئی فوجی افسران کو پانامہ کے "امریکن اسکول آف اپیلائیڈ اسٹڈیز" میں خصوصی تربیت دی گئی، جہاں بغاوت کھلنے اور مخالفین کو دبانے کے طریقے سکھائے جاتے تھے۔ انہی تربیت یافتہ افسران نے 1973 کی فوجی بغاوت میں اہم کردار ادا کیا۔

امریکہ نے صرف تربیت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ فوجی حکومت کو معاشی اور سفارتی سپورٹ بھی دی۔ جب بورڈا بیری نے جمہوریت ختم کی تو واشنگٹن کی طرف سے کوئی رد عمل نہیں آیا۔ اس وقت وائٹ ہاؤس کو خوف تھا کہ اگر فوج اقتدار پر قابض نہ ہوئی تو بائیں بازو کی حکومت آسکتی ہے، اس لیے انہوں نے عملی طور پر اس تبدیلی کو قبول کر لیا۔

امریکہ کا کوڈار سب سے واضح آپریشن کنڈور میں سامنے آیا۔ یہ جنوبی امریکہ کے مالک کا خفیہ نیٹ ورک تھا جس کے ذریعے بائیں بازو کے کارکنوں کو گرفتار، لاپتہ یا قتل کیا جاتا تھا۔ سی آئی اے نے صرف اس منصوبے سے آگاہ تھی بلکہ کتنی معاملات میں معلومات اور ٹینکنالوجی بھی فراہم کرتی رہی۔ بظاہر امریکہ نے اس آپریشن کی ذمتوں کی، لیکن عملی طور پر اس کی حمایت جاری رکھی تاکہ خطے میں کیونزم کے اثرات کو روکا جاسکے۔

وقت کے ساتھ جب ان خفیہ منصوبوں کا انکشاف ہوا تو امریکہ کو عالمی سطح پر شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ اگرچہ اس نے کبھی باضابطہ معافی نہیں مانگی، لیکن بعد کی کچھ امریکی حکومتوں نے اسے "سیاسی غلطی" تسلیم کیا۔

-----**فائل 11-SA کا اختتام**-----

ملک: جلی

سال: 1973

فائل: SA-12

گیارہ ستمبر 1973 کی صبح ساڑھے نوبجے، سانتیاگو کے آسمان میں ہاکر بھڑ جنگی طیارے نمودار ہوئے۔ چند لمحوں بعد، صدارتی محل لا مونیدا کی چھت پر بم گرے اور دنیا نے ایک زندہ جمہوریت کو جلتے دیکھا۔ اندر صدر سلوادور آلندے اپنے آخری لمحوں میں کھڑے تھے، سرپر اسٹیل کا ہیلٹ، ہاتھ میں وہ اے کے 47 پکڑے۔ انہوں نے ریڈیو پر اپنی آخری تقریر میں کہا "میں استغفاری نہیں دوں گا، میں اپنی قوم کی وفاداری کا قرض اپنی جان سے چکاؤں گا"۔ دوپہر دو بجے تک محل راکھ بن چکا تھا، مقبول عوامی لیڈر آلندے، انکے بھادر محافظوں اور جمہوریت کی لاشیں محل میں بکھری پڑی تھیں۔ چھیا لیس سال پرانی چلی کی جمہوریت ایک دن میں ختم ہو گئی۔

یہ کہانی 1973 سے نہیں بلکہ 1958 سے شروع ہوتی ہے، جب آلندے پہلی بار ایکشن ہارے تھے۔ صرف تین فیصد کے فرق سے۔ اگلے بارہ سال انہوں نے سو شلسٹ، کیونسٹ، ریڈیکل اور ترقی پسند عیسائیوں کو ملا کر ایک اتحاد بنایا جس کا مقصد یہ تھا کہ دولت کی منصافانہ تقسیم کی جائے مگر جمہوری ادارے قائم رہیں۔ سنہ 1970 میں آخر کار وہ صدر بن گئے۔ لیکن چونکہ ان کے پاس پچاس فیصد سے کم ووٹ تھے، تو فیصلہ کا نگریں نے کرنا تھا۔

واشنگٹن میں صدر نکسن کے لیے یہ نتیجہ ناقابل برداشت تھا۔ ایک ملک جہاں لوگ آزادانہ ووٹ دے کر ایک مارکسٹ کو منتخب کریں، وہ امریکہ کو کیسے قبول ہو سکتا تھا۔ ایسی جمہوریت مغرب کو کبھی پسند نہیں آتی تھی۔ نکسن نے سی آئی اے کے ڈائریکٹر رپرڈ بلنز کو حکم دیا "آلندے کو ہٹاؤ، چاہے جو ہو، اس کی معیشت کو چخنے پر مجبور کرو"۔ اگلے دنوں میں دو خفیہ منصوبے شروع ہوئے۔ ایک میں سیاستدانوں کو رشوت دے کر آلندے کو روکنے کی کوشش ہوئی، دوسرے میں فوج کے اندر بغاوت کی سازش بنی۔ دونوں ناکام ہو گئے جب آئینی جزیل رینے شناہیڈر کو گولی مار دی گئی۔

3 نومبر 1970 کو آنندے نے حلف اٹھایا۔ اسی دن امریکہ نے چلی کے قرضے روک دیے اور وینزویلا پر اقتصادی پابندیاں عائد کر دیں۔ جواب میں آنندے نے امریکی کمپنیوں انکوڈا اور کینیکٹ کو کہا کہ چلی اپنے وسائل قومی ملکیت میں لے گا۔ یہ گستاخی امریکی سرمایہ داروں کو کیسے قبول ہو سکتی تھی؟

پہلے سال آنندے نے لینڈ ریفارمز شروع کیں، ہزاروں جاگیروں کو کسانوں میں بائٹا۔ مددوروں کی تخلوا ہیں بڑھیں، تعلیم اور صحت میں بہتری آئی، مگر بیرونی دباؤ بڑھتا گیا۔ 1972 تک افراطِ زر ایک سو ساٹھ فیصد سے اوپر جا چکی تھی، درآمدی اشیاء کے بغیر کارخانے بند ہونے لگے۔ امریکی خفیہ ایجنس نے ٹرک مالکان کو ہڑتال پر اکسایا، جس سے ملک کی سپلائی چین رک گئی۔ کھانے پینے کی چیزیں کم ہو گئیں، مگر جب اپوزیشن نے حکومت کے خاتمے کی بات کی تو مارچ 1973 کے انتخابات میں آنندے کی حمایت بڑھ کر 43 فیصد ہو گئی۔ مخالفین کو یقین ہو گیا کہ آنندے کو جمہوریت کے اندر رہ کر نہیں ہٹایا جا سکتا۔ اب صرف بندوق ہی راستہ ہے۔

جون 1973 میں ایک بغاوت ناکام ہوئی، مگر اگست میں دفاعی وزیر جنرل پراتس کو مہم چلا کر مستعفی کر دیا گیا۔ ان کی جگہ ایک خاموش اور غیر سیاسی سمجھے جانے والے جنرل آگسٹو پونشے کو لایا گیا، جس نے بظاہر وفاداری کا وعدہ کیا مگر خفیہ طور پر سی آئی اے اور نیوی کے ساتھ بغاوت کا منصوبہ طے کر لیا۔ 8 ستمبر کو اس نے باضابطہ طور پر بغاوت کی تاریخ پر دستخط کیے۔

11 ستمبر کی صحیح بھریہ نے شہر کا کنشول سنبھالا، فون لائنیں کاٹ دی گئیں۔ آرمی کے ٹینک دار الحکومت کی طرف بڑھے۔ آنندے کو چار بار ہتھیار ڈالنے کی پیشکش کی گئی، مگر انہوں نے انکار کیا۔ جب طیاروں نے دوبارہ حملہ کیا تو محل آگ کی لپٹ میں تھا۔ آنندے نے عورتوں کو نکل جانے کا حکم دیا، باقی محافظوں کے ساتھ آخری گولیوں کی تقسیم کی، اور دوپھر ایک نج کرپچار منٹ پر محل پر فوج نے دھاوا بول دیا۔ بیس منٹ بعد ایک فائر کی آواز آئی، اور جمہوریت ختم ہو گئی۔

فوج نے فوراً کانگریس تحلیل کر دی، سیاسی جماعتوں پر پابندی لگادی، اور ہزاروں لوگوں کو گرفتار کیا۔ قومی استیڈیم قیدیوں سے بھر گیا۔ گلوکار و کٹرہارا کے ہاتھ توڑ دیے گئے، پھر اسے گولی مار دی گئی۔ تین سال میں ہزاروں شہری غائب یا قتل ہو چکے تھے۔ ملکی معیشت ٹھیک کرنے کا ذمہ "شاکا گوبواتز" نے اپنے ذمے لیا، یہ امریکی یونیورسٹی سے معیشت کے ماہرین تھے۔ انہوں نے آزاد منڈی کا نظام مسلط کیا، سرکاری ادارے بیچ دیے، ٹیکس کم کیے اور غیر ملکی سرمایہ کاروں کو دوبارہ مدعو کیا۔ افراطِ زر ختم ہوئی مگر

بے روزگاری میں فیصد تک پہنچ گئی۔ عام لوگوں کی اجرتیں جنہیں آئندہ نے بڑھایا تھا، میں سال بعد جا کرو اپس اسی سطح پر آ سکیں۔

پر جیم چینچ آپریشن دنیا کیلئے ایک نمونہ بن گیا۔ سی آئی اے کے تعاون سے جنوبی امریکہ کے مالک نے "آپریشن کوئڈور" کے نام سے ایک خفیہ اتحاد بنایا جس میں مخالفین کو سرحد پار قتل کیا جاتا تھا۔ انہی میں سے ایک تھا آئندے کا وزیر آرلینڈو لیٹلیلر، جسے واشنگٹن میں کار بم سے اڑا دیا گیا۔ یہ واقعہ پورے براعظم کے لیے سبق بن گیا کہ اگر کسی ملک نے جمہوری انداز میں بھی سرمایہ دارانہ نظام کو چینچ کیا تو اس کا انجام خوفناک ہو گا۔

پنوشہ نے 1980 میں ایک نیا آئین نافذ کیا جو فوجی طاقت اور سرمایہ دارانہ ڈھانچے کو آئینی تحفظ دیتا تھا۔ اس میں ایسے قوانین رکھے گئے جن سے باہمی بازو کی جماعتیں کبھی پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل نہ کر سکیں۔ اگرچہ 1989 میں جمہوریت بحال ہوئی، مگر اسی آئین نے الگی دو دہائیوں تک طاقت کا توازن دائیں بازو کے حق میں رکھا۔ آج بھی چلی اسی آئین کے تحت چل رہا ہے، اگرچہ اس کی ساکھ بار بار چینچ ہو رہی ہے۔

پچاس سال گزرنے کے بعد بھی اس دن کی یاد قوم کو بانٹ دیتی ہے۔ سنہ 2003 میں تیس لاکھ لوگ آئندے کی یاد میں جمع ہوئے، مگر 2023 میں صرف تیس ہزار نوجوان نسل جو 1990 کے بعد پیدا ہوئی، وہ اب ایک نئے سو شل کانٹریکٹ کی تلاش میں ہے۔ وہ سوال اٹھا رہی ہے کہ کیا آزاد منڈی پر مبنی ماذل جو بموں کے ساتے میں نافذ ہوا تھا، آج ان کی ضروریات پوری کر سکتا ہے؟ یہ کیسی جمہوریت پسندی ہے جو صرف اپنے ملک کی حد تک ہے اور اگر کوئی ملک آپ کا حکم ماننے سے انکات کرتا ہے، اپنے عوام کی مرضی کا راستہ اختیار کرنا چاہتا ہے تو آپ بے دردی سے اس جمہوری حکومت کو ختم کر دیتے ہیں۔ آپ اس ملک میں کوئی ظالم ڈکٹیٹر نامزد کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ جس سوچ نے چلی میں جمہوریت کا قتل کیا وہ آج بھی واشنگٹن میں زندہ ہے۔ آج کل جنگی طیارے صدارتی محل پر بمباری نہیں کرتے مگر معاشی دباؤ، قرضوں کی بندش، میڈیا مہماں اور آن لائن مداخلت وہی کردار اوکر رہی ہیں۔ آج کل سو شل میڈیا جمہوری حکومتوں پر پروگریڈ بم گراتا ہے۔

-----فائل 12-SA کا اختتام-----

ملک: ارجمندان

سال: 1976

فائل: SA-13

چونیس مارچ 1976 کی صبح تین بج کر اکیس منٹ پر، ارجمندان کی فوج نے صدر ایسا بل پیروں کے خلاف بغاوت کا اعلان کیا جس کے بعد ایک ایسے خونی دور کا آغاز ہوا جس میں ہزاروں افراد کو صرف اپنی رائے رکھنے کے جرم میں لاپتہ کر دیا گیا۔

اس خونی قصے کی شروعات صدر خوان پیروں کی موت سے ہوتی۔ جولائی 1974 میں ان کی وفات کے بعد ان کی بیوی، ایسا بل، جو نائب صدر تھیں، ملک کی صدر بن گئیں۔ اس وقت ارجمندان انتہائی تقسیم اور تشدد کا شکار تھا۔ بائیں بازو کے عسکریت پسند گوریلا جنگ لڑ رہے تھے اور دائیں بازو کے ڈیتھ اسکوڈ جوابی کارروائیوں میں مصروف تھے۔ ملک کی معیشت مکمل طور پر تباہ ہو چکی تھی اور مہنگائی کی شرح تین ہزار فیصد سے بھی تجاوز کر گئی تھی۔

ایسا بل پیروں کی حکومت بالکل ناکام ہو چکی تھی۔ فوج نے موقع کو بھانپ لیا۔ تین فوجی جرنیلوں، جنرل وڈیلا، ایڈمرل ماسیرا اور بریگیڈیر اگوستی نے مل کر بغاوت کی منصوبہ بندی کی۔ 24 مارچ کی رات، فوجی دستے صدارتی محل کے باہر جمع ہو گئے۔ ایسا بل پیروں کو گرفتار کر لیا گیا اور ایک فوجی جہاز میں بٹھا کر ملک سے باہر بھیج دیا گیا۔

یہاں سے وہ خوفناک دور شروع ہوا جسے تاریخ میں ڈری وار کا نام دیا گیا۔ فوجی حکومت نے اپنے مخالفین کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہزاروں اساتذہ، طلباء، وکلاء، یونین لیڈر اور عام شہریوں کو ان کے گھروں سے اٹھا لیا گیا۔ انہیں خفیہ جیلوں میں قید کیا گیا، ان پر تشدد کیا گیا اور پھر انہیں بھیشہ کے لیے غائب کر دیا گیا۔ اندازہ ہے کہ تیس ہزار سے زائد افراد کو لاپتہ کر دیا گیا۔ حاملہ خواتین کو ان کے بچوں کو جنم دینے تک زندہ رکھا جاتا، پھر انہیں قتل کر دیا جاتا اور ان کے بچوں کو فوجی افسروں کے گھروں میں پالا جاتا۔ یہ ایک منظم طریقے سے لوگوں کی شناخت مٹانے کی کوشش تھی۔

اس ظلم کے خلاف احتجاج کرنے والی ماڈل نے پلازا ڈی میو میں مارچ کرنا شروع کیا۔ یہ مائیں اپنے بچوں کو ڈھونڈنے نکلتی تھیں۔ انہوں نے سفید رومال اپنے سر پر باندھ رکھتے ہوتے تھے جو ان کے بچوں کے ڈائیز کی علامت تھے۔ ان ماڈل کی آواز نے دنیا کی توجہ اس المی کی طرف کھینچی اور آخر کار فوجی حکومت کو جواب دہ ٹھہرایا گیا۔

سنہ 1982 میں فاک لینڈ جزائر پر حملہ فوجی حکومت کے خاتمے کا باعث بنا۔ برطانیہ سے جنگ میں شکست کے بعد فوجی حکمرانوں کی عزت خاک میں مل گئی اور انہیں اقتدار چھوڑنا پڑا۔ 1983 میں ملک میں جمہوریت بحال ہوئی۔

آج بھی ارجنٹائن اس دور کے زخموں سے نبرد آزمائے ہے۔ لپتا ہونے والے بچوں کو ڈی این اے ٹیسٹ کے ذریعے ڈھونڈا جا رہا ہے اور بوڑھے فوجی افسران کو عذالتوں میں گھسیٹا جا رہا ہے۔

آنے والے آپ کو اس کہانی کا سب سے اہم باب سناؤں جس کے بارے میں بات کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ ارجنٹائن میں 1976 کی فوجی بغاوت کے پچھے امریکہ کی مکمل حمایت اور مدد شامل تھی۔ سی آئی اے کے ڈائریکٹر جارج بش نے بغاوت سے تیرہ دن قبل ہی صدر فورڈ کو اس کے بارے میں بریفنگ دی تھی۔ امریکی سفیر رابرٹ بل نے فوجی افسران سے ملاقاتیں کر کے انہیں یقین دہانی کرائی کہ امریکہ نتیٰ حکومت کو فوری تسلیم کرے گا۔ ہنری کسنجر نے ارجنٹائن کے وزیر خارجہ سے کہا کہ "ضروری کام" جلدی نمٹا لو اور پھر معمول کی صورت حال بحال کرو۔ امریکہ نے فوجی حکومت کو پچاس ملین ڈالر کی فوری امداد دی۔ سی آئی اے نے جاسوسی کے آلات فراہم کیے اور دو سو سے زائد ارجنٹائن فوجی افسران کو امریکہ میں تشدد کی تربیت دی گئی تھی۔

-----فائل 13-SA کا اختتام-----

ملک: ایل سلواڈور

سال: 1979

فائل: SA-14

پندرہ اکتوبر 1979 کی صبح سان سلواڈور میں غیر معمولی طور پر سردی تھی، مگر فضا میں ایک عجیب ساتناؤ تھا۔ ابھی سورج پوری طرح نکلا بھی نہیں تھا کہ ریڈیو پر ہنگامی اعلانات چلنے لگے۔ فوج کی پہلی، تیسرا اور چھٹی بریگیڈز نے ملک کے سب سے بڑے فوجی اڈے سنہال لیے تھے، صدارتی محل گھیرے میں تھا اور جزل کارلوس ہومبرٹو رو میریو کو صاف کہہ دیا گیا تھا کہ ان کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ صبح ساڑھے نوبجے ایک بغیر نشان والے گواٹے مالن فوجی طیارے نے ایل او پانگو اینڈیس پر لینڈ کیا، رو میریو وردی پہنے اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ طیارے پر سوار ہوئے اور جلاوطنی اختیار کر لی۔ ریڈیو نیشنل پر ایک نوجوان کرنل نے پہلا اعلامیہ پڑھا۔ پرانی کاینہ تحلیل، آئین معطل اور اقتدار ایک پانچ رکنی انقلابی حکومت کے سپرد کر دیا گیا ہے۔ مقصد بتایا گیا کہ آئینی نظام بحال کیا جائے گا اور ملک کو مارکسٹ قبضے سے بچایا جائے گا۔ مگر کسی نے نہیں سوچا تھا کہ یہ اقدام بارہ سالہ خانہ جنگی کا آغاز بن جائے گا۔

یہ کہانی اچانک شروع نہیں ہوئی تھی۔ اس کے پس منظر میں کئی دہائیوں کا جبرا نہ موادی تھی۔ سن 1932 میں "لاماتازا" کے قتل عام کے بعد ملک کی دولت اور زمین چند بڑے کافی کے جاگیر داروں کے ہاتھ میں چلی گئی تھی جنہیں لوگ "چودہ خاندان" کہتے تھے۔ فوج اور جاگیر دار ایک دوسرے کے محافظ بن گئے۔ فوج طاقت دیتی اور جاگیر دار دولت۔ ستر کی دہائی تک صورتحال بگڑ چکی تھی۔ آبادی تیزی سے بڑھ رہی تھی، زمین چند ہاتھوں میں تھی اور نوے فیصد لوگ غربت میں پس رہے تھے۔ 1972 کا الیکشن کھلم کھلا چرایا گیا، مزدور ہڑتا لیں، کسان احتجاج اور طلبہ تحریکیں زور پکڑ گئیں، مگر حکومت نے بات سننے کے بجائے گولیاں چلاتیں۔ صرف 1972 سے 1979 کے درمیان تین ہزار سے زائد سیاسی کارکن مارے گئے یا غائب کرو یے گئے۔

آرج بشپ آسکر رو میریو محل کر کہہ چکے تھے کہ چرچ کو غریبوں کا ساتھ دینا ہوگا، مگر اقتدار کے ایوانوں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ فوجی جبر بڑھتا گیا، اور پھر ایک دن فوج کے اندر ہی اختلافات پھوٹ پڑے۔ نوجوان افسران جنہیں امریکہ کے اسکول آف دی امیریکا ز میں تربیت ملی تھی سمجھ چکے تھے کہ اندھادھن کچلنے کی پالیسی مزید آگ لگانے گی۔ دوسری طرف پرانے سخت گیر جرنیل اور جاگیردار اس بات پر ڈٹے ہوئے تھے کہ طاقت سے ہی سب کچھ دبایا جا سکتا ہے۔ اسی دوران نکاراگوا میں سینڈنسٹا انقلاب کامیاب ہوا۔ امریکہ کے لئے یہ خطرے کی گھنٹی تھی۔ جمی کارٹر کی حکومت کو لگا کہ کہیں ایل سلواڈور بھی کیونٹ ہاتھوں میں نہ چلا جائے۔ واشنگٹن سے ایچی بھیج گئے، مگر رو میریو نے کسی اصلاح کی بات نہ مانی۔ آخر کار امریکہ کے حمایت یافتہ نوجوان کرنلز نے خفیہ منصوبہ بنایا، اور 15 اکتوبر کا دن اس منصوبے کا انجام تھا۔

بغوات تقریباً خون کے بغیر مکمل ہو گئی۔ باغی افسران نے رات کے اندر ہیرے میں صدارتی گارڈ کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا، ریڈیو اسٹیشن پر قبضہ کیا اور اعلان کیا کہ اب ایک نئی انقلابی حکومت اقتدار میں آئے گی۔ پانچ رکنی حکومت میں دو فوجی، دو سویلین اور ایک سماجی جمہوری سیاست دان شامل تھے۔ ان کا اعلان تھا کہ زمین کی اصلاح ہو گی، مزدور یونیونز کو آزادی ملے گی، دیہات کے کسانوں کو حقوق ملیں گے اور تین سال میں انتخابات ہوں گے۔ امریکہ نے فور آپینسٹھ ملین ڈالر کی امداد جاری کی۔

مگر ملک سنبھلنے کی بجائے زیادہ مشکلات میں گھرا گیا۔ مارچ 1980 میں زرعی اصلاحات کے پہلے مرحلے کے اعلان کے ساتھ ہی کافی جاگیرداروں کا رد عمل شروع ہو گیا۔ انہوں نے کارخانے بند کیے، سرمایہ باہر منتقل کیا اور خفیہ طور پر ڈیتھ اسکواڈ کو فنڈ کرنا شروع کر دیا۔ فوج کے اندر بھی اختلاف شدید ہو گئے۔ اسی دوران 22 مارچ 1980 کو آرج بشپ رو میریو کو چرچ میں دعا پڑھتے ہوئے گولی مار دی گئی۔ ان کے قتل کے بعد حالات مزید بگڑ گئے۔ ان کے جنازے پر بھی سرکاری اسنائپرز نے فائز کھول دیا اور درجنوں لوگ مارے گئے۔

ملک تیزی سے خانہ جنگی کی طرف بڑھ گیا۔ بائیں بازو کی پانچ بڑی گوریلا تنظیمیں فارابونڈو مارتی نیشنل بریشن فرنٹ کے نام سے متحد ہو گئیں۔ دسمبر 1980 میں انہوں نے بڑے یہمانے پر حصی حملہ شروع کیا۔ دیہاتوں میں، شہروں میں، شاہراہوں پر جنگ پھیل گئی۔ امریکہ نے فوج کو جدید ہتھیار، ہیلی کاپڑز اور مشیر فراہم کیے۔ اس جنگ میں 75 ہزار لوگ مارے گئے، دس لاکھ بے

گھر ہوئے اور چھ ارب ڈالر کی امریکی امداد جھونک دی گئی۔ ایل موزو تے جیسے گاؤں میں سیکڑوں معصوم شہریوں کے قتل عام نے اس خانہ جنگی کو ایک تاریک علامت بنادیا۔

بارہ سال بعد 1992 میں چپولٹیک امن معابدہ ہوا۔ فوج کا سائز آدھا کر دیا گیا، ایک نتی سول پولیس فورس بنی اور گوریلا تنظیم ایف ایم ایل این کو سیاسی جماعت کے طور پر تسلیم کر لیا گیا۔ 2009 میں انہی سابق گوریلا رہنماؤں میں سے ایک، ماریسیو فونیس، صدر بنے۔ مگر امن معابدے کے باوجود عام لوگ بہتر زندگی سے محروم رہے۔ آج بھی زین کی ملکیت چند ہاتھوں میں ہے، غربت اپنی جگہ قائم ہے اور لاکھوں لوگ بہتر مستقبل کے لیے ملک چھوڑنے پر مجبور ہیں۔

خط کے لیے بھی یہ سب کچھ فیصلہ کن تھا۔ امریکہ نے اس جنگ کو اپنی سرد جنگ کی حکمت عملی کا حصہ بنایا۔ یہی پالیسی بعد میں نکار گوا، ہونڈوراس اور گوئٹے مالا میں بھی دہرائی گئی۔ آج جب موجودہ صدر نایب بوکیلے سکیورٹی فورسز کو براہ راست سڑکوں پر اتارتے ہیں تو یہ اسی ریاستی ہنگامی کلچر کا حصہ ہے جو 1979 کے بعد پروان چڑھا۔

پندرہ اکتوبر 1979 کو جو کچھ امریکی سازش کے ساتھ شروع ہوا اس کے مقاصد مکمل طور پر پورے ہوئے۔ ملک آج تک سنہل نہیں سکا۔

-----فائل 14-SA کا اختتام-----

ملک: نکاراگوا

سال: 1979

فائل: SA-15

انیں جولائی 1979 کی صبح، جب سندیسٹا گوریلا ماناگوا میں داخل ہوئے، اناستاسیو سوموزا ایک جہاز میں بیٹھ کر ملک سے فرار ہو گیا۔ تینتا لیس سالوں کی خاندانی حکمرانی کا خاتمہ ہو گیا، جس نے نکاراگوا کو ایسا ملک بنایا تھا جہاں تشدد عام تھا اور امریکی فوجیوں کی آمد و رفت بھی۔ سندیسٹا نیشنل بریشن فرنٹ کی اس فتح نے پورے خط کو ہلا کر رکھ دیا۔ شہروں میں سرخ اور کالے جھنڈے ہہ ائے جانے لگے، خواندگی مہم چلی، اور کیوبانے ڈاکٹر اور اساتذہ بھیجے۔ لیکن محض اٹھا رہا ماه بعد، ہونڈوراس کی سرحد پر گولیاں چلنا شروع ہوئیں، اور اگلے دس سالوں تک یہ ملک ایسی جنگ میں جھکڑا رہا جو محض خانہ جنگی نہیں تھی بلکہ واشنگٹن کی مالی اور فوجی مدد سے چلائی جانے والی ایک ایسی مہم تھی جس کا مقصد انقلاب کو اس کے ابتدائی دور میں ہی کچل دینا تھا۔ اس جنگ کی جڑیں انہی حالات میں تھیں جنہوں نے سندیسٹا انقلاب کو جنم دیا تھا۔ انیں سو اسٹھ میں کارلوس فونسکا امادور اور توماس بورہے نے اس تحریک کی بنیاد رکھی تھی، جس نے مارکسٹ نظریات کو آگسٹو سینڈینو کے نیشنل سٹ خیالات کے ساتھ ملا دیا تھا۔ ان کا مقصد بڑے جاگیرداروں کے خلاف بغاوت، نیشنل گارڈ کو ختم کرنا، اور امریکی اثر و رسوخ سے چھکارا حاصل کرنا تھا۔ سنہ 1972 میں آئے زلزلے نے ماناگوا کو تباہ کر دیا، اور سوموزا کے حامیوں نے بین الاقوامی امداد کی رقم ہڑپ کر لی۔ اس کے بعد مذاہمت کرنے والوں کی تعداد میں طبلاء، کسان اور چھوٹے کاروباری شامل ہوتے چلے گئے۔ سنہ 1978 میں مخالف اخبار کے ایڈیٹر پیدرو ہوآکن چامورو کے قتل کے بعد تو متوسط طبقہ بھی اس حکومت کے خلاف ہو گیا۔ سنہ 1979 تک کارٹر انتظامیہ، سوموزا کی بربریت سے شرمندہ ہو کر، فوجی امداد بند کر چکی تھی۔ گوریلا ماناگوا میں داخل ہوئے، لیکن ان کے زینی اصلاحات کے منصوبوں، سوموزا کے کاروباروں کو نیشنلائز کرنے کے اقدامات، اور خواندگی کی مہم نے امریکہ اور مقامی اشراfinیہ دونوں کے مفادات کو براہ راست چیلنج کر دیا۔

رونالڈ ریگن کے صدر بننے کے ساتھ ہی امریکی پالیسی مکمل طور پر جارحانہ ہو گئی۔ ریگن کا خیال تھا کہ نکارا گوا سوسویت یونین اور کیوبا کا اڈا بن رہا ہے۔ اس نے امداد منقطع کی، چینی کے کوئے ختم کیے، اور نومبر 1981 میں نیشنل سیکیورٹی ڈائریکٹو نمبر 17 جاری کیا۔ کونٹرا جنگجوؤں کے لیے مالیات کا بندوبست کیا۔ کونٹرا سوموزا کی نیشنل گارڈ کے فوجی ہندوراس میں پناہ گزیں تھے۔ بعد میں ان کے ساتھ سندینسٹا بھی شامل ہوئے جو پارٹی سے ماہس ہو چکے تھے، جیسے ایڈن پاستورا۔ انہوں نے خود کو کونٹرا یعنی کوٹر اریوالشن (رد القلب) کا نام دیا۔

امریکی ادارے سی آئی اے نے اس جنگ کو مالی اور فوجی مدد فراہم کی۔ ارجمندان کے فوجی افسران، جو خود اپنے ملک میں "ڈرٹی وار" لڑ چکے تھے، نے ہونڈوراس میں کونٹرا کو اغوا، تحریک کاری، اور نفسیاتی جنگ کی تربیت دی۔ سی آئی اے کے ہوائی جہاز رات کے اندر ہیرے میں ہتھیار اور رقم پہنچاتے تھے۔ سنہ 1982 تک کونٹرا کے پاس تقریباً ایک ہزار جنگجو تھے، ایک سال بعد یہ تعداد پانچ ہزار ہو گئی۔ کونٹرا کا پہلا بڑا حملہ مارچ 1982 میں ہوا، جب انہوں نے پان امریکن ہائی وے پر واقع پلوں کو اڑا دیا، تاکہ ایک سیلواؤ کی گوریلا تحریک کو ملنے والی سپلانی لائن کٹ جائے۔ اس کے جواب میں سندینسٹا حکومت نے ہنگامی حالت نافذ کر دی، سینس شپ عائد کی، اور نوجوانوں کو فوجی خدمت کے لیے بلانا شروع کیا۔ سنہ 1984 تک دفاع کے لیے قومی بجٹ کا 54 فیصد حصہ مختص ہو چکا تھا۔ اس جنگ کی خاص بات باقاعدہ لڑائیوں کے بجائے معاشی تحریک کاری تھی۔ کافی کے گودام جلا دیے جاتے، کسانوں کی کوآپریٹو سوسائٹیوں کو تباہ کر دیا جاتا، اساتذہ اور ہمیلتھ ورکرزوں کو قتل کر دیا جاتا، تاکہ عوام میں خوف وہر اس پھیلایا جاسکے۔

کانگریس نے 1982 میں پہلی بولینڈ ترمیم منظور کی، جس کے تحت سی آئی اے نکارا گوا کی حکومت کو گرانے کے مقصد سے فنڈر استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن وائٹ ہاؤس نے اس کی پاسداری نہیں کی۔ انہوں نے اس جنگ کا مقصد تبدیل کر کے اسے ایک سیلواؤ میں ہتھیاروں کی ترسیل روکنے کا نام دے دیا، اور فنڈر میں تین گنا اضافہ کر دیا۔ سی آئی اے نے کونٹرا کو تربیت دی کہ وہ مقامی حکام کو ختم کر کے اسے پر اپیگنڈے کے لیے استعمال کریں۔ جب بین الاقوامی عدالت انصاف نے 1986 میں فیصلہ دیا کہ امریکہ کا عمل بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی ہے، تو امریکہ نے اسے نظر انداز کر دیا۔

جنگ نے نکارا گوا کی سیاست کو انتہا پسند بنا دیا۔ اعتدال پسند رہنماء و ایلیٹا چامورو اور آرٹو روکروز نے حکومت چھوڑ دی۔ سنہ 1984 کے انتخابات ہنگامی حالت کے تحت ہوئے، جن میں ڈینیل اور تیگا نے کامیابی حاصل کی، لیکن امریکہ نے ان انتخابات کو جعلی قرار دے دیا۔ فوجی خدمت میں زبردستی بھرتی، ہزاروں فیصد تک مہنگائی، اور روزمرہ کی اشیاء کی قلت نے عوامی حمایت کو کم کر دیا۔ دبی ہی علاقوں میں تین لاکھ افراد بے گھر ہوئے۔ تاہم، سندینسٹا نے سائلہ ہزار مضبوط فوج تیار کر لی، جس میں سو ویسہ ہیلی کاپڑ اور کیوبن مشیر شامل تھے، اور اس نے کونٹرا کو بھاری جانی نقصان پہنچایا۔

سنہ 1986 میں ایران کونٹرا سکینڈل سامنے آیا، جس میں انکشاف ہوا کہ ریگن انتظامیہ ایران کو فروخت کیے گئے ہتھیاروں سے حاصل ہونے والی رقم کونٹرا جنگجوؤں کو دے رہی تھی۔ اس نے وائٹ ہاؤس کی عوامی حمایت ختم کر دی۔ سنہ 1988 میں دوسری بولینڈ ترمیم نے مہلک امداد مکمل طور پر بند کر دی۔ تہائی کاشکار ہو کر، کونٹرا اور سندینسٹا دونوں نے کوٹھاریکا کے صدر اوسکار آریاس کے امن منصوبے کو قبول کر لیا، جس پر اگست 1987 میں دستخط ہوئے۔ اس معاهدے میں جنگ بندی، عام معافی، اور جمہوریت کی بحالی کا وعدہ کیا گیا۔ فوری 1989 تک کونٹرا ہونڈوراس کے کمپوں میں واپس چلے گئے، اور فوری 1990 میں ہونے والے انتخابات میں عوام نے تحکم کر سندینسٹا کو ووٹ نہ دیا، اور وائیٹ چامورو کی قیادت میں اتحادی حکومت بنی۔

اس جنگ میں تیس ہزار افراد ہلاک ہوئے، جن میں زیادہ تر عام شہری تھے۔ معیشت ایک تہائی تک سکر گئی۔ یہ رونی قرضہ دس ارب ڈالر تک پہنچ گیا، جس نے بعد کی حکومتوں کو آئی ایم ایف کی شرائط پر صحت اور تعلیم کے شعبوں کو نجکاری پر مجبور کر دیا۔ کونٹرا کے یہیں ہزار جنگجو، جو ہتھیاروں اور سی آئی اے کے پیسے کے عادی ہو چکے تھے، نشیات کی اسمگنگ اور زینوں کے جھگڑوں میں ملوث ہو گئے، جس سے ملک میں تشدد اور عدم تحفظ کا لکھ پیدا ہوا۔ خطے میں، ہونڈوراس امریکی فوجی اڈا بن گیا، جو آج بھی قائم ہے۔ واشنگٹن کے لیے، اس جنگ نے خیہہ مداخلت کو معمول بنادیا۔

آج کے نکارا گوا میں، کونٹرا جنگ کی یادیں ہر بھرمان میں جھلکتی ہیں۔ ڈینیل اور تیگا کا 1907 میں دوبارہ بر سر اقتدار آنا انقلاب کی سماجی کامیابیوں اور نیو لبرل پالیسیوں کی ناکامیوں پر عوام کے غم و غصے کی وجہ سے تھا۔ لیکن ان کا اختیار پر قابض رہنے کا طریقہ، آمرانہ رویہ، اور 1918 میں مظاہرین پر تشدد، اس محاصرہ زدہ ذہنیت کی عکاسی کرتا ہے جو جنگ نے یہاں کی تھی۔ نوجوان

مظاہرین نے 1918 میں نعرہ لگایا کہ وہ ہمیں اسی طرح مار رہے ہیں جیسے اسی کی دہائی میں مارا گیا تھا۔ اور یہاں کو مترا کے خطرے کا حوالہ دے کر نتی پیر امیری فورسز کو جواز فرما دیا گیا۔ ہجرت میں ایک بار پھر اضافہ ہوا ہے، کیونکہ جنگ کے باعث پیدا ہونے والے قرضے اور ملٹری ائیزیشن کے اثرات آج بھی موجود ہیں۔

نکاراگوا کے مستقبل کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ 80 کی دہائی میں کھدائی ہوئی سیاسی اور معاشی خندقوں سے باہر نکل پاتا ہے یا نہیں۔ خطے میں صاف تو اتنا تیاری اور نیتر شورنگ کی طرف رجمان روزگار کے نئے موقع فراہم کر سکتا ہے، لیکن صرف اس صورت میں جب ملک کے متفرق ادارے بغیر دوبارہ ہتھیار اٹھانے ایک نئے سو شل کا ہٹریکٹ پر متفق ہو سکیں۔ واشنگٹن کا نکاراگوا کے شہریوں کے لیے عارضی محفوظ درجہ جاری رکھنے کا فیصلہ اس بات کا اعتراف ہے کہ اس کے باعث لگنے والے زخم آج بھی تازہ ہیں۔ ماناگوا کے انقلاب کے چوک میں لہراتے سرخ اور کالے جھنڈے اس بات کی علامت ہیں کہ ماضی کی جدوجہد کبھی فراموش نہیں کی جائے گی، لیکن ان کے نیچے وہ قبریں، وہ قرضے، اور وہ نسل موجود ہے جس کی جوانی کی دہائی سی آئی اے کے سپالائی طیاروں کی شور میں گزری تھی۔ یہ اس بات کی یاد دہائی ہے کہ کو مترا جنگ کا سب سے بڑا نقصان ایک پر امن، خود مختار نکاراگوا کا خواب بکھرنا تھا۔

-----فائل 15-SA کا اختتام-----

ملک: سورینام

سال: 1980

فائل: SA-16

پھیس فروری 1980 کی صبح سورینام کے دارالحکومت پیرا ماریبو میں سولہ نان میشنڈ افسر اچانک سرکاری عمارتوں پر چڑھ دوڑے۔ چند گھنٹوں میں وزیر اعظم یونک آرن کی مغربی حمایت یافتہ حکومت ختم ہو چکی تھی۔ بظاہریہ ایک معمولی فوجی بغاوت تھی، لیکن حقیقت میں یہ ایک ایسا واقعہ تھا جس نے اس چھوٹے سے جنوبی امریکی ملک کو سرد جنگ کے بڑے عالمی کھیل میں پھنسایا۔ اس بغاوت کی قیادت چوتیس سالہ سارجنٹ دیسی باوتر سے نے کی، اور امریکہ کی مرکزی خفیہ ایجنسی سی آئی اے کی نظریں پہلے ہی سورینام پر تھیں۔

امریکی دلچسپی کی جزیں کتنی دہائیوں پرانی تھیں۔ 1916 سے الٹینیم کمپنی آف امریکہ، جسے الکو کہا جاتا ہے، سورینام میں باکسائیٹ نکالنے کا کام کر رہی تھی۔ یہی معنیات الٹینیم بنانے کے لیے ضروری ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران امریکہ کا پچھتر فیصل باکسائیٹ اسی ملک سے آتا تھا۔ ستر کی دہائی تک الکو نے بہاں ڈیم اور فیکٹریاں بنالیں اور سورینام امریکہ کے لیے ایک اہم صنعتی ملک بن گیا۔ سنہ 1975 میں جب سورینام نے نیدر لینڈز سے آزادی حاصل کی تو امریکہ نے فوراً سفارتی تعلقات قائم کر لیے، کیونکہ امریکہ کے نزدیک یہ ملک اقتصادی خزانہ تھا اور وہ انقلاب اور آزادی تحریک کا دور تھا۔ دنبابھر کے لوگ آزادی اور حقوق مانگ رہے تھے۔ مغرب کیلئے آزادی اور حقوق کا مطلب منافع میں کمی تھا۔

وزیر اعظم آرن کی حکومت کرپشن، نسلی تقسیم اور بدانظامی کا شکار تھی۔ مہنگائی بڑھ رہی تھی، بے روزگاری عام تھی اور اسکے باوجود اس حکومت کو مکمل امریکی حمایت حاصل تھی۔ فوج میں نچلے درجے کے اہلکار، جو زیادہ تر افریقی تراویث تھے، شدید ناراض تھے۔ باوتر سے ان ہی ناراض فوجیوں کا نمائندہ بن کر سامنے آیا۔ حکومت نے جب ان کی فوجی یونین پر پابندی لگانے کی کوشش کی تو اس یونین نے اس بدعنوں حکومت کے خلاف بغاوت کر دی۔

بغاوت چند گھنٹوں میں خونریزی کے بغیر ہی کامیاب ہو گئی۔ صدر جوہان فریز کو علامتی طور پر عہدے پر رہنے دیا گیا مگر اصل اقتدار باغی فوجیوں کے نمائندے باہتر سے کے ہاتھ میں آگیا۔ نتی فوجی کو نسل بنی، آئین معطل ہوا، پارلیمان توڑ دی گئی، اور رات کا کرفیو لگا دیا گیا۔ فوجی احتجاج اب ایک انقلابی حکومت میں بدل چکا تھا۔

اپنی کٹھ ہتلی حکومت کے گرنے پر واشنگٹن میں خطرے کی گھنٹیاں بج گئیں۔ امریکی سفارت خانہ، جو چھوٹا سا عملہ رکھتا تھا، اس صورتحال کے لیے تیار نہیں تھا۔ سفیر نیشنی اوسٹرینڈ نے فوری طور پر رپورٹ بھیجی کہ باہتر سے نے کیوبا اور دیگر بائیں بازو کی حکومتوں سے رابطہ کیا ہے۔ امریکی اپنی اجارہ داری کا خاتمہ دیکھ رہے تھے۔ سی آئی اے نے سازش کی تیاری شروع کر دی، الکو نے مقامی طور پر مدد کی۔ فوجی حکومت کے مخالف دہشتگرد گروپوں کو خفیہ مددی گئی۔

باہتر سے نے ایک توازن قائم کئے رکھنے کی کوشش کی۔ سامراج مخالف تحریک کے ساتھ ساتھ اس نے امریکی کمپنیوں کو یقین دہانی کرائی کہ ان کا کاروبار محفوظ رہے گا۔ مگر امریکہ کسی قسم کا رسک لینے کو تیار نہیں تھا۔ سنہ 1982 میں مغرب کی حمایت اور فنڈنگ سے جہوری تحریکیں شروع کی گئیں۔ باہتر سے نے جواب میں پندرہ اہم ناقیں کو گرفتار کیا، ان میں صحافی، وکیل، اور ایک پادری شامل تھے۔ انہیں فورٹ زیلینڈیا لے جا کر تشدد کے بعد قتل کیا گیا۔ مغربی میڈیا نے اس واقعے کو "دسمبر قتل عام" کا نام دے کر اسکی بہت زیادہ تشویش کی۔ مغرب کو ایسے یہ سنبھالی موقعے کی تلاش تھی۔

نیدر لینڈز نے فوراً اپنی امداد بند کر دی۔ امریکہ نے بھی تعلقات مسجد کر دیے۔ سی آئی اے نے باہتر سے مخالف گوریلا گروپوں کی خفیہ مدد تیز تر کر دی جو فرقہ گیانا سے حملے کرتے تھے۔ ان میں رونی برزوک کی قیادت والا "جنگل کمانڈو" سب سے مشہور تھا۔ یہ جنگ، جسے سورینام انٹریئر وار کہا جاتا ہے، چھ سال چلی۔ سینکڑوں لوگ مارے گئے، دیہات جلاتے گئے، اور شہری علاقوں میں دہشت پھیل گئی۔ باہتر سے کی فوج نے مشتبہ دیہاتوں پر بدترین حملے کیے۔ 1986 کے موؤانا قتل عام میں درجنوں بے گناہ مارے گئے۔

امریکہ کا مطالبہ پورا ہوا تھا، ایک طرف ملک جل رہا تھا مگر الکو کی فیکٹریاں فوجی پہرے میں کام کر رہی تھیں۔ مگر اس کے باوجود سی آئی اے کی مداخلت جاری رہی۔ بعد کے برسوں میں جب سر د جنگ ختم ہونے لگی تو باہتر سے نے نرمی دکھائی۔

سنہ 1987 میں نیا آئین آیا، انتخابات ہوئے، اور جمہوری حکومت بنی۔ لیکن باوقت سے نے فوج پر گرفت بر قرار کھی۔ سنہ 2010 میں باوقت سے خود صدر نہ۔ اس نے 2020 تک حکومت کی۔

سی آئی اے کی مداخلت نے ایک چھوٹے ملک کو دہائیوں کے بحران میں ڈال دیا۔ سورینام کی جمہوریت آج بھی کمزور ہے، فوج طاقتور ہے، اور معیشت الکوکی رو انگی کے بعد لڑکھڑا رہی ہے۔ اب ملک نئی مشکلات سے دوچار ہے، سمندر میں ٹیل کی دریافت ہوئی ہے۔ چین میں سرمایہ کاری کر کے ترقی کا راستہ دکھایا ہے مگر امریکہ کو یہ چیز کسیے قبول ہو سکتی ہے۔ امریکہ ایک بار پھر سورینام میں مداخلت کی تیاری مکمل کر چکا ہے۔ سنہ 1980 کے انقلاب کی چھاپ بھی اب تک باقی ہے۔ سورینام کے لوگ اپنے پرانے مالکان کو آسانی سے راستہ دینے کو تیار نہیں ہیں۔ وہ بہتر ڈیل کے بغیر کسی معاهدے کا حصہ بننے کو تیار نہیں ہیں۔

-----فائل SA-16 کا اختتام-----

ملک: یہیں

سال: 1986 - 1988

فائل: SA-17

سنہ 1804 میں ایک ایسا ملک نقشے پر ابھرا جس نے دنیا کی تاریخ بدل دی۔ اس کا نام تھا یہیں۔ یہ دنیا کی پہلی سیاہ فام جمہوریہ تھی، اور انسانی تاریخ کا واحد کامیاب انقلاب جس کے نتیجے میں غلاموں نے آزاد ملک بنانا ڈالا تھا۔ مگر اسی لمحے اس کی تباہی بھی شروع ہو گئی، کیونکہ مغرب نے فیصلہ کر لیا تھا کہ یہیں کو جینے نہیں دینا۔

یہ کہانی شروع ہوتی ہے 1791 میں جب فرانس کی کالونی سینٹ ڈوینک میں غلاموں نے بغاوت کی۔ یہ وہ وقت تھا جب یورپ غلامی پر چل رہا تھا اور کالونیاں سونا اگل رہی تھیں۔ مگر یہی کے غلاموں نے تیرہ سال تک لڑ کر فرانس، سپین اور برطانیہ تینوں طاقتوں کو شکست دی۔ 1 جنوری 1804 کو انہوں نے آزادی کا اعلان کیا۔ لیکن مغرب کے غلاموں کے لیے غلاموں کی یہ جسارت ایک گناہ کبیرہ تھا۔ فرانس نے آزادی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور جب مانا تو شرط رکھی کہ یہی غلاموں کے فرانسیسی مالکان کو 150 ملین فرانک تاوان ادا کرے۔ یہ وہ رقم تھی جس نے ملک کو سو سال پچھے دھکیل دیا۔ امریکہ نے بھی خوف سے منہ موڑ لیا کہ کہیں اس بغاوت کی ہوا اس کے اپنے غلاموں تک نہ پہنچ جائے۔ مغرب نے یہی کو سفارتی اچھوت بنادیا۔

اگلے سو سال یہی نے زندہ رہنے کے لیے جدوجہد کی۔ مگر پھر 1915 میں امریکی فوج نے قبضہ کر لیا اور جو کچھ بچا تھا اسے بھی لوٹ لیا۔ امریکی استحکام لانے کے لئے آئے تھے۔ لیکن انہوں نے استحکام لاتے ہوئے بندگا ہوں، بینکوں اور محصولات پر بھی لنٹروں مضبوط کر لیا۔ امریکی فوج نے ایک نیا آئین نافذ کیا جس کے تحت غیر ملکی زمین خرید سکتے تھے۔ یعنی ملک کی خود مختاری ختم کر دی گئی۔ اس دوران ایک لیبر سسٹم متعارف کیا گیا جو غلامی سے کم نہیں تھا۔ امریکیوں نے ایک فوج تیار کی جو بعد میں یہی کے لوگوں پر ہی ظلم کرتی رہی۔ جب 1934 میں امریکی نکلے تو یہی آزاد تو تھا، مگر اپنے ہی سائز سے ڈرنے والا ملک

بن چکا تھا۔

سنہ 1957 میں ایک نیا دور شروع ہوا۔ فرانسوا دووالیے، جسے لوگ "پاپا ڈاک" کہتے تھے، صدر بننا۔ اس نے خود کو کالا قوم پرست اور وُوڈو پادری کہا، مگر درحقیقت وہ ایک ظالم آمر نکلا۔ اس نے ٹونٹن مکوت نامی ملیشیا بنائی جو عوام کو دہشت میں رکھتی تھی۔ امریکہ نے اسے مکمل حمایت دی۔ پاپا ڈاک کی موت کے بعد اس کا بیٹا "بی بی ڈاک" اقتدار میں آیا۔ وہ اپنے باپ جتنا خطرناک نہیں تھا مگر بہت زیادہ بد عنوان تھا۔ ملک بھوک، غربت اور خوف کا مجموعہ بن چکا تھا۔

سنہ 1986 میں جب عوام نے بغاوت کی تو بی بی ڈاک امریکی فوج کے جہاز میں بیٹھ کر فرار ہوا۔ امریکہ نے اسے خود کا لاتاک انقلاب نہ آئے۔ اس کے بعد جزل ہنزی نامفی نے اقتدار سنبھالا۔ امریکہ کے لیے وہ ایک "قابل اعتبار" شخص تھا۔ سی آئی اے نے اس کی راہ ہموار کی تاکہ ملک بظاہر بدل جائے مگر اصل نظام وہی رہے۔ مگر جلد ہی عوام کو احساس ہوا کہ یہ دو والیے کی ہی پالیسیز چلا رہا ہے۔ فوج وہی، مکوت وہی اور ظلم بھی وہی ہے۔

سنہ 1987 میں انتخابات کا اعلان ہوا۔ یہ موقع تھا کہ ملک نئی شروعات کرے۔ مگر پولنگ کے دن ہی بندوق برداروں نے ووڑز پر گولیاں چلاتیں۔ درجنوں لوگ مارے گئے۔ الیکشن نسخہ ہو گیا۔ دنیا نے مذمت کی، مگر امریکہ نے پھر بھی نامفی کی حمایت جاری رکھی۔ جنوری 1988 میں دھاندی سے ایک نیا صدر لایا گیا، لیسلی مانیگاٹ۔ لیکن جب اس نے فوج پر قابو پانے کی کوشش کی تو نامفی نے ہی اسے ہٹا دیا۔ جون 1988 میں نامفی خود صدر بن گیا، مگر تین ماہ بعد ہی ایک اور جزل پروپری آوریل نے بغاوت کر کے اسے نکال دیا۔ نامفی جلاوطن ہو گیا اور یہی ایک بار پھر بے سمت ہو گیا۔

سنہ 1988 سے 1994 تک ملک میں اقتدار کی کرسی گھومتی رہی۔ پانچ صدور آئے، کوئی اپنی مدت پوری نہ کر سکا۔ سنہ 1990 میں ایک پادری جین برٹرینڈ ارستید نے غریب عوام کی طاقت سے الیکشن جیتا۔ مگر صرف ایک سال بعد فوج نے اسے ہٹا دیا۔ امریکہ نے پابندیاں لگائیں مگر فوج کے خلاف کارروائی نہ کی۔ پھر جب ہزاروں پناہ گزین امریکی ساحلوں کی طرف بڑھنے لگے تو صدر کلنٹن نے اقوام متحده کے ساتھ 1994 میں فوجی کارروائی کی۔ ارستید کو واپس لایا گیا۔ یہ کہا گیا کہ جمہوریت بحال ہو گئی۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ یہی ایک بار پھر بیرونی طاقتوں کے رحم و کرم پر آچکا تھا۔

سنہ 2004 میں ارستیڈ کو دوبارہ نکال دیا گیا۔ اس بار ارستیڈ نے بیان دیا کہ امریکیوں نے اغوا کر کے اسے افریقہ پہنچایا تھا۔ واشنگٹن ایک بار پھر پردے کے سچھے فیصلے کر رہا تھا۔ اقوام متحده کی امن فوج آئی، مگر وہ بھی اپنے ساتھ وبا اور اسکینڈل لے آئی۔ یہی کے لوگوں کے لیے امن مشن بھی زحمت بن گیا۔

پھر 2010 کا زلزلہ آیا۔ دو لاکھ سے زیادہ لوگ مارے گئے۔ دنیا بھر سے اربوں ڈالر کا وعدہ ہوا، مگر وہ پسے غیر ملکی این جی اوز اور ٹھیکیداروں کے ہاتھوں میں گیا۔ یہی کے ادارے مزید کمزور ہو گئے۔ عوام مایوس، حکومت بے بس، اور یروں لوگ ملک کے اصل مالک بن گئے۔

2016 میں جوی نل مویز صدر بنا۔ ایک کسان، جو کہتا تھا وہ تبدیلی لائے گا۔ مگر جیسے جیسے ملک بگڑتا گیا، اس نے پارلیمنٹ ختم کر دی اور خود ہی حکمرانی شروع کر دی۔ 2021 میں اسے اس کے گھر میں قتل کر دیا گیا۔ قاتل کرنے کے فوجی تھے، جن میں کو لمبین اور یہی نژاد امریکی شامل تھے۔ اس قتل کے سچھے کون تھا، آج تک کوئی نہیں جانتا۔ اپ کتنی کہانیاں پڑھ کر یہاں تک پہنچے ہیں مجھے یقین ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ اس کے سچھے کون تھا۔

اس کے بعد یہی مکمل طور پر ٹوٹ گیا۔ دارالحکومت کا 90 فیصد حصہ اب گینگز کے قبضے میں ہے۔ حکومت محض نام کی ہے۔ وزیر اعظم ایریل ہنزی غیر منتخب تھا، کمزور تھا، آخر کار اس نے 2024 میں استعفی دے دیا۔ اقوام متحده نے کینیا کی قیادت میں ایک فورس بھیجی مگر حالات ویسے ہی ہیں۔ لوگ بھاگ رہے ہیں، کشتوں میں، سمندر کے راستے، امید کے بغیر۔

دو صدیوں بعد بھی یہی کی کہانی وہی ہے۔ ایک ایسا ملک جو آزادی کا مجرم ٹھہرا۔ فرانس کا تاؤان، امریکی قبضہ، سی آئی اے کی سازشیں، اقوام متحده کے مشن، ہر مداخلت نے ملک کو کمزور کیا۔ ہر بار مغرب نے کہا کہ وہ مدد کے لیے آیا ہے، مگر نتیجہ ہمیشہ ایک جیسا رہا، تباہی۔

یہی ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ غلاموں کو سب کچھ قربان کر کے آزادی تو مل سکتی ہے سکون کبھی نہیں مل سکتا۔ جب تک مغربی سامراجی نظام چلتا رہے گا کبھی کسی کمزور ملک کو خود مختاری نہیں ملے گی، خاص طور پر وہ لوگ جنہیں مغرب کمتر سمجھتا ہے۔ جو ان کی بنائی ہوئی دنیا کے اصولوں کو چیلنج کرتے ہیں۔ یہی کے غلاموں نے آقاوں کے اصول توڑے، اس کی سزا اسوقت تک ملتی رہے گی جب تک یہی ختم نہ ہو جائے یا پھر آقا ختم نہ ہو جائیں۔

لیکن یہ کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ یہی کے لوگوں کی رگوں میں فریڈم فائٹرز کا خون دوڑ رہا ہے۔ انہیں فطری طور پر غلامی قبول نہیں، جب تک یہ لوگ زندہ ہیں، امید قائم ہے۔ کیونکہ جو قوم غلامی سے لڑ کر بنی ہو، وہ موقع ملتے ہی دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکتی ہے۔

-----فائل SA-17 کا اختتام-----

ملک: پانامہ

سال: 1989

فائل: SA-18

یہ 20 دسمبر 1989 کی رات تھی جب امریکہ نے اچانک پانامہ پر حملہ کر دیا۔ صرف تین گھنٹوں میں آسمان آگ اور دھوئیں سے بھر گیا۔ امریکی فوج کے 24 ہزار سپاہی، جدید طیارے، ہیلی کاپٹر، نیوی سیلز اور ڈیلٹا فورس سب ایک ساتھ حرکت میں آگئے۔ پانامہ کے دارالحکومت پانامہ سٹی کے علاقے ایل چوریلو میں بمباری کے دوران لکڑی کے پرانے گھروں میں آگ لگ گئی اور پورا محل جل کر راکھ ہو گیا۔ آج بھی وہاں کے لوگ اس رات کو "لانو تچے تریستے" یعنی وہ رات جب آسمان جل رہا تھا، کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

یہ سب اچانک نہیں ہوا تھا۔ پس منظر کئی دہائیوں پر پھیلا ہوا ہے۔ پانامہ کی اہمیت صرف اس کی نہروں اور خوبصورتی کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ اس لیے کہ وہاں موجود پانامہ کینال دنیا کی تجارت کا سب سے بڑا راستہ ہے۔ امریکہ نے 1903 میں ایک معابدے کے تحت اس کینال پر کنٹرول حاصل کر لیا تھا اور سرد جنگ کے زمانے میں یہ جگہ سوویت یونین اور کیوبا کے خلاف اسٹریجیک فرنٹ لائن تھی۔

ایس سو ساٹھ کی دہائی میں ایک نوجوان کیڈٹ منوئل نوریگا امریکی خفیہ ایجنسی سی آئی اے کا مخبر بن گیا۔ وہ اپنے ساتھی طلبہ کی معلومات بیچتا تھا۔ جلد ہی وہ کرنل بنا اور امریکیوں کے لیے نکارا گوا کے بغایوں تک اسلحہ پہنچانے اور خفیہ یغام رسانی کا سب سے قیمتی ذریعہ بن گیا۔ امریکی حکومت نے اسے اپنا "آدمی" مانا کیونکہ وہ پانامہ کینال کی حفاظت بھی کر رہا تھا اور بائیں بازو کے انقلابیوں کو بھی کمزور کر رہا تھا۔

لیکن نوریگا صرف وطن فروش ہی نہیں ایک مشیات فروش بھی تھا۔ انہی راستوں سے جہاں سے اسلحہ جاتا تھا، کو لمبیا کی کو کین امریکہ پہنچ رہی تھی۔ 1980 کی دہائی میں پانامہ مشیات کی اس ملکنگ کا مرکز بن گیا۔ امریکی ایجنسیاں سب جانتی تھیں لیکن خاموش

رہیں کیونکہ نوریگا اس وقت تک ان کا آدمی تھا۔ پھر 1985 میں ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے سب بدل دیا۔ نوریگا کے مخالف ڈاکٹر ہو گو اسپادافورا کو اغوا کیا گیا، تشدد کیا گیا اور سرکاٹ کر لاش ایک تھیلے میں ڈال دی گئی۔ اس واقعے نے پانامہ کے عوام اور امریکی سینیٹ دونوں کو ہلا کر رکھ دیا۔

سنہ 1986 میں نیویارک ٹائمز نے نوریگا کی مشیات کی کمائی اور سی آئی اے کی تخفوا ہوں کے ثبوت شائع کر دیے۔ امریکہ کو مالی امداد روکنا پڑی، پھر 1988 میں میامی اور ٹامپا کی عدالتوں نے نوریگا پر مشیات اور منی لانڈرنگ کے الزامات لگا دیے۔ واشنگٹن نے اسے راضی کرنے کی کوشش کی کہ اقتدار چھوڑ کر اسپین چلا جائے لیکن وہ نہ مانا۔

پانامہ کے اندر بھی حالات خراب ہو گئے۔ 1989 کے الیکشن میں نوریگا کے مخالف امیدوار گیلیز موسینڈارا نے تین کے مقابلے میں ایک کے تناسب سے واضح جیت حاصل کی لیکن نوریگا نے نتائج شوخ کر دیے۔ اگلے دن اس کے مسلح گروہ اینڈارا کو سرعام مارنے پہنچنے لگے، ٹی وی کیروں کے سامنے اس کا گھٹنا توڑ دیا گیا۔ اس کے بعد صدر جارج بش نے فیصلہ کر لیا کہ اب صرف طاقت کا استعمال رہ گیا ہے۔

دسمبر 1989 میں ایک واقعہ حتیٰ تریگر بن گیا۔ چار امریکی فوجی افسر غلطی سے پانامہ کے ایک فوجی ہیڈ کوارٹر کے قریب پہنچ گئے۔ پانامہ کی فوج نے گولیاں چلانیں اور ایک امریکی لیفٹیننٹ مارا گیا۔ اسی رات امریکی سلامتی کونسل کا ہنگامی اجلاس ہوا اور آپریشن جسٹ کاز کا حصہ ہوتی حکم جاری کر دیا گیا۔

20 دسمبر کو علی الصبح حملہ شروع ہوا۔ امریکی فوج نے چوالیس مقامات پر بیک وقت دھاوا بولا۔ جدید اسلحہ، سیٹلاتٹ کمیونیکیشن، رات کو دیکھنے والے چشمے، سب کچھ پہلی بار آزمایا گیا۔ ایف ۱۷ سیٹلٹھ فائٹرز نے پہلی بار عملی جنگ میں حصہ لیا۔ صرف دو دن میں نوریگا کی فوج کا ڈھانچہ زین بوس ہو گیا۔ امریکی فوج نے اینڈارا کو اقتدار سونپ دیا جبکہ نوریگا ویٹکن کے سفارت خانے میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔ دس دن تک امریکی فوج اس سفارت خانے کے باہر بلند آوازیں راک میوزک بجاتی رہی تاکہ نوریگا کی حوصلہ شکنی ہو۔ آخر کارتین جنوری 1990 کو نوریگا نے ہتھیار ڈال دیے۔

اس جنگ کی قیمت بھاری تھی۔ بائیس امریکی فوجی مارے گئے لیکن پانامہ کے دو سو سے زائد فوجی اور پانچ سو سے تین ہزار کے درمیان عام شہری جان سے گئے۔ پورے محلے جل کر راکھ ہو گئے۔ محلے کے بعد پانامہ شہر میں لوٹ مار شروع ہو گئی اور امریکی فوج کو کتنی دنوں تک امن بحال کرنے میں لگ گئے۔

اس محلے کے اثرات بہت گہرے تھے۔ پانامہ کی فوج ختم کر کے نتی پولیس فورس بنائی گئی جس کا براہ راست کنٹرول امریکی حکام کے پاس تھا۔ ایک ارب بیس کروڑ ڈالر کی امداد دی گئی، نیا قانونی نظام بنایا گیا اور نشیات کے ملزم ان کو امریکہ کے حوالے کرنے کا راستہ ہموار کیا گیا۔ لیکن سب سے بڑی تبدیلی یہ تھی کہ اس واقعے نے ایک نتی امریکی پالیسی کی بنیاد رکھ دی۔ اب امریکہ نے صاف دکھا دیا کہ وہ جہاں اپنے مفادات خطرے میں لیکھے گا وہاں فوجی مداخلت سے دربغ نہیں کرے گا۔ یہی ماؤل بعد میں یمنی، کوسوو اور عراق میں بھی اپنایا گیا۔

ائیس سوننانوے میں پانامہ کیناں کا کنٹرول پانامہ کے حوالے کر دیا گیا لیکن آج بھی امریکہ وہاں اثرورسوخ رکھتا ہے بلکہ پانامہ کی سیاست واشنگٹن کے اشاروں پر چلتی ہے۔ ہر صدارتی امیدوار سب سے پہلے امریکی سفارت خانے کا رخ کرتا ہے۔ آج، تین دہائیاں گزر جانے کے باوجود پانامہ کے لوگ 20 دسمبر کو یاد کرتے ہیں جب ان کے گھروں پر آگ بر سی تھی۔ اس وقت چین پانامہ میں بڑے منصوبے بن رہا ہے اور امریکہ دوبارہ متحرک ہو رہا ہے۔ پانی کی کمی اور عالمی تجارت کے نتے راستے پانامہ کیناں کے مستقبل کو مزید پچیدہ بنارہے ہیں۔

-----فائل 18-SA کا اختتام-----

ملک: ہندوراس

سال: 2009

فائل: SA-19

وہ بادلوں میں پیٹی 28 جون 2009 کی سرد صبح تھی جب ہندوراس کے دارالحکومت ٹیکو سیگاپا میں فوجی دستے صدارتی محل میں داخل ہوئے۔ صدر ینویل زیلایا اب بھی اپنے نائب سوت میں تھے۔ فوجیوں نے انہیں نزدستی اٹھایا، ہواں اڈے پر لے گئے اور کوستاریکا بھیج دیا۔ یہ سب اس وقت ہوا جب زیادہ تر ہندوران عوام بھی ناشتہ بھی نہیں کر پائے تھے۔ چند گھنٹوں میں لاٹینی امریکہ کا پہلا کامیاب فوجی بغاوت ہوئی جس نے سرد جنگ کے بعد جمہوری نظام کو جھٹکا دے دیا۔ لیکن اس ایک صبح کے پچھے کتنی دہائیوں کی تاریخ تھی جسے سمجھے بغیرہ واقعہ ادھورا لگے گا۔

ہندوراس کی تاریخ ہمیشہ سے وسائل پر کنٹرول کی کشمکش رہی ہے۔ یہاں کا معاشی ڈھانچہ ہمیشہ برآمدات پر کھڑا رہا، کبھی کیلا تو کبھی کافی۔ زمین کے بڑے رقبے چند خاندانوں کے قبضے میں رہے جبکہ عام کسان غربت میں پسے رہے۔ فوج بار بار سیاست میں مداخلت کرتی رہی، اور اصلاحات کی ہر کوشش طاقت کے زور پر کچل دی جاتی۔ 1980 کی دہائی میں امریکہ کے انسداد بغاوت نظریات مقامی اشرافیہ کے مفادات کیسا تھا ہم آہنگ ہو چکے تھے۔ اس کے بعد ایک ایسا سکیورٹی ڈھانچہ کھڑا ہوا جو کبھی مکمل طور پر پیرکوں میں واپس نہیں گیا۔ سرد جنگ ختم ہوئی تو واشنگٹن نے جمہوریت کے نعروں کے ساتھ ہندوراس کو آزاد منڈیوں میں دھکیل دیا، لیکن معاشی نابرابری مزید بڑھ گئی۔ سنہ 2009 کے مارش لاء کے محکمات دراصل یہی امریکی نظریات تھے۔

ینویل زیلایا 2005 میں صدر منتخب ہوئے تھے۔ ابتداء میں وہ ایک کاروباری ذہن رکھنے والے شخص تھے لیکن جلد ہی ان کا جھکاؤ بائیں بازو کی طرف ہو گیا۔ وینزویلا کے صدر ہو گو چاویز کے قریب آگئے اور مقامی مزدور تحریکوں کی حمایت کرنے لگے۔ مارچ 2009 میں زیلایا نے اعلان کیا کہ عوامی ریفرنڈم کروایا جائے گا کہ آیا نومبر کے انتخابات کے دوران ایک اضافی یہلٹ باکس رکھا جائے تاکہ فیصلہ ہو سکے کہ آیا ایک نئی آئین ساز اسٹبلی بلانی چاہیے یا نہیں۔ زیلایا کا موقف تھا کہ 1982 میں فوج کی نگرانی میں بنایا

گیا آئین عوامی نمائندگی کے قابل نہیں رہا، جبکہ ان کے امریکی حمایت یافتہ مخالفین انہیں اقتدار پر اپنے اقتدار کو طول دینے کا الزام لگاتے تھے۔

عدالتون نے ریفرنڈم کو غیر قانونی قرار دیا۔ پارلیمنٹ نے قانون بنادیا کہ انتخابات سے چھ ماہ قبل کوئی عوامی رائے نہیں لی جاسکتی۔ الیکشن کمیشن نے ویزویلا سے چھپ کر چھپوائے گئے بیلٹ پیپرز ضبط کر لیے۔ لیکن 24 جون کو زیلایا خود فوجی اڈے پر پہنچ گئے، ہزاروں حامیوں کے ساتھ، اور ضبط شدہ بیلٹ باس واپس لے آتے۔ یہ لمحہ فیصلہ کن ثابت ہوا۔ فوجی قیادت کو لگا کہ صدر نے ان کی حدود توڑ دی ہیں۔ جنرل رو میو و اسکیز نے مزید تعاون سے انکار کیا، زیلایا نے انہیں برطرف کر دیا لیکن سپریم کورٹ نے اگلے ہی دن جنرل کو دوبارہ بحال کر دیا۔ 28 جون کی صحیح سب کچھ طے ہو چکا تھا۔

فجر کے بعد فوج نے صدارتی محل کو گھیر لیا۔ صدر کی سکیورٹی فورس کو غیر مسلح کیا گیا اور زیلایا کو زبردستی ہوائی جہاز پر بٹھا دیا گیا۔ چند گھنٹوں کے اندر نیشنل کانگریس کا اجلاس بلا گیا۔ ایک جعلی استغفاری پڑھ کر سنایا گیا اور کانگریس کے سربراہ رویٹو میچیلیٹی کو نیا صدر قرار دے دیا گیا۔ ملک میں کرفیو نافذ کر دیا گیا، زیلایا کے حمایتی میڈیا چینل بند کر دیے گئے اور احتجاج کرنے والوں پر آنسو گیس کے شیل برساتے گئے۔ اقوام متحده، او اے ایس اور یورپی یونین نے بغاوت کی مذمت کی، لیکن امریکہ نے جریلوں کی حمایت جاری رکھی۔ بعد میں وکی لیکس کی دستاویزات سے انکشاف ہوا کہ واشنگٹن سب کچھ جانتا تھا اور خاموشی سے بغاوت کو قبول کر چکا تھا کیونکہ زیلایا کا ہو گو چاویز کی طرف جھکاؤ امریکی مفادات کے خلاف سمجھا جا رہا تھا۔

اگلے سات مہینے ہندو راس ایک آگ کا گولا بن گیا۔ زیلایا ملک سے باہر رہ کر عالمی دباو بڑھانے کی کوشش کرتے رہے جبکہ اندر ملک میں نیشنل ریز سٹنس فرنٹ نے مددوروں، کسانوں، خواتین اور اقلیتی گروپوں کو متحد کر کے ہڑتا لیں اور سڑکوں پر دھرنے شروع کر دیے۔ صرف پہلے چار مہینوں میں چار ہزار سے زائد انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں ریکارڈ ہوئیں۔ مظاہرین پر تشدد، خواتین کارکنوں کو ریپ کی دھمکیاں، آزاد میڈیا پر پابندیاں اور کم از کم دس افراد سکیورٹی فورسز کے ہاتھوں مارے گئے۔ ستمبر میں زیلایا خفیہ طور پر واپس آگئے اور برازیلیں سفارت خانے میں پناہ لے لی۔ فوج نے سفارت خانے کا محاصرہ کر کے پانی اور بجلی کاٹ دی، شور مچانے والے آلات نصب کر دیے اور پورے شہر کو ہنگامی حالت میں ڈال دیا۔ دنیا بھر کی نظر اس بحران پر تھی، لیکن بغاوت کرنے والوں کی پوزیشن مضبوط رہی۔

نومبر 2009 کے انتخابات میں قدامت پسند نیشنل پارٹی کے پورفیریو لوبو صدر بن گئے۔ زیالیا کو جلاوطنی اختیار کرنی پڑی اور ایک نئے سیاسی منظر نامے نے جنم لیا۔ زیالیا کی اہلیہ شیومارا کا سٹراؤ نے ایک نئی جماعت لیبرے بنائی، جو عام عوام اور کسانوں کو سیاسی عمل میں لائی۔ لیکن نئی حکومتیں دائیں بازو کی پالیسیوں کے ساتھ آگے بڑھتی رہیں۔ زین، پانی اور معدنی وسائل پر سرمایہ دارانہ قبضے کو قانونی شکل دی گئی۔ امریکہ نے انسداد مشیات کے نام پر فوج کو مزید وسائل دیے۔ تشدد سے بڑھ گیا۔ 2012 میں ہندو راس میں دنیا بھر میں سب سے زیادہ قتل ہوئے۔ مشیات کے کارٹیل، بد عنوان فوجی اور مقامی اشراffی ایک دوسرے میں گھل مل گئے۔ ماحولیاتی کارکنوں اور کسان رہنماؤں کو کھلے عام قتل کیا جانے لگا، جیسا کہ 2016 میں برٹا لیکریس کے ساتھ ہوا، اور قاتل تقریباً ہمیشہ نج نکلتے۔

بغوات نے ہندو راس کو ایک "ناکرو اسٹیٹ" میں بدل دیا۔ 2015 کے بعد امریکی عدالتوں میں ہندو راس کے درجنوں اعلیٰ سیاست دانوں پر مشیات کی اسمگنگ کے الزامات لگے، حتیٰ کہ سابق صدر ہیر ناندیز کا بھائی بھی اس فہرست میں شامل تھا۔ فوج اور پولیس کے کئی اعلیٰ افسران مشیات کے کاروبار کا حصہ بن گئے۔ عوامی ادارے مکمل طور پر مغلوق ہو گئے۔ 2017 کے انتخابات میں نتائج اچانک رک گئے، پھر پلٹے اور ہیر ناندیز کو جتوایا گیا، جس کے بعد احتجاج میں تیس سے زیادہ افراد فوجی فائزگ کا نشانہ بنے۔ عالمی اداروں نے نئے انتخابات کا مطالبہ کیا، لیکن امریکہ نے پرانی حکومت کو تسلیم کر لیا۔

آج پندرہ سال بعد بھی اس بغاوت کے اثرات زندہ ہیں۔ 2021 میں شیومارا کا سٹراؤ خود صدر بنیں، لیکن ان کے راستے میں وہی پرانے طاقتوں خاندان، فوج اور کرپٹ ادارے کھڑے ہیں۔ ہندو راس کے ہزاروں لوگ اب بھی امریکہ کی طرف ہجرت پر مجبور ہیں۔ موسم کی تبدیلی، غربت اور تشدد نے ان کا جینا محال کر دیا ہے۔ امریکہ کے لیے واقعہ ماضی کی ایک فائل ہے، لیکن ہندو راس کے عوام کے لیے آج بھی ایک زندہ زخم ہے۔

سنہ 2009 کی بغاوت نے ایک نئی نسل کو جنم دیا ہے، جونہ ماضی بھولنے کو تیار ہیں نہ مستقبل کی جنگ ہارنے کو۔

ملک: وینزویلا

سال: 2002-2025

فائل: SA-20

اپریل 2002 کی ایک دوپہر تھی، جب کاراکس کی سڑکوں پر لاکھوں لوگ نمرے لگا رہے تھے کہ "چاویز استعفی دو"۔ ٹی وی چینلز بند ہو چکے تھے، فوج کے ٹرک شہر میں گھوم رہے تھے، اور ایک لمحے کے لیے ایسا لگا جیسے انقلاب ختم ہو گیا۔ صدر ہو گو چاویز، جنہوں نے چند سال پہلے ہی غربیوں کو امید دلائی تھی، اب فوج کے ہاتھوں گرفتار ہو چکے تھے۔ صرف چند گھنٹوں بعد، امریکی حمایت یافتہ سرمایہ کار پیڈرو کار مونا نے ایک نئے صدر کی حیثیت سے اقتدار سنبھال لیا۔ دنیا دنگ رہ گئی، مگر جو بات سب سے زیادہ چونکانے والی تھی، وہ یہ کہ امریکہ نے فوراً اس نئے صدر کو تسلیم کر لیا۔ گویا واشنگٹن برسوں سے اسی موقع کا انتظار کر رہا تھا۔

چاویز کی کہانی دراصل وینزویلا کے عوام کی پرانی مایوسی سے شروع ہوتی ہے۔ تیل کے سمندر پر بیٹھا یہ ملک 1980 کی دہائی میں قیمتیوں کے گرنے سے تباہ ہوا۔ غریب مزید غریب ہو گئے، امیر مزید امیر۔ دوپرانے سیاسی دھڑے برسوں تک آپس میں اقتدار باشٹے رہے، مگر عام آدمی کے لیے کچھ نہ بدلا۔ اسی ماحول میں ایک فوجی افسر سامنے آیا، ہو گو چاویز، اس نے 1992 میں فوجی بغاوت کی کوشش کی، ناکام ہوا، مگر لوگوں کے دل جیت لیے۔ جب 1998 میں الیکشن ہوا تو اس نے وعدہ کیا کہ اب دولت عوام میں بٹے گی، تیل صرف امیروں کا نہیں رہے گا۔ وہ جیت گیا، اور یوں "بولیوارین انقلاب" شروع ہوا۔

چاویز نے ملک کے تیل کے پیسوں سے سماجی پروگرام شروع کیے، تعلیم اور صحت میں سرمایہ لگایا، مگر ساتھ ہی اس نے سب سے طاقتو ر ادارے، یعنی PDVSA، کو بھی اپنے کنٹرول میں لے لیا۔ اس نے کہا کہ اب یہ کمپنی عوام کی ہے۔ امریکا کو یہ سب سخت ناگوار گزرا۔ واشنگٹن کے لیے ایک تیل پیڈا کرنے والا ملک، جو کھل کر کیوبا کے فیدل کاسترو کا دوست بن جائے، خطرہ تھا۔ یہی وہ وقت تھا جب چاویز اور امریکا کے درمیان ایک سرد جنگ شروع ہوئی۔

پھر آیا اپریل 2002۔ چاویز کے مخالفین نے عام ہڑتاں اور احتجاج کا اعلان کیا۔ حالات بگڑ گئے۔ فوج کے کچھ جرنیلوں نے اسے معزول کر دیا۔ چند ہی گھنٹوں میں امریکا نے نئی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ امریکی حکام، جن میں اوٹورنچ جیسے نام شامل تھے، پہلے ہی ان سازش کرنے والوں سے مل چکے تھے۔ مگر کارمناکی حکومت نے ایسا قدم اٹھایا جس نے سب کچھ الٹ دیا۔ اس نے پارلیمنٹ اور سپریم کورٹ دونوں کو ختم کر دیا۔ عوام بھر ک اٹھے۔ وہی غریب جو چاویز کے ساتھ تھے، سڑکوں پر نکل آئے۔ فوج کے اندر بھی وفادار افسر حرکت میں آگئے۔ صرف 47 گھنٹوں بعد چاویز واپس اقتدار میں واپس آ چکے تھے۔

یہ واقعہ چاویز کے لیے فیصلہ کن موڑ ثابت ہوا۔ امریکی سازش کی ناکامی نے اسے عوام میں یہ مقبول نہادیا۔ فوج، عدالتیں اور میدیا سب اس کے ساتھ تھے۔ عوام میں اس کی حیثیت قومی ہیرو کی بن چکی تھی۔۔۔ وہی مقبولیت جو فیڈل کاسترو اور پچھلے گوریا کو نصیب تھی۔ خوش قسمتی سے تیل کی قیمتیں بھی بڑھ گئیں، پیسہ آیا، اور چاویز نے اپنی سو شلسٹ پالیسیوں کو تیز کر دیا، پیسہ عوام پر نچحاور کر دیا۔ اس نے امریکہ کے خلاف نیا اتحاد بنایا جس میں بولیویا، نکاراگوا اور کیوبا جیسے ممالک شامل تھے۔ اسے یقین تھا کہ وہ لاطینی امریکا میں امریکی اثر کو ختم کر سکتا ہے۔ لیکن چاویز کو قدرت نے وقت نہیں دیا۔ پانچ مارچ، 2013 کو ویزویلا کا ہیرو ہو گو چاویز دنیا سے رخصت ہوا۔

چاویز کے بعد 2013 میں عوام نے اسکے پسندیدہ اور وفادار ساتھی نیکو لس مادورو کو صدر چنا۔ مگر قسمت نے رخ موڑ لیا۔ 2014 میں تیل کی قیمتیں گر گئیں۔ ملک کی معیشت تباہ ہونے لگی۔ خوارک، دوانیں، بجلی، سب کی قلت ہو گئی۔ مہنگائی اتنی بڑھی کہ کرنی سی بے معنی ہو گئی۔ لاکھوں لوگ ملک چھوڑنے لگے

امریکا نے اس موقع کو سیاسی دباؤ کے لیے استعمال کیا۔ پہلے اوباما حکومت نے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا الزام لگا کر چند حکام پر پابندیاں لگائیں۔ پھر ٹرمپ کے زمانے میں 2017 اور 2018 میں پابندیاں سخت ہو گئیں۔ تیل کی برآمدات پر مکمل پابندی لگا دی گئی۔ حکومت کو قرضوں کی ادائیگی سے روک دیا گیا۔ واشنگٹن کو امید تھی کہ فوج مادورو کا ساتھ چھوڑ دے گی۔ مگر اس کا الٹا اثر ہوا۔ مادورو نے فوجی جرنیلوں کو اعتماد میں لیا۔ فوج کو معیشت کے بڑے حصوں میں سٹیک ہولڈر بنایا۔

ایک نیا موڑ 23 جنوری 2019 کو آیا جب اپوزیشن لیڈر حوان گوایدو نے امریکہ کی ایماء پر خود کو عبوری صدر قرار دے دیا۔ امریکا اور یورپی ممالک نے اسے فوراً تسلیم کر لیا۔ مادورو پر دباؤ بڑھ گیا۔ امریکا نے ویزویلا کے بیرونی اشائے گوایدو کے نام منتقل کیے۔

تیل پر مکمل پابندی لگ دی گئی۔ مگر وہ ایک چیز جس پر ساری حکمت عملی کھڑی تھی، فوج کی بغاوت، وہ نہیں ہوئی۔ فوج نے مادورو کا ساتھ دیا۔

فروری 2019 میں امریکا نے کولمبیا کی سرحد پر انسانی امداد کے نام پر ایک کارروائی کی کوشش کی، تاکہ حکومت کو کمزور دکھایا جاسکے۔ مگر وہ ناکام رہی۔ مادورو نے سرحد بند کر دی۔ سنہ 2020 میں گوایدو کی تحریک بھی بیٹھ گئی۔ پھر ایک مضکمہ خیز کوشش ہوئی، جسے "آپریشن گڈیان" کہا جاتا ہے، جہاں چند سابق امریکی فوجیوں نے مادورو کو اغوا کرنے کی کوشش کی۔ وہ پکڑے گئے، اور پوری دنیا میں یہ کہانی مذاق بن گئی۔

ان سب واقعات کے بعد وینزویلا مکمل طور پر ایک نئی شکل میں سامنے آیا۔ سیاست میں اب ایک ہی جماعت کا راج تھا۔ اپوزیشن امریکی حمایت کے سہارے کھڑی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ فوج حکومت کے ساتھ کھڑی رہی۔ امریکہ اور اتحادیوں کی طرف سے پابندیوں کی بدولت معیشت تباہ ہو چکی تھی۔ سنہ 2013 سے 2023 تک ملک کی جی ڈی پی تقریباً 8 فیصد گر گئی، جو کسی جنگ زدہ ملک کے برابر نقصان تھا۔ حقیقت بھی یہی تھی کہ امریکہ نے وینزویلا پر جنگ مسلط کر رکھی تھی۔ سات ملین سے زیادہ لوگ ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ امریکی پابندیوں نے حکومت پر دباؤ توڑا، مگر عوام پر مکمل تباہی نازل کر دی۔ اس موقع پر امریکہ میں سب کو احساس ہو چکا تھا کہ امریکا کی "زیادہ دباؤ" کی پالیسی ناکام ہو چکی ہے۔ سنہ 2022 میں بائیڈن حکومت نے راستہ بدلا۔ انہوں نے مادورو حکومت سے بات چیت شروع کی۔ مقصد تھا 2024 کے انتخابات میں اپنی پسندیدہ اپوزیشن کیلئے گنجائش پیدا کرنا، اور بدلتے میں کچھ پابندیاں نرم کرنا۔ اس تبدیلی کے سچھے ایک عملی سوچ تھی۔ یوکرین جنگ کے بعد دنیا کو تیل کی ضرورت تھی، اور امریکا جانتا تھا کہ وینزویلا کو مکمل طور پر الگ رکھنا ممکن نہیں۔

روس اور چین نے اس خلا کو بھر دیا۔ انہوں نے مادورو کو مالی، فوجی اور سفارتی مددی۔ ان کے لیے وینزویلا امریکی بالادستی کے خلاف ایک مثال بن گیا۔ آج جب ہم خط کی سیاست دیکھتے ہیں، تو یہ واضح ہے کہ وینزویلا صرف ایک ملک نہیں بلکہ ایک علامت بن چکا ہے، اس بات کی علامت کہ اگر قوم متحد ہو اور قیادت محب وطن تو ایسی قوم کو توڑنا سپر پا اور زکیلنے بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

وینزویلا کا بحران ختم نہیں ہوا۔ ٹرمپ نے ایک بار پھر وینزویلا کا محاصرہ کر لیا ہے۔ وینزویلا پر اس امید پر نیجد دباؤ بڑھایا جا رہا ہے کہ کوئی سیاسی صحبوتہ ہو جائے گا، مگر لگتا یہی ہے، چاویز اور مادورو کا وینزویلا لڑے بغیر بار نہیں مانے گا۔ ایک طرف ٹرمپ نے وینزویلا کا فوجی محاصرہ کر رکھا ہے اور دوسری طرف ملک میں سیاسی بغاوت کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ ابھی تک تو امریکہ کی کوئی رجیم چینچ سازش وینزویلا میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ اب واحد آپشن براہ راست حملہ کرنا ہی بچی ہے۔ دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے۔

-----فائل 20-SA کا اختتام-----

# افریقہ



کانگو	1
جنوبی افریقہ	2
ٹوگو	3
الجیریا	4
گھانا	5
مالی	6
گنی	7
ایتھوپیا	8
انگولا	9
کوموروس	10
بیمن	11
زامبیا	12
نامیبیا	13
سی شیلز	14
یوگنڈا	15

# افریقہ



زimbabwe 16

سودان 17

بوتسوانا 18

موزمیق 19

برکینا فاسو 20

الجیریا 21

روانڈا 22

کانگو 23

اریٹریا 24

وسطی افریقہ 25

صومالیہ 26

مدغاسکر 27

ناٹھر 28

لیبیا 29



ملک: کانگو

سال: 1961

فائل: AF-01

چھ اگست 1945 کو ہیر و شیما پر گرنے والے "لشل بوائے" ایٹم بھم کا یورینیم کانگو کی شنکو لوبووی کان سے نکالا گیا تھا۔ اسی دن سے کانگو مغرب کے لیے صرف ایک کالونی نہیں رہا بلکہ ایک اسٹریچ جک معدنی خزانہ بن گیا تھا۔ امریکہ نے 1946 سے 1948 کے درمیان کانگو سے بارہ سو ٹن یورینیم خریدا۔ یہ وہ سارا ذخیرہ تھا جس نے امریکہ کا ایٹمی ہتھیاروں کا پروگرام شروع کیا۔ لیکن یہ معابدے کانگو کے عوام سے نہیں بلکہ بیلچم کی سوسائٹی جز ائل دے بیلچم سے ہوئے۔ قیمت صرف ایک ڈالرنوے سینٹ فی پاؤند اور کانگو کے مزدوروں کو کہا گیا کہ یہ "اتحادیوں کی سیکیورٹی" کا معاملہ ہے۔ جن مزدوروں نے زیادہ اجرت مانگی انہیں جنگلوں میں جلاوطن کر دیا گیا۔

ایسی فضا میں Patrice Lumumba اسمنے آئے۔ ایک عام پوسٹ آفس کلر ک جس نے 1958 میں "مومنٹ نیشنل کانگولیز" قائم کی۔ جنوری 1959 میں لمبشو کے جلسے پر پولیس نے فاتر نگ کی اور سینتا لیس لوگ مارے گئے۔ لمبا جیل گیا لیکن اس گرفتاری نے اسے ہیر و بنا دیا۔ جون 1960 میں آزادی کا دن آیا۔ کنگ با ڈوتن کے سامنے لمبا نے تقریر کی جس میں کہا "ہم اب تمہارے بند نہیں ہیں۔ یہی تقریر ان کے قتل کی وجہ بن گئی۔ بیلچم کے وزیر خارج نے اسی رات ہدایت دی کہ یہ شخص خطرناک ہے کارروائی ضروری ہے"۔

پانچ جولائی 1960 کو کانگو کی فوج نے بغاوت کر دی۔ بیلچم نے فوری یہ روز پر ز اتارے تاکہ کانگو کے سب سے قیمتی حصے کتنا کا پر قبضہ رکھا جاسکے۔ کتنا کی آزادی کا اعلان بھی کروادیا گیا۔ پیڑیں لمبا نے اقوام متحده سے مدد مانگی لیکن امن فوج کو بیلچم کے فوجیوں کو نکالنے کا اختیار نہیں دیا گیا۔ اسی وقت سی آئی اے کا چیف لارنس ڈیولن کانگو پہنچا جس کا مشن لمبا کا خاتمه تھا۔ امریکی صدر آئزن ہاور نے خفیہ میٹنگ میں کہا "اس آدمی سے نجات حاصل کرو"۔ لمبا کو گرفتار کیا گیا اور سترہ جنوری 1961 کو

کتنگا لے جا کر بیلچم کے فوجیوں کے ہاتھوں قتل کر دیا گیا۔ لاش تیزاب میں گھلادی کئی اور صرف ایک دانت ٹرانی کے طور پر رکھا گیا۔

قتل کے بعد کانگو میں جو کچھ ہوا وہ زیادہ خطرناک تھا۔ سی آئی اے نے فوجی افسر موبوتو کو پیسے دے کر آگے بڑھایا۔ موبوتو نے تنخہ الٹ کر اقتدار پر قبضہ کیا۔ اگلے تیس سالوں تک کانگو کے یورپیں، تابنے اور کوبالٹ کے معابدے امریکی کمپنیوں اور بیلچم کی کارپوریشنز کے ساتھ بندھ رہے ہیں۔ کانگو کی دولت بیرون ملک بہتی رہی اور عوام کے حصے میں غربت آئی۔ موبوتو نے محلات بنائے، عیش و عشرت میں زندگی بتائی اور امریکہ و یورپ کی کمپنیوں نے اربوں کمائے۔

آج بھی کہانی بدی نہیں۔ دنیا کے ستر فیصد سے زیادہ کوبالٹ، جو بجلی سے چلنے والی گاڑیوں، موبائل فونز اور بیٹریز کے لیے ضروری ہے، اسی کانگو سے نکلتا ہے۔ کانگو کے مزدور دو ڈالر روزانہ پر کام کرتے ہیں جبکہ امریکی اور سوئس کمپنیاں اربوں کماٹی ہیں۔

پیڑیں لمبا کا قتل نہیں آزاد افریقی ریاستوں کو وارنگ تھی کہ آزادی کا یہ مطلب نہیں کہ تم ہماری مرضی کے بغیر فصلے کرو۔۔۔ آج جو تابنے اور کوبالٹ ہماری گاڑیوں اور فونز میں استعمال ہوتا ہے وہ لمبا کی سرزین سے نکلتا ہے۔

-----فائل AF-01 کا اختتام-----

ملک: جنوبی افریقہ

سال: 1962

فائل: AF-02

پانچ اگست 1962 کی صبح، نیلسن منڈیلا کی گاڑی ڈربن اور جہان سبرگ کے درمیان ایک سڑک پر روکی گئی۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ وہ محفوظ ہیں، مگر ان کی گرفتاری کا راز برسوں بعد کھلا۔ انہیں پکڑوانے کا اشارہ کسی عام مخبر نے نہیں بلکہ امریکی سی آئی اے نے دیا تھا۔ امریکی پریٹوریا اسٹیشن چیف پال ایکل نے خود اعتراف کیا کہ "ہم نے بتایا تھا کہ منڈیلا کہاں ہوں گے، میل کے پتہ تک۔ ہمارا مقصد سادہ تھا، وہ کمیونسٹوں سے مل رہے تھے، ہم انہیں راستے سے ہٹانا چاہتے تھے۔" یہ ایک ایسا لمحہ تھا جس نے جنوبی افریقہ کی تاریخ بدل دی اور ہمیں بتا دیا کہ سرجنگ میں انسانی آزادی کتنی آسانی سے سودے پر لگائی جا سکتی ہے۔

پس منظر سمجھنا ضروری ہے۔ ہیر و شیما پر گرنے والا پہلا ایٹھم بم کانگو کے شنکو لوبوے مائن کے یورینیم سے بنا تھا۔ مگر 1950 تک کانگو کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا اور امریکی نظر جنوبی افریقہ کے رینڈ گولڈ ریفس اور نمیبیا کے یورینیم بیلش پر جنم گئی۔ امریکہ نے ستمبر 1950 میں جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت کے ساتھ خفیہ معابدہ کیا کہ مغربی ریفس مائن کی ساری یورینیم پیداوار امریکہ خریدے گا، دنیا کی قیمت سے دگنی قیمت پر۔ شرط صرف یہ تھی کہ ماسکو کو ایک دانہ بھی نہ پیچا جائے۔ اسی معابدے نے سی آئی اے اور جنوبی افریقہ کی خفیہ ایجنسیوں کو برسوں کی شرکت داری میں باندھ دیا۔

منڈیلا 1961 میں جب انکھوں والے سیزوے کے نام سے مسلح جو جہد شروع کرتے ہیں تو وہ افریقہ کے مختلف ملکوں سے فنڈر اور تربیت لینے نکلتے ہیں۔ ایتحادیہ کے ہیلا سیلاسی سے پانچ بزار پاؤند لیتے ہیں، الجزائر میں ایف ایل این کے انسر کڑز سے پلاسٹک بم بنانا سیکھتے ہیں۔ لیکن واپسی پر وہ جاں میں پھنس جاتے ہیں۔ ان کی گرفتاری سے نکلنے والے کاغذات بعد میں ان کے خلاف مشہور ریوانیا مقدمے کا حصہ بنتے ہیں۔ 1964 میں انہیں روبن آئی لینڈ پر عمر قید کی سزا دے دی جاتی ہے۔ سی آئی اے کی

داخلی رپورٹ خوشی سے لکھتی ہے کہ "منڈیلا اور سسلوو کی غیر موجودگی کم از کم 1968 تک اے این سی کی صلاحیت مفلوج رکھے گی۔"

لیکن کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی۔ ستر کی دہائی میں سی آئی اے نہ صرف اے این سی کے خفیہ کیپوں کا سکنل انٹیلی جس فراہم کیا بلکہ انگولا اور زابیا میں ان کے ٹھکانوں پر جنوبی افریقہ کے فضائی حملوں میں بھی مددی، جن میں سینکڑوں کارکن مارے گئے۔ جب 1975 میں انگولا میں کیوبا کے فوجی داخل ہوئے تو امریکہ نے جنوبی افریقہ کے ساتھ مل کر یونیتا اور ایف این ایل اے کو کروڑوں ڈالرز کی خفیہ امدادی۔ سی آئی اے کا آئی اے فچر پروگرام براہ راست پریشوریا کے فوجی ہیڈ کوارٹر سے چلا یا جاتا تھا۔ امریکی یوٹو طیارے جنوبی افریقہ کے اڈوں سے پرواز کرتے اور سیٹلائز تصاویر شیئر ہوتیں۔ اس دوران انسانی حقوق کی باتیں محض کاغذی رہ گئیں۔ واشنگٹن میں فیصلہ ہو چکا تھا کہ سردار جنگ جیتنے کے لیے نسلی امتیاز کی حکومت کو سہارا دینا پڑے گا۔

اسی پالیسی نے بعد میں "کنسٹیٹیو انجمنٹ" یعنی بظاہر امن لیکن حقیقت میں خفیہ انسداد بغاوت پروگرام کو جنم دیا۔ 1980 کی دہائی میں سی آئی اے نے ایک ہزار سے زیادہ جنوبی افریقی انٹیلی جس افسران کو تربیت دی۔ "پسیو آپریشنز" یعنی جعلی آپریشنز کے نام پر ایسے دستے تیار کیے گئے جو آزادی کے کارکن بن کر قتل و غارت کرتے تاکہ عوامی تحریک کو بدنام کیا جاسکے۔ اس پالیسی کے تحت "تھرڈ فورس" منصوبہ شروع ہوا۔ 1985 سے 1993 کے درمیان چار ہزار سے زیادہ افراد ان آپریشنز میں مارے گئے۔ بوپا ٹونگ قتل عام، جہاں 46 افراد کو ایک ہی رات میں مار دیا گیا، انہی جعلی آپریشنز کا حصہ تھا۔ بعد میں سچائی کمیشن نے انکشاف کیا کہ سی آئی اے کے تربیت یافتہ افسران براہ راست اس منصوبہ بندی میں شامل تھے۔

سنہ 1990 میں منڈیلا کی رہائی ہوئی تو وہ ایک فائل کے ساتھ باہر آئے، جس میں 127 کارکنوں کی فہرست تھی جنہیں سی آئی اے کی فراہم کردہ معلومات پر مارا گیا تھا۔ یہ فائل انہوں نے امریکی سفیر کو دی مگر کبھی جواب نہیں ملا۔ جنوبی افریقہ کو جمہوریت ملی لیکن ایک ایسا سکیورٹی ڈھانچہ ورنے میں ملا جو جعلی آپریشنز اور خفیہ مداخلت کے لیے بنایا گیا تھا۔ ملک کی معیشت بھی ویسی ہی رہی، جس کا رخ ہمیشہ یروپی و سانچل کی ضرورتوں کی طرف موڑا گیا۔

آج کہانی کا دائرہ پھر وہیں آکھڑا ہوا ہے۔ جنوبی افریقہ اب بھی دنیا کے سب سے بڑے یمنیز اور پلائیم ڈخانر رکھتا ہے، جو امریکی دفاعی صنعت کے لیے "اہم وسائل" قرار دیے گئے ہیں۔ جب 2022 میں صدر راما فوسا وائٹ ہاؤس پہنچے تو ان کے ساتھ بڑی کان کنی کمپنیوں کے سی ای اوز تھے۔ آج بھی وسائل کے نقشے پر لکیریں وہی ہیں، کھلاڑی وہی ہیں، بس زبان بدل گئی ہے۔

فرق صرف یہ ہے کہ اب کھیل کے نام پر "سپلانی چین سکیورٹی" لکھا ہے۔

ذرا سوچتے آج نیلسن منڈیلا کیا ہیں؟ انکی حیثیت افریقہ کے باشندوں کیلئے تو ہے ہی وہ جمہوریت اور آزادی پسندوں کیلئے کیا حیثیت رکھتے ہیں؟ نیلسن منڈیلا کو ایک اپارٹھایڈ رجیم نے دہشتگرد قرار دے کر عمر قید کی سزا سنائی تھی۔ منڈیلا نے بمب بنانا سیکھا تھا اور مسلح جدو جہد میں حصہ لیا تھا۔ اور آج وہ جدو جہد، امن اور آزادی کا استعارہ بن چکے ہیں۔

-----فائل AF-02 کا اختتام-----

ملک: ٹوگو

سال: 1963

فائل: AF-03

تیرہ جنوری 1963 کی رات، صدر سلوانس او لیپیو نگے پاؤں امریکی قونصل خانے کی طرف بھاگ رہے تھے، مگر گیٹ بند تھے۔ دیوار کے ساتھ گھیر کر انہیں گولیوں سے مار دیا گیا۔ بعد میں قاتل نے فرانسیسی صحافیوں سے کہا "میں نے پہلا فائز کیا، میں نے فرانس کی وفاداری میں اپنا فرض نبھایا۔" اس ایک لمحے نے صرف ٹوگو نہیں، بلکہ پورے مغربی افریقہ کی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ پہلے آپ کو پس منظر بتاتا ہوں۔ ٹوگو، گھانا اور بنین کےچھ ایک چھوٹا سا ملک، محض چھپن کلو میٹر ساحل مگر فرانس کے لیے انتہائی قیمتی۔ جرمن ٹولکینڈ کے ٹوارے کے بعد فرانس نے فاسفیٹ کی پہاڑیاں، ریلوے اور ایوے قوم کے ساحلی علاقے اپنے لئے رکھ لیے تھے۔ آزادی سے پہلے فرانس نے اس زمین کو ٹیکس ہیون بنایا تھا۔ گھانا کا کوکو (COCOA) لومے کی بندگاہ سے فرانس کے نام پر یورپ جاتا اور تیس فیصد کم ٹیرف پر فروخت ہوتا۔ فاسفیٹ کی کانوں سے فرانس کی کھاد کی ضرورتیں پوری ہوتیں، مگر مقامی لوگوں کے حصے میں صرف غربت آتی تھی۔ سنہ 1960 میں فرانس کے لیے ٹوگو کی آزادی اور ان معابدوں کو توڑنا ایک ڈراونا خواب تھا۔

اسی ماحول میں سلوانس او لیپیو ابھرے۔ لندن اسکول آف اکنامیکس کے پڑھ، کوکو کے عالمی سودے پر عبور رکھنے والے، اور فرانس کے معاشی استعمال کو اچھی طرح سمجھنے والے۔ انہوں نے آزادی کا نعرہ لگایا اور کامیاب ہونے۔ ستائیں اپریل 1960 کو ٹوگو آزاد ہوا، مگر آزادی کے دن ہی فرانس نے تین خوبی معابدے کروائیے۔ فوج میں فرانسیسی افسر، کرنٹی پر فرانسیسی کنٹرول، اور فاسفیٹ کی کانوں کا نانوے سالہ لیز برقرار۔ مگر او لیپیو نے خاموشی اختیار نہ کی۔ وہ تیزی سے ایک آزاد معیشت کی بنیاد رکھ رہے تھے۔ کسٹم ہاؤس کو قومی تحويل میں لیا، فاسفیٹ برآمدات پر چھپن فیصد نیا ٹیکس لگایا، امریکی اسٹینڈرڈ آنل سے بات شروع کی کہ فرانسیسی بندگاہ کے بجائے نیا ٹریننگ بنائیں۔ سب سے خطرناک قدم وہ تھا جب گھانا کے صدر نکرو مہ کے ساتھ

ٹوگو اور گھانا کے انضمام پر بات کی تاکہ دنیا کی چالیس فیصد کو مارکیٹ پر کنٹرول قائم کیا جائے۔ پیرس میں خطرے کی گھنٹی جو چکلی تھی۔ فرانسیسی وزیر خارجہ نے لکھا "او لیپیو ٹوگو کو دوسرا گھانا بنانا چاہتا ہے، اس سے پہلے کچھ کرنا ہوگا۔"

بارود تیار تھا، صرف چنگاری کی ضرورت تھی۔ ٹوگو کی چھ سو نفری فوج میں تقریباً تمام افسر فرانسیسی تھے۔ انہی میں ایک نچلے درجے کا افسر ایٹین ایادیمہ بھی تھا جو انڈو چاتنا جنگ میں تمغہ لے کر آیا تھا۔ او لیپیو نے سابق فرانسیسی فوجیوں کو نئی فوج میں شامل کرنے سے انکار کر دیا، یہ بات فوج کے ایک دھڑے کو چھپنے کی وجہ سے بھی تھی۔ گیارہ جنوری 1963 کی رات میں سپاہی ایادیمہ کی قیادت میں صدارتی محل پہنچے۔ او لیپیو بھاگ کر امریکی قونصل خانے پہنچ مگر گیٹ بند تھے۔ دیوار کے ساتھ انہیں گولیوں سے بھون دیا گیا۔ فرانسیسی ایم بیسی نے پیرس کو کوڑ بھیجا "آپریشن کامیاب، او لیپیو ختم، نئی حکومت تعاون پر راضی ہے۔" اگلے دن فرانس کے حمایت یافتہ نکولس گرونٹن کی اقتدار دیا گیا، فاسفیٹ پر لگایا گیا ٹیکس ہٹا دیا گیا، اور فرانسیسی کمپنیوں کو نئے کانٹریکٹ مل گئے۔

اصل کھیل اب شروع ہوا۔ چار سال بعد ایادیمہ نے اپنے پرانے آقاوں کے اشارے پر خود تختہ الٹ دیا اور اگلے اڑتیس سال اقتدار پر قابض رہا۔ فرانسیسی صدور ایلیزے پیلس میں اسے گلے لگاتے رہے، فوجی معاهدے بڑھتے گئے، اور معیشت کا نل فرانس کے بینکوں کے ذریعے چلتا رہا۔ فاسفیٹ کی اربوں کی کمائی پیرس کے بینکوں میں گئی، جبکہ لوئے کے عام شہری غربت میں ڈوبتے رہے۔ ایوے قوم، جس سے او لیپیو کا تعلق تھا، سائیڈ لائن پر دھکیل دی گئی، روزگار ختم ہوا، اور ہزاروں لوگ پناہ گزین بن کر گھانا بھاگے۔ ہر احتجاج پر فرانسیسی تربیت یافتہ فوجی گولیاں چلاتے، ہر الیکشن فراؤ سے صیتے جاتے، اور ہر بغاوت کا خاتمہ ڈکار سے آنے والے فرانسیسی طیارے کرتے۔

ایادیمہ کی موت کے بعد اس کا بینا فاؤرے بغیر الیکشن کے صدر بنایا گیا۔ افریقی یونین نے شور مچایا، مگر پیرس نے فون پر "دوستانہ تعاون" کا یقین دلایا۔ آج بھی ٹوگو کا صدر وہی خاندان ہے، فاسفیٹ کا کنٹرول انہی پرانی فرانسیسی کمپنیوں کے پاس ہے، بند رکا ہیں بولوڑی گروپ کے قبضے میں ہیں، اور فرانسیسی فوجی دستے لوئے میں تعینات ہیں۔ آزادی کے ساتھ سال بعد بھی ملک کی تقدیر کے کاغذ پیرس میں لکھے جاتے ہیں۔

او لیپیو کے قتل نے صرف ایک صدر کو نہیں گرایا، یہ پورے افریقہ کے لیے ایک فارمولہ بن گیا۔ آج افریقہ کو آزاد قرار دیا جاتا ہے، مگر معیشت، فوج اور سیاست کی کنجی اب بھی پرانی سلطنت کے ہاتھ میں ہے۔ آج بھی جب کوئی یورپی لیڈر افریقہ کے ساتھ "شرکت داری" کی بات کرتا ہے تو لوگوں کی دیوار کے پاس گرنے والے او لیپیو کی روح سرگوشی کرتی ہے کہ "یہ جھوٹ ہے"۔

-----فائل AF-03 کا اختتام-----

ملک: الجزائر

سال: 1965

فائل: AF-04

انیں جون 1965 کی رات تھی۔ کرنل طاہر زیری سیدھا احمد بن بیلا کے کمرے میں داخل ہوا، جو اس وقت لا جولی میں اپنے بیڈ رومن میں سورہ تھے۔ انہوں نے نیند میں ڈوبے صدر سے کہا کہ آپ کو غداری کے الزام میں گرفتار کیا جاتا ہے۔ تین گھنٹے بعد الجزائر کی ساری سیاست بدل چکی تھی۔ یہ سب ایک اچانک بغاؤت نہیں تھی بلکہ پورا ایک سال فرانس کی خفیہ ایجنسیاں اس کی پلانگ کر رہی تھیں۔ کھلیل الجزائر میں کھیلا جا رہا تھا مگر چالیس ییرس سے چالائی جا رہی تھیں۔

اسکے پچھے کیا کہانی تھی پہلے اسے دیکھتے ہیں۔ پانچ جولائی 1962 کو الجزائر نے آزادی حاصل کی، لیکن آزادی صرف فرانس کا جھنڈا نیچے اتارنے تک محدود رہی۔ فرانسیسی کمپنیاں اب بھی صحرائے سو فیصد تیل اور گیس کے ذخائر پر قابض تھیں۔ پاپ لائز ٹوٹل کمپنی کے ہاتھ میں تھیں اور یہنک آف الجزائر کی لین دین اب بھی ییرس کے ذریعے ہوتی تھی۔ احمد بن بیلا، جو آزادی کے ہیرو تھے، فرانس کے اثر سے نکلا چاہتے تھے۔ انہوں نے گنی کے صدر سیکو توڑی کو بلا کر افریقہ کے اتحاد کی بات شروع کر دی۔ ساتھ ہی ایک عوامی ملیشیا بھی بنائی جسے براہ راست اپنے ماتحت کر لیا، جبکہ پرانی آرمی کے جزء بومین کو سائیڈ لائن کر دیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب فرانس نے فیصلہ کیا کہ بن بیلا کو ہٹانا ہے۔

فرانسیسی خفیہ ادارہ ایس ڈی ای سی ای پہلے دن سے بومین کے ساتھ رابطہ میں تھا۔ مارچ 1963 میں بومین فوجی وفد کے ساتھ ییرس گئے، جہاں پر ایک خفیہ ڈنر میں فرانسیسی جنرلز نے صاف بیان دیا کہ فوج کو سیاست سے الگ رکھنا ہو گا اور اگر فوج حرکت میں آئے گی تو فرانس رکاوٹ نہیں ڈالے گا۔ اگلے دو سال میں فرانسیسی خفیہ ادارے نے بومین کو ہڑوہ اطلاع دی جو بن بیلا کے خلاف فائدہ مند ہو سکتی تھی۔ ان میں سے ایک سب سے اہم اطلاع یہ تھی کہ بن بیلا انیں جون 1965 کو پارٹی کا گلری میں

بلا رہے ہیں جس میں پرانی فوجی قیادت کو فارغ کرنے کا اعلان ہونا تھا۔ یہ بومدین کے لیے آخری وارنگ تھی۔ یا تو حکومت کرو یا سب کچھ کھو دو۔

پندرہ جون کو پیرس میں ڈیگال نے بند کرے کا اجلاس بلایا اور بومدین کے آپریشن کو اخلاقی حمایت دینے کا فیصلہ کیا۔ پیرس کی بندگاہ سے بلکہ بندگاڑیاں، اسلحہ اور ایم اے ۴۹ سب مشین گزرا الجزائر کے لیے روانہ ہوئیں۔ یہ سب کچھ جعلی کاغذات پر ہوا تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ فرانس کا پیغام واضح تھا کہ اگر بغاوت کامیاب ہو جائے تو الجزائر کے تیل کے معاهدے محفوظ رہیں گے۔ امریکہ کو اطلاع دے دی گئی، مگر وہ ویتنام کی جنگ میں پھنسا ہوا تھا، اس لیے واشنگٹن نے بھی خاموش حمایت دی۔

انیس جون کی رات ایک بجے فوجی ٹینک ریڈیو الجزائر کے سامنے پہنچ گئے۔ صحیح تین بجے احمد بن بیلا کو گرفتار کر کے سہارا کے صحرائیں نظر بند کر دیا گیا۔ بومدین نے ریڈیو پر خطاب کیا کہ انقلاب نے اپنی سمت درست کر لی ہے۔ فرانسیسی اخبارات پہلے ہی تیار بیٹھے تھے۔ اگلے دن سرخیاں لگیں کہ یہ الجزائر کو بچانے والا آپریشن تھا۔ بومدین نے صدر بنتے ہی تیل کے معاهدے منسوخ کرنے کے بن بیلا کے فیصلے کو روک دیا اور فرانس کے ساتھ مشترکہ کمپنی قائم کر دی۔ اگلے سال ایل ایف ایکوویٹین کے ساتھ چار سو ملین ڈالر کا معاهدہ ہوا۔ فرانس خوش تھا اور الجزائر کی فوجی قیادت مطمئن۔

اس بغاوت کے اثرات طویل المدى تھے۔ بومدین کے دور میں الجزائر کا انقلابی افریقی ایجنڈا ختم ہو گیا اور فرانس کا اثر قائم رہا۔ لیکن وقت کے ساتھ حالات پلٹنے۔ یہی فوج جو فرانس کے تعاون سے مضبوط ہوئی تھی، 1971 میں تیل کی مکمل نیشنلائزیشن تک پہنچ گئی۔ فرانس نے اس پر بھی سمجھوتہ کیا کیونکہ الجزائر نے سپلائی کے معاهدے برقرار رکھے۔ یہ کھیل بالکل واضح تھا۔ پہلے بغاوت کرو، پھر سمجھوتہ کرو۔ یہی فارمولہ بعد میں آئیوری کو سٹ، مالی اور برکینا فاسو میں دہرا گیا۔

آج بھی الجزائر کی سیاست میں فوج سب سے بڑی طاقت ہے۔ ہر صدر فوجی پس منظر سے آتا ہے اور خفیہ ادارے اب بھی فرانسیسی ہم منصبوں کے ساتھ رابطے میں ہیں۔ سنہ 2022 میں موجودہ صدر بون پیرس گنے تو میکرون کے ساتھ آرک دی تریومف پر پھول چڑھائے۔ احمد بن بیلا کے زمانے میں یہ ناقابلِ تصور تھا۔ 19 جون 1965 کی بغاوت الجزائر کی تاریخ کا فیصلہ کن موڑ تھی۔ فرانس آج تک الجزائر پر کنٹرول رکھتا ہے۔ جو کچھ اس رات ہوا، اس کی گونج آج تک سنائی دیتی ہے۔

ملک: گھانا

سال: 1966

فائل: AF-05

چونیس فوری 1966 کی رات دو بجے اکر اکی بجلی اچانک بند ہوئی۔ صرف ہینتا لیں منٹ کے لیے۔ اس دوران باغی فوجی یونٹس نے ریڈیو اسٹیشن، ایئر پورٹ اور صدارتی محل پر قبضہ کر لیا۔ اسے آپریشن "کولڈ چاپ" کہا جاتا ہے۔ صدر کوامی نکرو مہ اس وقت گھانا میں نہیں تھے۔ وہ ویتنام جنگ کے خاتمے کی کوششوں کے سلسلے میں ہنوانی جا رہے تھے۔ انہیں پتا بھی نہ چلا کہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا خواب اور ان کی حکومت ایک ساتھ ٹوٹ چکے ہیں۔

پہلے آپ کو پس منظر بتاتا ہوں۔ سنہ 1957 میں گھانا برطانیہ سے آزاد ہوا۔ یہ پہلا افریقی ملک تھا جس نے نوآبادیاتی زنجیر توڑی۔ اس وقت گھانا کے پاس کو کو کی عالمی پیداوار کا چالیس فیصد، اعلیٰ معیار کے بیس فیصد بوسائیٹ کے ذخائر اور ولٹا دریا کا ایسا پانی تھا جو صدی بھر کے لیے بجلی فراہم کر سکتا تھا۔ صدر نکرو مہ کا خواب تھا کہ گھانا نہ صرف خود کفیل ہو بلکہ پورے افریقہ کو صنعتی طاقت میں بدل دے۔ انہوں نے اگو سو مبوڈیم بنانے کا منصوبہ بنایا، ہزار میگاوات بجلی پیدا کرنے والا ڈیم، جس سے ایلو مینیم کی سیلینگ ممکن ہوتی۔ لیکن انکے خواب بکھر گئے اور گھانا سردار جنگ کا میدان بن گیا۔

امریکہ اور برطانیہ نے دیکھا کہ اگر گھانا غیر جانبدار رہایا سو ویت یونین کے قریب ہو گیا تو پورا مغربی افریقہ ہاتھ سے نکل سکتا ہے۔ اسی لیے امریکہ نے فیصلہ کیا کہ ولٹاپرو جیکٹ پر قبضہ کرنا ہے تاکہ نکرو مہ پر اثر برقرار رکھا جاسکے۔ ورلڈ یونک، امریکی کیسر ایلو مینیم کمپنی اور دیگر اداروں نے قرضے دیے، مگر ساتھ ہی دباؤ بڑھتا گیا۔ اصل کھیل 1964 سے شروع ہوا۔ آئی ایف نے گھانا سے کہا کہ کرنی کی قدر کم کرو اور قیمتیوں پر حکومتی کنٹرول ختم کرو۔ نکرو مہ نے انکار کر دیا۔ کیسر ایلو مینیم نے اسی دوران ڈیم کی تعمیر کے لیے اپنے ادائیگی کے شیڈوں کو سست کر دیا۔ امریکہ کے اندر سی آئی اے نے خفیہ منصوبہ تیار کیا جس کا مقصد تھا نکرو مہ کی حکومت کو معاشی دباؤ اور نفسیاتی مہم کے ذریعے کمزور کرنا، فوجی قیادت کے ساتھ رابطہ بنانا اور حالات کو بغاوت کے لیے تیار

کرنا۔ سنہ 1965 میں گھانا میں بم دھماکے ہوئے، ہٹا لیں ہوئیں، تنخواہیں گریں اور مہنگائی بڑھی۔ نکرومد کے خلاف سازشیں تیزتر ہوتی گئیں، فوج ان سازشوں کے پیچے تھی۔ نئے ہتھیار صدر کی ملیشیا کو دیے گئے کیونکہ فوج پرانے مالاکان کی ابھی تک وفاداری کر رہی تھی۔ فوج کا کردار ہی بعد میں فیصلہ کن ثابت ہوا۔ اکیس فروری 1966 کو نکرومد ویتنام کے امن مشن پر روانہ ہوئے تو سی آئی اے کو موقع مل گیا۔ منصوبہ ط تحاکہ صدر کے ملک سے باہر ہوتے ہی سب کچھ الٹ دینا ہے۔ چویس فروری کی رات بجلی بند ہوئی، باغی فوج نے اکراپر قبضہ کر لیا، صدارتی محافظوں نے ڈیڑھ گھنٹے مذاہمت کی لیکن آرمڈ راکٹ لاچر استعمال ہوئے جو گھانا کی فوج کے پاس نہیں تھے۔ صح سائز ہے چھ بجے جنرل کو توکاریڈیو پر آئے اور اعلان کیا کہ نکرومد کا ٹلسٹ ٹوٹ چکا ہے۔ دو گھنٹے بعد نئی فوجی حکومت نے کوکوبورڈ کے تمام اکاؤنٹس منجمد کر دیے۔ کیسر ایلو مینیم نے فوراً تین ملین ڈالر کی بقاوار رقم ادا کر دی اور منصوبہ دوبارہ شروع ہو گیا۔

اس بغاوت کے اثرات صرف گھانا تک محدود نہیں رہے۔ نکرومد کا افریقہ بھر میں آزادی کی تحریکوں کو سپورٹ کرنے کا خواب ٹوٹ گیا۔ الجزائر، تزانیہ اور دیگر ملکوں میں تربیت پانے والے ان کے گوریلا واپس بلا لیے گئے۔ افریقی اتحاد کا نعرہ دم توڑ گیا۔ گھانا آئی ایم ایف کے نئے پروگرام میں داخل ہو گیا، کرنی کی قیمت کم ہوئی، بجلی اور ایلو مینیم کا کنٹرول امریکی کمپنیوں کے پاس چلا گیا اور مغربی امداد اور مداخلت کا دروازہ کھل گیا۔ واشنگٹن نے نئی فوجی حکومت کا خیر مقدم کیا اور اربوں کی امداد کا وعدہ کیا۔ اس کہانی کا سب سے دلچسپ پہلو یہ ہے کہ نکرومد کا خواب تیل یا سونے کا نہیں بلکہ صنعتی طاقت کا تھا، مگر انہی معدنی وسائل نے انہیں مغربی سامر اج کا ٹارگٹ بنایا۔ آج ساٹھ سال بعد بھی گھانا کا ایلو مینیم امریکی کمپنیوں کو جاتا ہے، لیکن اب چین کی آمد سے گھانا کیلئے ایک امید کی کرن بیدا ہوئی ہے۔

سچ یہ ہے کہ جس دن نکرومد نے ولٹا ڈیم کا خواب دیکھا، اسی دن عالمی طاقتوں نے فیصلہ کر لیا کہ گھانا اپنی شرائط پر ترقی نہیں کر سکتا۔ افریقہ کے لیے سبق آج بھی تازہ ہے کہ انکے عوام کی غلامی تواب ممکن نہیں مگر انکی معدنیات پر آج بھی مغربی سامر اجی طاقتوں کی رال ٹپکتی ہے۔ طاقت کے کھیل میں، سوچ اب بھی واشنگٹن کے ہاتھ میں ہے۔

ملک: مالی

سال: 1968-2012

فائل: AF-06

انیں نومبر 1968 کی رات کو مالی کے بانی صدر مودیبو کیتابیرون ملک دورے سے واپس آرہے تھے، جب باما کو کی سڑکوں پر بکتر بند گاڑیاں خاموشی سے پوزیشنیں لے رہی تھیں۔ صدارتی محل، ریڈیو اسٹیشن اور ناجر پربنے دونوں پل فوجی کنٹرول میں آچکے تھے۔ اسی دوران صدر کی کار سگو کے قریب روک لی گئی۔ چند ہی گھنٹوں میں ملک کے بانی صدر کو گرفتار کر کے کائی کی یہ رکوں میں ڈال دیا گیا اور ریڈیو پر اعلان ہوا کہ سو شلسٹ جمہوریہ کو معطل کر دیا گیا ہے۔

پس منظر یہ ہے کہ 1960 میں آزادی کے بعد مالی ایک دشوار راستے پر نکلا تھا۔ سمندر سے کٹا ہوا یہ ملک صرف ریلوے لائن کے ذریعے انجان کی بندگاہ پر انحصار کرتا تھا۔ کیتا نے فیصلہ کیا کہ وہ فرانسیسی کرنی زون کو چھوڑ کر اپنی کرنی متعارف کرانے گا اور کسانوں کی اجتناس ریاست خریدے گی۔ انڈسٹریلائزشن کا منصوبہ بنایا گیا۔ لیکن فرانس کے عدم تعاون اور سازشوں کی وجہ سے مہنگائی آسمان کو چھوڑنے لگی، ٹریکٹر ریل کے ڈبوں میں پڑے پڑے زنگ آؤد ہوتے رہے، تاخواں دینا مشکل ہو گیا اور لوگوں کو کھانے کے لالے پڑ گئے۔ حوصلے بلند تھے لیکن پیٹ خالی تھے۔

کیتا نے اس معاشی بحران کو روکنے کے لئے مزید سو شلسٹ ریفارمز کیں۔ فریچ ماسٹرز کی باقیات کو ختم کیا۔ لیکن فرانس کی سازشوں بھی تیز تر ہوتی چلی گئیں۔ لوگ پھر بھی پر جوش تھے کہ سو شلسٹ ریفارمز کو کامیاب کروائیں گے۔ فرانس نے فوج کے اندر سازشیں شروع کروادیں۔ پیسے کی قدر ختم ہو رہی تھی۔ پھر یہ فیصلہ آیا کہ افران کو اب وہی راشن دیا جائے گا جو سپاہیوں کو ملتا ہے۔ ایک کیپٹن کی اصل آمنی آدھی ہو گئی جسکو بہانہ بننا کر بغاوت کروادی گئی۔

لیٹنینٹ موسیٰ تراورے اور اس کے ساتھیوں نے خاموشی سے منصوبہ بنایا۔ جب کیتابیرون ملک دورے پر تھے تو انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ اب دیر نہیں کرنی۔ 19 نومبر کی رات "کائی کیپ" کے دروازے بند کر دیے گئے، وزیر دفاع اور چیف آف

اسٹاف کو گرفتار کر لیا گیا، ریڈیو بند کر دیا گیا اور صحیح ہوتے ہی اعلان کیا گیا کہ پرانی حکومت ختم ہو گئی ہے۔ کیتا نے گزارش کی کہ اسے عوام سے خطاب کرنے دیا جائے لیکن باغی جانتے تھے کہ ان کی تصریر عوام کو متأثر کر سکتی ہے اس لئے اجازت نہ دی گئی۔ چند گھنٹوں میں مالی کاپورا منظر بدل گیا۔

اس تبدیلی کے نتائج بڑے گھرے تھے۔ اگلے تیس برس ملک پر فوجی حکومت قائم رہی۔ شروعات میں دعویٰ کیا گیا کہ اب معیشت بہتر بنائی جائے گی۔ کرنسی کو مسجد کیا گیا، دوبارہ فرانسیسی ماہرین بلاۓ گئے اور عالمی یونک کی اصلاحات کو قبول کیا گیا۔ لیکن اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کبھی خشک سالی نے لوگوں کو مارا، کبھی قیمتوں نے۔ 1980 تک ملک کی فنی کس آمدنی آزادی کے وقت سے بھی کم ہو چکی تھی۔ کرپشن کھلے عام کاروبار بن گئی۔ کسانوں کا کپاس کا کریڈٹ، سعودی کھاد اور خوراک کی امداد تک سب دلالوں کی جیب میں جا پہنچے۔

مغربی طاقتوں نے اس واقعے سے سیکھ کر پورے افریقہ میں اس طریقہ کار کو استعمال کیا۔ سبق یہ تھا کہ فوجیں بڑے سے بڑے انقلاب کو ٹھنڈا کر سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگلے چند سالوں میں کتنی ممالک میں ایسی ہی بغاوتیں ہوتیں۔ کیتا جو افریقہ میں وقار اور آزادی کی علامت تھا، ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں نظر انداز کر دیا گیا اور بالآخر 1977 میں وہیں انتقال کر گیا۔

مالی دوبارہ فرانس کے زیر اثر آگیا، کیتا کی جدوجہد اور عوام کی قربانیاں ضلع ہو گئیں۔ فرانس کے ساتھ دوبارہ تعلقات، سی ایف اے فرانک زون میں واپسی اور قومی کرنسی کی موت سے عوام کی برسوں کی قربانی ایک ہی لمحے میں ضلع ہو گئی۔ لوگ کہتے تھے کہ کیتا کی کرنسی ییشک کمزور تھی مگر وہ آزاد تھی۔

آج مالی ایک بار پھر فوجی حکومت کے زیر اثر ہے مگر اس باریہ انقلاب فرانس کے خلاف ہے۔ 1968 میں بغاوت اس لئے ہوئی کہ ملک کو سو شلسٹ تجربے سے نکال کر اپنا اثر دوبارہ بحال کیا جائے۔ 2020 کی بغاوت میں فرانسیسی اثر سے نکلا مقصد ہے۔ سوال آج بھی وہی ہے کہ مالی اپنے سونے، کپاس اور ہیومن ریسورس کو کس طرح خوشحالی میں بدل سکتا ہے۔

ملک: گنی

سال: 1970

فائل: AF-07

ایکس نومبر 1970 کی رات کوناکری کے ساحل کی طرف دو بڑے بھری جہاز آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے۔ ان پر تین سو پچاس حملہ اور سوار تھے، جن میں آدھے افریقی کرانے کے قاتل اور آدھے پر تگالی فوجی تھے۔ انہوں نے اپنے چہروں پر کونے اور گریں لگا رکھی تھی۔ ان کے آرڈرز صاف اور مختصر تھے، صدر احمد سکوٹورے کو قتل یا گرفتار کرو، گنی بساو کی آزادی کی تحریک کے ہمیڈ کو اڑپر قبضہ کرو، پر تگالی قیدی چھڑاؤ اور صحیح ہونے سے پہلے واپس نکل جاؤ۔ یہ پورے نوآبادیاتی دور میں واحد موقع تھا کہ یورپ کی کوئی طاقت ایک آزاد افریقی دارالحکومت پر براہ راست فوجی حملہ کر رہی تھی۔

پس منظیریہ تھا کہ سکوٹورے نے 1958 میں جزل ڈیگال کی پیشکش مسترد کر کے گنی کو آزاد کروالیا تھا۔ اس کے جواب میں فرانس نے غصے میں آکر ملک کی سڑکوں سے بجلی کے بلب تک اکھاڑ دیے۔ گنی تنہا ہو گیا لیکن ٹورے نے اسے ایک موقع سمجھ کر اپنی سر زمین کو افریقی آزادی کی تحریکوں کا مرکز بنایا۔ انہی تحریکوں میں سے ایک امیلکار کبرال کی قیادت میں گنی بساو اور کیپ وردے کی آزادی کی تحریک تھی۔ کبرال نے کوناکری کو بیس بنا کر پر تگالی سلطنت کو ہلا کر رکھ دیا۔ چند ہی سالوں میں پر تگالی گنی کے گاؤں اور قصبے اس تحریک کے کنٹرول میں آگئے، اسکوں اور ٹیکس کا نظام بھی انہوں نے سنبھال لیا۔ پر تگال پہلے ہی انگولا اور موزیمیق میں لڑ رہا تھا، اب سب سے چھوٹی کالونی سب سے مہنگی جنگ بن گئی۔

یہی وہ دباؤ تھا جس نے پر تگال کو آپریشن مار وردے پر مجبور کیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ کوناکری پر رات کے اندر ہیرے میں حملہ کر کے صدر ٹورے کو اغوا کر لیا جائے، تحریک آزادی کو ختم کر دیا جائے اور ایک کٹھپتی حکومت قائم کر دی جائے۔ تیاری بہت خفیہ تھی۔ امریکی سی آئی اے نے نقشے اور تصویریں فراہم کیں، باغی گنیانی رہنماؤں کو وزارتوں کا لاج دیا گیا اور پر تگالی میرینز کو آخری لمحے پر یہ بتایا گیا کہ یہ بس ایک رات کا کام ہے۔

حملہ ٹھیک تین بجے کے قریب شروع ہوا۔ مختلف ٹیمیں بیک وقت چھ مقامات پر پہنچیں: صدارتی محل، تحریک آزادی کا ہیڈکوارٹر، جیل، بھریہ کا یارڈ، ریڈیو اسٹیشن اور ائرپورٹ۔ جیل کے دروازے دھماکے سے اڑا دیے گئے اور دو سو اکسٹھ پر تگالی قیدی آزاد ہو گئے۔ بھری جہاز جلنے لگے، ائرپورٹ پر دھماکے ہوئے، لیکن اصل مقصد ہاتھ سے نکل گیا۔ صدر ٹورے کو بروقت اطلاع مل گئی اور وہ اپنے دوست نکروما کے گھر پہنچ گئے جہاں کیوبن باڈی گارڈز پہرہ دے رہے تھے۔ کبرال تو یورپ میں ہی تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ نیا چینی ٹرانسیمیٹر مسلسل ریڈیو پر اعلان کر رہا تھا کہ عوام باہر نکلیں اور دشمن کو سمندر میں دھکیل دیں۔

کوناکری کی گلیوں میں عورتیں دیکھیاں بجا رہی تھیں، ٹیکسی ڈرائیور اپنی گاڑیاں پارک کر کے سڑکیں بند کر رہے تھے اور عوامی ملیشیا تیزی سے جمع ہو رہی تھی۔ پر تگالی دستے جو قیدیوں کو لے کر واپس نکلنا چاہتے تھے، جگہ جگہ گھات میں پھنس گئے۔ ایک پلٹن تو میڈینا مارکیٹ کی گلیوں میں گھٹشوں لڑتی رہی۔ آخر کار انہیں جہازوں کی طرف بھاگنا پڑا۔ واپسی اتنی بد نظمی کا شکار تھی کہ کئی لوگ سمندر میں پھنسے رہ گئے اور ایک جہاز کو کھینچ کر نکالنا پڑا۔ صحیح آٹھ بجے تک آخری پر تگالی بھی ساحل چھوڑ چکا تھا۔ لیکن اصل جھٹکا بعد میں آیا۔ اس ناکام حملے کے چند ہی گھٹشوں میں اقوام متحده کی سلامتی کو نسل کا اجلاس بلا لیا گیا۔ سو ویت یونین نے فوری طور پر ہتھیار اور فوجی امداد بھیجی، ایک تباہ کن جہاز چھ ماہ تک کوناکری کی بندرگاہ میں کھڑا رہا۔ سکو ٹورے نے اسے اپنی فتح قرار دیا اور پورے افریقہ میں اس کی عزت کئی گناہ بڑھ گئی۔ نتیجیہ نکلا کہ پر تگال کے خلاف جنگ میں تحریک آزادی کو بہلے سے زیادہ اسلحہ، پیسے اور عالمی حمایت ملی۔

درجنوں خدار وزراء اور اہم شخصیات کو سازش کرنے پر سخت ترین سزا میں دی گئیں۔ تحریک آزادی کا جوش اور بڑھ گیا۔ چند ہی میہنون میں پر تگالی ہیلی کا پڑیکے بعد دیگرے مار گراتے گئے اور بالآخر گنی بساو 1973 میں آزاد ہو گیا۔ وہ آزادی جو شاید کئی سال بعد آتی، آپریشن مار وردے کی ناکامی نے جلدی دلا دی۔

دنیا میں یہ حملہ ایک سبق بن گیا۔ نیٹو نے پر تگال سے فاصلہ اختیار کیا، امریکی کانگریس نے خفیہ آپریشنز پر سوال اٹھاتے اور افریقی ملکوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ صرف مکمل خود منصاری ہی آزادی کی ضمانت دے سکتی ہے۔

آج پچاس برس بعد بھی اس رات کے اثرات محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ رو سی جہاز اب بھی مغربی افریقہ میں نظر آتے ہیں، کونا کری کی بندرگاہ کو آج چینی کمپنیاں جدید بنارہی ہیں، اور پرانے ہیڈکوارٹر کو میوزیم میں بدل دیا گیا ہے جہاں بچوں کو بتایا جاتا ہے کہ ایک قوم نے دیگھیاں بجا کر اپنی آزادی پھائی تھی۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ فوجی حکومتوں اور بغاوتوں کا سلسلہ اب تک نہیں رکا۔ مالی سے لے کر گنی تک، مغربی سامراج مسلسل سازشیں کر رہا ہے۔

اس کہانی کا نتیجہ مختلف نکلا تھا۔ ورنہ زیادہ تر امریکی اور یورپی سازشیں کامیاب ہوتی رہی ہیں۔ امریکہ اور یورپ نے ایسے سینکڑوں کام کئے ہیں۔

-----فائل AF-07 کا اختتام-----

ملک: ایتھو پیا

سال: 1974

فائل: AF-08

ایتھوپیا میں ہزار سالہ عیسائی ریاست چلی آرہی تھی۔ اس کے ارد گرد مسلمان ریاستیں تھیں۔ ایتھوپیا کی یہ عیسائی ریاست 1974 میں کیونسٹ انقلاب کی وجہ سے ختم ہوئی۔ ایتھوپیا کے بادشاہ ہیلی سیلاسی کو فوج نے حکومت سے ہٹا دیا۔ فوج کے افسران نے ملک کی باغ ڈور سنبحال لی۔ ان کے لیڈر کا نام ینگسٹو تھا۔

ینگسٹو کے سامنے دو ہڑے مسائل تھے۔ شمال میں اریٹریا کے لوگ الگ ملک بنانا چاہتے تھے۔ اور یگرے کے علاقے میں لوگ بہت غریب تھے اور بھوک سے مر رہے تھے اور تنگ آکر منے مارنے پر آمادہ تھے۔

اب یہاں پر امریکہ اور روس کی کشمکش شروع ہو گئی۔ پہلے امریکہ ایتھوپیا کی فوج کو مدد دیتا تھا۔ لیکن جب ینگسٹو آیا تو امریکہ نے مدد بند کر دی۔ اس موقع پر روس نے مدد کی پیشکش کی۔ روس نے ایتھوپیا کو امن قائم کرنے کیلئے جنگی جہاز، ہتھیار اور فوجی ماہرین بھی بھیجے۔

لیکن کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی۔ اسرائیل بھی اس معاملے میں شامل ہو گیا۔ اسرائیل نے ینگسٹو سے کہا کہ ہم تمہیں فوجی تربیت اور ہتھیار دیں گے، تم اپنے ملک کے یہودیوں کو یہاں سے نکلنے کی اجازت دو۔ ینگسٹو نے اس ڈیل کو مان لیا۔

اسرائیل کے فوجی ماہرین نے ایتھوپیا کی فوج کو جدید جنگ لڑنے کے طریقے سکھانے۔ انہوں نے خاص فورسز کو تربیت دی۔ امریکہ بھی خفیہ طور پر اسرائیل کے ذریعے ایتھوپیا کو ہتھیار بھیجتا رہا۔

جنگ نے ایتھوپیا کو تباہ کر دیا۔ تقریباً 12 لاکھ لوگ مارے گئے۔ لاکھوں لوگ بے گھر ہوئے۔ قحط نے ہزاروں زندگیاں نگل لیں۔ فوج نے خوراک کے قافلوں پر بھی حملہ کیے۔

سنہ 1991 میں روس خود کمزور ہو گیا تو اس نے ایتھوپیا کو مدد و متنی بند کر دی۔ امریکہ نے موقع دیکھا اور اس نے یونگسٹو کے مخالفین کی مدد شروع کر دی۔ آخر کار یونگسٹو ملک چھوڑ کر بھاگ گیا۔

اس جنگ کے بہت برے اثرات آج تک نظر آتے ہیں۔ اریٹریا الگ ملک بنا لیکن وہاں بھی مسائل ہیں۔ تیگرے کے علاقے میں حال ہی میں ایک اور جنگ ہوئی ہے۔ زمین میں آج بھی وہ بارودی سرنگلیں بچھی ہیں جو جنگ کے زمانے میں بچھائی گئی تھیں۔

-----فائل AF-08 کا اختتام-----

ملک: انگولا

سال: 1975

فائل: AF-09

گیارہ نومبر 1975 کی رات کو لوآندا کی سڑکوں پر مارٹر کے گولے گر رہے تھے اور ہر طرف دھماکوں کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ یہ وہ لمحہ تھا جب پرتگال کے ساتھ ہے چار سو سالہ قبضے کے بعد انگولا پہلی بار آزاد ہوا تھا۔ لیکن آزادی کے ساتھ ہی تین طاقتور گروہ تخت کے لیے ایک دوسرے پر چڑھ دوڑے۔ اسٹینو نیتو کی ایم پی ایل اے، ہولڈن رابرٹو کی ایف این ایل اے اور جوناس ساویمبی کی یونیتا۔ یوں آزادی کا جشن چند ہی ہفتوں میں خانہ جنگی میں بدل گیا۔

پس منظیر یہ تھا کہ اپریل 1974 میں پرتگال کی فاشست حکومت کا تختہ الٹ گیا اور اچانک اس کی نوابادیاتی گرفت ٹوٹ گئی۔ انگولا میں طاقت ایکدم بکھر گئی۔ ایم پی ایل اے نے خود کو واحد وارث قرار دیا مگر دوسرے دھڑوں نے یہ ماننے سے انکار کر دیا۔ اسی کشمکش میں امریکہ نے خفیہ طور پر مختلف گروپوں کو پیسہ اور ہتھیار دینے شروع کر دیے۔

سی آئی اے نے جنوری 1975 ہی میں ہولڈن رابرٹو کو لاکھوں ڈالر تھما دیے کہ کسی طرح ایم پی ایل اے کو لوآندا سے باہر رکھا جائے۔ مگر جب ایف این ایل اے پسپا ہوئی تو امریکہ نے رخ موڑ کر ساویمبی کی یونیتا کو گلے لگایا۔ یہ آپریشن آئی اے فیچر کہلایا۔ پیسہ زائر کے راستے پہنچایا گیا، اسلحہ چیکو سلو اکیہ، اسرائیل اور جنوبی افریقہ سے آیا۔ پھر جب کانگریس کو پتہ چلا تو کلارک ترمیم نے سب کچھ روک دیا۔ لیکن ساویمبی کے لیے یہ نک بد لانا مستلزم تھا۔ جنوبی افریقہ کے جرنیل اسے چاہتے تھے، سعودی عرب نے پیسے دیے اور یونیتا ٹیزی سے پھیل گئی۔

سنہ 1981 میں ریگن صدر بنا تو ساویمبی وائٹ ہاؤس پہنچ گیا۔ اسے ہیروزو یلکم دیا گیا، جیسے افغان مجاہدین کو دیا گیا تھا۔ 1985 میں کلارک ترمیم شوخ ہوئی اور امریکی اسلحہ براہ راست جنگلوں تک پہنچا۔ اسٹنگر میزائل، ناٹ وژن، جدید رائفلز، سب کچھ۔

واشنگٹن کے لیے یہ سستا سودا تھا۔ لیکن انگولا کے عوام کو اسکی بھاری قیمت چکانا پڑی۔ لاکھوں لوگ بے گھر ہوئے، ہزاروں مارے گئے۔

جنگ کا رخ 1987 میں کوتٹو کو انوالے پر بدلا۔ ساویمبی اور جنوبی افریقہ نے شہر کو گھیرنے کی کوشش کی مگر فیڈل کاسترو نے پندرہ ہزار فوجی اور میگ طیارے بھیجے۔ افریقہ کی سب سے بڑی روایتی جنگ میں کیوبا نے محاصرہ توڑ دیا۔ جنوبی افریقہ پسپا ہوا اور یوں مذکرات کا راستہ کھلا۔ سنہ 1988 کے نیویارک معابدوں کے تحت نمیبیا کو آزادی ملی اور انگولا میں انتخابات طے ہوئے۔ سنہ 1992 میں الیکشن ہوئے۔ ایمپی ایل اے جیت گئی مگر ساویمبی نے نتیجہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور دوبارہ جنگ چھیڑ دی۔ اس بار امریکہ نے یسمری نہیں دکھائی جس کی وجہ سے یونینتا نے ہیرے نیچ کر اسلحہ خریدا۔ یہ وہی بلڈڈا ٹائمز نے جن پر ہالی وڈ نے فلمیں بھی بنائیں۔ ملک کی دولت اسلحہ پر لٹتی رہی جبکہ بچے بھوک اور بیماری سے مر رہے تھے۔

آخر کار 2002 میں ساویمبی جنگل میں مارا گیا اور یونینتا نے ہتھیار ڈال دیے۔ ستائیں سالہ اس جنگ نے پانچ لاکھ زندگیاں نگلیں، چار ملین لوگ بے گھر ہوئے اور ہزاروں لینڈ مائیز کے باعث ہاتھ پاؤں کھو یہی۔ ریلوے تباہ، کھیت اجڑ گئے اور نسلیں بر باد ہوئیں۔ لیکن اس جنگ کے اثرات صرف انگولا تک محدود نہیں رہے۔ جنوبی افریقہ کے ساتھ امریکہ کی خفیہ شراکت نے وہاں کی نسلی حکومت کے خلاف عالمی دباؤ تیز کر دیا۔ کیوبا کے فوجی واپس جا کر پورے برا عظم میں یکجہتی کا پیغام بنے۔ اور یونینتا کے ہیروں نے دنیا کو مجبور کیا کہ ہیروں کی تجارت پر پہلی بار اخلاقی سوال اٹھایا جائے۔ یہی وہ لمحہ تھا جب بلڈڈا ٹائمز کی اصطلاح دنیا میں داخل ہوئی۔

آج انگولا میں وہی ایمپی ایل اے حکومت کر رہی ہے جسے کبھی امریکہ ختم کرنا چاہتا تھا۔ یونینتا اب اپوزیشن پارٹی ہے۔ ملک کے پاس تیل اور ہیروں کی دولت ہے مگر آج بھی چالیس فیصد عوام دو ڈالر روزانہ سے کم پر جی رہے ہیں۔ چین نے پہلی بار انگولا میں حقیقی ترقی کی کوشش شروع کی ہے جس پر امریکہ پریشان ہے اور چین اور انگولا کے تعلقات ختم کروانے کی کوشش کر رہا ہے۔

ملک: کوموروں

سال: 1975

فائل: AF-10

---

ملک کو آزاد ہوئے ابھی صرف ایک مہینہ ہوا تھا اور ایک نوجوان لیفٹینٹ نے صرف ایک پستول کے ساتھ صدر کے محل پر دھاوا بول دیا۔ یہ کوتی فلم کا سین نہیں بلکہ یہ سب 6 جولائی 1975 کی رات کوموروں میں ہوا تھا۔ جب فرانس کا پرچم اتراتونے صدر احمد عبدالله نے سمجھا آزادی مل گئی ہے لیکن صرف ایک ماہ بعد علی صوالح نام کے ایک نوجوان نے محل پر قبضہ کر کے انہیں ملک سے نکال دیا۔

کوموروں جزیرے افریقہ کے ساحل پر واقع ہیں جہاں سے دنیا کا تیل گزرتا ہے۔ فرانس اس علاقے پر اپنی اجارہ داری چاہتا تھا اور امریکہ اپنا کنٹرول بنانے پر کام کر رہا تھا۔ لیکن عام کوموری شہری صرف اپنے لوگ کے کھیتوں اور اچھی زندگی کے خواب دیکھ رہے تھے۔

اس سارے ہنگامے میں فرانس نے ایک جرائم پیشہ بدنام زمانہ شخص جس کا نام تھا باب دینار تھا اسے کوموروں پر قبضے کیلئے تیار کیا۔ یہ ایک فرانسیسی پیشہ و رسم پاہی تھا۔ اس نے اگست 1975 میں صرف بارہ آدمیوں کے ساتھ محل پر قبضہ کر لیا۔ وہ ٹینس کے سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے اور مخالفوں کو بیٹر پلا کر انہیں بے وقوف بنادیا۔ صحیح ہوتے ہوئے ملک کی باگ ڈور ایک بار پھر بدل چکی تھی۔

دینار نے اسلام قبول کر لیا اور یہاں کی ایک لڑکی سے شادی کر لی۔ پرانے صدر کو واپس لا لایا گیا اور وہ خود صدر کے محافظ دستے کا کمانڈر بن گیا اور پورے ملک کی معیشت پر قابض ہو گیا۔ اس نے ایک ہوٹل بنایا جو درحقیقت فرانس اور نیٹو کے جاسوسوں کا اڈہ تھا۔

امریکہ یہاں سے سوویت یونین کے جہازوں پر نظر رکھتا تھا۔ امریکہ نے 1983 میں ایک ٹینکیل ٹیم بھیجی جس نے کومروس کے مرکزی بنک کی عمارت پر ایک اینٹنا لگادیا۔ یہ اینٹنا آسٹریلیا تک معلومات بھیجتا تھا۔ امریکہ نے دینار کو جدید ہتھیار اور سیٹلائیٹ تصاویر دین تاکہ وہ ملک کو کنٹرول کر سکے۔

نومبر 1989 میں صدر عبداللہ نے دینار کے اختیارات کو کم کرنے کی کوشش کی۔ اگلی صبح صدر کو گولی مار دی گئی۔ فرانس نے فوراً فوج بھیجی اور دینار کو گرفتار کر لیا لیکن اسے سزا نہیں ہوئی۔ وہ فرست کلاس میں کوئیاک پیتا ہوا فرانس پہنچا۔

سنہ 1995 میں سانحہ سال کی عمر میں دینار ایک بار پھر کومروس واپس آیا۔ اس نے تیس بوڑھے سپاہیوں کے ساتھ ملک پر قبضہ کر لیا۔ لیکن اس بار فرانس نے فوراً کارروائی کی اور اسے گرفتار کر لیا۔ اسے صرف ساڑھے تین سال کی علامتی سزا ہوئی۔

آج بھی کومروس پر دینار کے اثرات ہیں۔ مایوٹ نامی جزیرہ اب بھی فرانس کے قبضے میں ہے جس پر فرانس نے اخوب انوسمٹنٹ کی ہوئی ہے۔ کومروس کے لوگ آج بھی معاشی بدخلی کا شکار ہیں۔ ہزاروں لوگ کشتیوں میں بیٹھ کر مایوٹ پہنچنے کی کوشش میں ڈوب جاتے ہیں۔ ملک کی معیشت کا چالیس فیصد بیرمنی امداد پر ہے۔

-----فائل 10-AF کا اختتام-----

ملک: بیانین

سال: 1977

فائل: AF-11

جنوری 1977 کی ایک صبح، ایک جہاز بینن کے ایک چھوٹے ہوائی اڈے پر لینڈ کرتا ہے۔ اس میں سے فرانس کے تیس فوجی سوار تھے جن کا مقصد بینن کی مارکسٹ حکومت کو گرانا تھا۔ ان کے پاس فرانس کے بنائے ہوئے ہتھیار تھے اور امریکہ کے بنائے ہوئے جدید ریڈیو سیٹ تھے۔ لیکن تین گھنٹے بعد یہ حملہ ناکام ہو گیا۔ ہوائی اڈے پر خون سے لت پت کاغذات، ایک کھانی اور امریکی امداد کے ڈبے پڑے تھے۔ یہ ایک مختصر مگر شدید جنگ تھی، سرد جنگ کا ایک اہم باب۔

بینن ایک چھوٹا سا افریقی ملک تھا جو پہلے فرانس کا غلام رہ چکا تھا۔ 1972 میں کرنل کیریکو نے اقتدار سنبھالا اور ملک کا نام ڈاہومی سے بدل کر بینن رکھا۔ انہوں نے فرانسیسی مفادات کو بہت نقصان پہنچایا، ہسپتا لوں میں کیوبن ڈاکٹر بھرتی کیے۔ ان کی دیکھادیکھی پڑوسی ممالک میں بھی سو شلسٹ نظریات پھیلنے لگے۔ فرانس کو ظاہر ہے کہ یہ بات پسند نہیں آتی۔

فرانس نے ایک مشہور کروائی کے قاتل باب دینار کو ذمہ داری دی کہ وہ حکومت کو تختہ لٹائے۔ اس نے تیس فوجوں کی ایک ٹیم بنائی۔ امریکی سی آئی اے نے بھی مدد فراہم کی۔ حملے کا منصوبہ یہ تھا کہ ہوائی اڈے پر اتر کر دارالحکومت کو ٹوٹو پر قبضہ کریں، صدر کو گرفتار کریں، اور ایک نئی حکومت قائم کریں۔

صحیح سات بجے وہ ہوائی اڈے پر اترے۔ انہوں نے ہوائی اڈے کا کنٹرول سنبھالا اور ٹیکسیوں میں بیٹھ کر صدر کے محل کی طرف نکلے۔ لیکن شمالی کوریا کے فوجی انسٹرکٹر جو وہاں موجود تھے، انہوں نے پہلے ہی آواز سن لی تھی۔ انہوں نے دو بلتربند گاڑیوں کے ساتھ سڑک روک لی اور ٹیکسیوں پر فائزرنگ شروع کر دی۔

اس لڑائی میں ڈینارڈ کا ریڈیو آپریٹر مارا گیا جس کے پاس امریکی ریڈیو سیٹ تھا۔ بغیر رابطے کے تمام فوجی بکھر گئے۔ وہ ریڈیو اسٹیشن تک پہنچے تو وہاں نوجوانوں کی ملیشیا نے ان کا راستہ روک لیا۔ صرف تین گھنٹے بعد ڈینارڈ کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ وہ اپنے دو مردہ فوجی اور قیمتی سامان چھوڑ کر بھاگ نکلا۔

اس ناکام حملے کے بہت اہم نتائج نکلے۔ بینن میں کیریکو نے اس واقعے کو اپنی طاقت بڑھانے کے لیے استعمال کیا۔ انہوں نے اس دن کو قومی دن قرار دیا اور ایک بڑا یادگار ڈینار بنوایا۔ انہوں نے اپنے مخالفین کو نکال باہر کیا اور ملک پر مکمل کنٹرول حاصل کر لیا۔

فرانس کی طاقت کم ضرور ہوئی لیکن ختم نہیں ہوتی۔ انہوں نے فوجی مدد کی بجائے مالی امداد کے ذریعے اثر ڈالنا شروع کیا۔ یہی تبدیلی بعد میں بینن کو جمہوری بنانے میں مددگار ثابت ہوئی۔ بینن 1990 میں مغربی افریقہ کا پہلا ملک بننا جہاں کثیر الجماعتی جمہوریت قائم ہوئی۔

آج بھی بینن کے ساحل پر پرانی گولیاں مل جاتی ہیں۔ لوگ اس جیت کی یادگار کی تصویریں بناتے ہیں۔ بینن کی کہانی ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ چھوٹے ممالک بھی اپنی آزادی کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ کیریکو کی حکومت گرنے سے بچ گئی اور آخر کار بینن جمہوری ملک بننا۔

-----فائل AF-11 کا اختتام-----

ملک: زیمبیا

سال: 1979

فائل: AF-12

جو لائی 1979 کی ایک رات، رہوڈیشیا کے کمانڈوز زیمبیا کی سرحد پار کر کے دارالحکومت لوساکا کے ایک پر سکون مضاقافتی علاقے میں داخل ہوئے۔ ان کا نشانہ افریقی نیشنل کانگریس کے وہ کارکن تھے جو جنوبی افریقہ میں کارروائی کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ اس رات کے واقعے کے پچھے امریکی سی آئی اے کا ہاتھ تھا جو رہوڈیشیا کو جدید ترین نقشے اور سینٹلاتیٹ تصاویر فراہم کر رہا تھا۔ رہوڈیشیا کی جنگ اب ایک علاقائی جنگ بن چکی تھی۔ زیمبیا کے صدر کینٹھ کوندانے اے این سی کو لوساکا میں رہنے کی اجازت دے رکھی تھی بشرطیکہ وہ بھاری ہتھیار نہ رکھیں۔ جنوبی افریقہ چاہتا تھا کہ اے این سی کے منصوبوں کو ناکام بنایا جائے لیکن وہ یہ کام براہ راست اپنے فوجیوں سے نہیں کروانا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے رہوڈیشیا سے مدد مانگی۔ امریکہ نے "تکنیکی مدد" فراہم کی۔

سی آئی اے نے رہوڈیشیا کو لوساکا کے تفصیلی نقشے دیے جن پر اے این سی کے سیف ہاؤسز سرخ نشان سے واضح کیے گئے تھے۔ ان نقشوں پر پچاس میٹر کے گرد بنتے ہوئے تھے تاکہ کمانڈوز شہر کی بے نام گلیوں میں آسانی سے راستہ تلاش کر سکیں۔ سی آئی اے نے جدید ریڈیو سیٹ بھی دیے جن پر انکریپٹڈ بات چیت ہو سکتی تھی۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ سینٹلاتیٹ سے لی گئی انفار اریڈ تصاویر بھی دی گئیں جن سے یہ پتہ چل سکتا تھا کہ کون سے گھروں میں رات کے وقت زیادہ لوگ موجود ہیں۔ تیرہ جولائی کی رات کو رہوڈیشیا کے چارہ بیلی کا پڑر زیمبیا کی سرحد پار کر کے لوساکا پہنچے۔ باہمیں کمانڈوز نے دو گروپوں میں تقسیم ہو کر اے این سی کے ٹھکانوں کو نشانہ بنایا۔ وہ امریکی بنائے ہوئے نقشوں اور ریڈیو سیٹس کا استعمال کر رہے تھے۔ صرف چھبیس منٹ کی کارروائی میں پانچ اے این سی کارکن مارے گئے۔ کمانڈوز واپس جاتے وقت اپنا کچھ سامان چھوڑ گئے جس سے پتہ چلا کہ یہ ریڈیو سیٹ اور میٹریاں امریکی فوج کے لیے بنائی گئی تھیں۔

اس ایک رات کے چھلے کے بہت دور رس نتائج نکلے۔ اے این سی نے لو سا کا چھوڑ کر اپنے دفاتر انگولا اور اتحادیا منتقل کر دیے جس سے ان کی سپلائی لائن دو ہزار کلو میٹر لمبی ہو گئی۔ زیمیا نے مغربی مالک پر شک کرنا شروع کر دیا اور سوویت یونین سے دفاعی سامان خریدنا شروع کیا۔ رہوڈیشیا کو فوری فائدہ ہوا اور جنوبی افریقہ کو اے این سی کے خفیہ کوڈر مل گئے۔

اس واقعے نے ایک نیا طریقہ کار متعارف کرایا۔ امریکہ سیٹلائٹ تصاویر اور جدید موافقانی سامان فراہم کرتا، جنوبی افریقہ حکمت عملی بناتا، اور رہوڈیشیا عملی کارروائی کرتا۔ یہی فارمولہ بعد میں موزیق، بوئوسانا اور ہرارے میں اے این سی کے خلاف استعمال ہوا۔ ایک چھوٹی سی رات کی کارروائی نے خلیے میں دبائیوں تک عدم اعتماد کی فضقا قائم کر دی۔

-----فائل 12-AF کا اختتام-----

ملک: نمپیا

سال: 1979

فائل: AF-13

---

سنہ 1979 میں جنوبی افریقہ نے نمپیا کی جنگ آزادی کو کچلنے کیلئے ایک دہشتگرد فورس تیار کی جس کا نام "کویفوت" رکھا۔ اس یونٹ کو عام پولیس یا فوجی یونٹ نہیں کہا جا سکتا، بلکہ یہ ایک ایسی مشین تھی جو صرف خونریزی کے لئے بنائی گئی تھی۔ اس دہشتگرد فورس نے صرف چند سالوں کے اندر پورے شمالی نمپیا کو خون میں نہلا دیا۔

پس منظر یہ ہے کہ نمپیا بھر من کالونی تھا جس پر پہلی جنگ عظیم میں جنوبی افریقہ نے قبضے کر لیا تھا۔ نمپیا کے لوگوں نے آزادی کیلئے جدوجہد شروع کر دی۔ اس جدوجہد کی قیادت "سو اپو" نامی تنظیم نے کی جس نے 1966 میں مسلح جدوجہد کا آغاز کیا۔ ان کے گوریلا دستے انگولا سے سرحد پار آ کر لڑائی کرتے تھے۔ جنوبی افریقہ کی حکومت نے سواپو کی جدوجہد کو کچلنے کیلئے اس دہشتگردی کا آغاز کیا۔

کویفوت کا مطلب ہے وہ آکہ جو ہر چیز کو زبردستی کھوں دیتا ہے۔ یہ فورس اصل میں پولیس کے اندر رکھی گئی مگر کام فوج جیسا دیا گیا۔ اس کا سربراہ ہانس ڈرائز نامی افسر تھا جو پہلے رہوڈیشیا کی خفیہ فورسز میں رہ چکا تھا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ گوریلوں کا پیچھا کرو اور نشانات پکڑو، ان کا پیچھا کرو اور پوری طاقت سے ٹوٹ پڑو۔

کویفوت کے پاس کا سپیر نامی بلکرنڈ گاڑیاں تھیں۔ ان کے ساتھ مقامی لوگ بطور کھوجی چلائے جاتے تھے جو ریت پر قدموں کے نشان پڑھنے میں ماہر تھے۔ یہ ٹیکس کئی کئی دن پیچھا کر کے آخر کار گوریلا تک پہنچ جاتیں۔ پھر اتنی زبردست فائزگنگ ہوتی کہ بچنا ناممکن ہوتا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس دور میں اگر کوئی سواپو کا لڑاکا شمالی نمپیا میں داخل ہوتا تو اس کی او سط زندگی چھتیس گھنٹے سے زیادہ نہ ہوتی۔

یہ فورس صرف لڑائی تک محدود نہ تھی۔ اس نے باونٹی سسٹم بنایا ہوا تھا جس میں ہر ہلاک یا گرفتار بندے پر انعام ملتا تھا۔ اس وجہ سے ان کے جوان اپنی تنخواہ سے کتنی گنازیاہ کرتے تھے۔ لیکن اس نظام نے انہیں یحید ظالم اور کرپٹ بنادیا تھا۔ بہت کم لوگ گرفتار ہوتے، زیادہ تر مار دیے جاتے۔ عام دیہاتی بھی شک کی بنیاد پر قتل ہو جاتے اور ان کو بعد میں "گوریلا" لکھ دیا جاتا تاک انعام لیا جاسکے۔

ان کے ظلم کی کہانیاں آج بھی شمالی نمیبا کے لوگ سناتے ہیں۔ مائیٹ، ریپ، جلاؤ گھیراؤ، اور کبھی کبھی اجتماعی سزا میں، یہ سب کچھ اس حد تک تھا کہ لوگ ہر وقت خوف کے سامنے میں جلتے تھے۔ کویفوت کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ہزاروں لوگوں کو قتل کیا، سینکڑوں دیہات تباہ کئے، اور لاکھوں لوگ متاثر ہوئے۔

جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت کو اس وقت امریکہ اور مغرب کی خاموش حمایت حاصل تھی۔ ریگن انتظامیہ نے اس پالیسی کو "کنسٹرکٹو نیجمنٹ" کا نام دیا ہوا تھا اور اصل میں جنوبی افریقہ کو چھپ کر سہولیں دی گئی تھیں۔ سی آئی اے نے صرف اٹیلی جنس شیئر کی بلکہ ٹریننگ اور کمیونیکیشن ٹیکنالوجی بھی پہنچائی جس سے کویفوت جیسی دہشتگرد فورس کو بہت فائدہ ہوا۔

ظاہر ہے کہ ظلم ہمیشہ تو نہیں چل سکتا، سنہ 1989 کے آخر تک دنیا بھر سے دباؤ بڑھنے لگا۔ اقوام متحده نے قرارداد پاس کی کہ نمیبا کو آزادی ملنی چاہیے اور کویفوت کو ختم کرنا ہو گا۔ آخر کار 1989 ہی میں یونٹ باضابطہ طور پر توڑ دیا گیا۔ اس کے لگ بھگ سول سوارکار کو غیر مسلح کیا گیا مگر بجائے اس کے کہ انہیں سزا میں ملتیں ان میں سے اکثر یا تو جنوبی افریقہ کی دوسری فورس میں چل گئے یا پھر بھی فوجی کمپنیوں میں کام کرنے لگے۔

نمیبا کے لوگوں پر اس کا اثر بہت گہرا ہوا۔ جن لوگوں نے کویفوت میں کھوجی کے طور پر کام کیا وہ آزادی کے بعد اپنی کمیونٹی میں اجنبی ہو گئے۔ کچھ کو سزا ملی اور کچھ کو حکومت نے پشن دینے سے انکار کر دیا۔ آج بھی ان کا ذکر آتا ہے تو لوگ تھوڑے کرتے ہیں۔

کو یغوت کی کہانی ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ مغرب نے اپنے مفاد کیلنے نسل پرست حکومتوں کو بھی حمایت کی ہے اور دہشتگردی کو بھی پالا ہے نمیبا آخر کار آزاد ہوا اور سو اپ اقتدار میں آیا۔ لیکن وہ زخم اور خوف جو ایک دہائی تک لوگوں پر مسلط کیا گیا وہ کتنی نسلوں تک باقی رہا۔

-----فائل AF-13 کا اختتام-----

ملک: سی شیلز

سال: 1981

فائل: AF-14

پھیس نومبر 1981 کی شام ٹھیک ساری ہے پانچ بجے، افریقہ کے ایک چھوٹے سے ملک سی شیلز کے مہے انٹر نیشنل ائر پورٹ پر دھشتگردی کا انوکھا واقعہ یہش آیا تھا۔ ایئر انڈیا کے جہاز میں بیٹھے مسافروں نے اچانک فائرنگ کی آوازیں سنیں۔ چند لمحے پہلے تک 44 خوش مزاج سیاح، جو اپنے آپ کو "رگبی ٹور سٹش" کہہ رہے تھے، ہستے کھلتے بیٹری رہے تھے، اچانک اٹھے اور اسے کے نکال کر فائرنگ کرنے لگے۔ یہ کوئی تقریبی گروپ نہیں تھا، یہ دراصل ایک حملہ آور فوج تھی جو سی شیلز کی حکومت گرانے آئی تھی۔

بظاہر تو یہ جزیرہ صرف سیاحت کے لیے مشہور تھا، مگر حقیقت میں یہ بھرہند میں امریکی سازشوں کا ایک اہم ٹارگٹ بن چکا تھا۔ سنہ 1977 میں وزیر اعظم فرانس البرٹ رینی نے اقتدار سنبھالا تھا۔ رینی نے سوویت یونین، کیوبا اور مشرقی جermany سے تعلقات بنائے، جنوبی افریقہ کے جہازوں پر پابندی لگائی اور امریکہ کی سازشوں کا نشانہ بن گیا۔

سنہ 1981 میں جنوبی افریقہ کے خفیہ ادارے نے ایک منصوبہ بنایا جسے "آپریشن اینجلا" کہا گیا۔ اس منصوبے کا مقصد رینی کی حکومت کا تحفہ اللٹا تھا۔ اس کام کے لیے انہوں نے کرانے کے سپاہیوں کا سہارا لیا۔ کروائے کے قاتل کرنل مائیک ہورے، جو پہلے کانگو میں استعمال ہو چکا تھا، کویہ نہم سونپی گئی۔ پیسے سی آئے نے دیے، جو سوئس یونکوں کے ذریعے اس تک پہنچائے گئے تاکہ کوئی ثبوت نہ ملے۔

منصوبہ بہت سادہ مگر خطرناک تھا۔ پھاس سے زائد سفید فام سپاہی، جن میں کئی جنوبی افریقہ کے کمانڈوز بھی شامل تھے، "سیاحوں" کے بھیس میں پہنچیں گے۔ ان کے بیگوں میں کھیل کا سامان، رگبی کی شرٹس اور بیٹر کے ڈبے ہوں گے، مگر ان کے

نیچے ہتھیار چھپے ہوں گے۔ انہیں ائر پورٹ، ریڈیو اسٹیشن اور فوجی کمپ پر قبضہ کرنا تھا، حکومت کا تختہ اللٹا تھا اور اگلی صحیح ایک نئے صدر کا اعلان کر کے واپس اڑ جانا تھا۔

پہلا گروپ 23 نومبر کو پہنچ گیا۔ اصل ٹیم دو دن بعد آئی۔ سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا، مگر قسمت نے ایک چھوٹے کسٹم افسر کے ہاتھوں یہ پورا منصوبہ بر باد کر دیا۔ ایک افسر نے ایک مشکوک بیگ کھولا تو اس میں سے اے کے 47 کی نالی نکلی۔ حملہ آور گھبرا گیا، اس نے گولی چلانی، اور لمبیوں میں پورا ائر پورٹ میدان جنگ بن گیا۔

چھ گھنٹے تک گولیاں چلتی رہیں۔ ایک حملہ آور مارا گیا، ایک مقامی افسر بھی جان سے گیا۔ باقی کروائے کے قاتلوں نے ہوائی اڈے پر پھنسے 70 لوگوں کو یرغمال بنایا اور ائر انڈیا کے جہاز کو ہائی جیک کر کے ڈربن لے گئے۔ پانچ سپاہی وہیں گرفتار ہو گئے جن میں جنوبی افریقہ کی خفیہ ایجنسی کا افسر مارٹن ڈولنجیک بھی شامل تھا۔

جب یہ خبر پھیلی تو جنوبی افریقہ نے فوراً انکار کر دیا کہ اس کا کوئی تعلق نہیں۔ مگر چند ہفتوں بعد رینی کی حکومت کو تین ملین ڈالر ادا کیے گئے تاکہ وہ گرفتار سپاہیوں کو بہا کر دے۔ بعد میں خود جنوبی افریقی وزیر خارجہ نے یہ بات مان لی کہ رقم حکومت نے ہی دی تھی۔ سی آئی اے کے جنوبی افریقہ کی حکومت کے ساتھ قریبی تعلقات رہے ہیں اور یہ بات بار بار ثابت ہوئی ہے کہ سی آئی اے کے افریقہ میں تمام تر ڈرٹی ورک کا ساتھ جنوبی افریقہ کی کریمنل نسل پرست حکومت دیتی رہی ہے۔ جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت کا کردار سو فیصد ویسا ہی تھا جیسا آج اسرائیل کا ہے۔

یہ ناکام بغاوت اپنے مقاصد کے بالکل الٹ ثابت ہوئی۔ رینی نے اس دہشتگردی کے بعد دفاع کو بہتر بنایا۔ اس نے مشرقی بلاک کے ساتھ تعلقات مزید گھرے کر لیے۔ چند ماہ بعد کیوبا کے ڈاکٹر اور سوویت انھینہ سی شیلز پہنچ گئے۔ مغرب کی حمایت حاصل کرنے کی بجائے اب کھلم کھلا سوویت کمپ کا حصہ بن چکا تھا۔

امریکہ کے لیے یہ ایک بڑی خفت تھی۔ اس نے اس پورے واقعے کو دباؤنے کی کوشش کی اور مستقبل میں اپنی خفیہ سرگرمیاں دوسرے مالک کی طرف موڑ دیں۔ جنوبی افریقہ نے دوسرے افریقی مالک میں ڈرٹی ورک جاری رکھا۔ جس طرح مشرق وسطی میں اسرائیل کے ذریعے ایک سفید فام دہشتگرد، نسل پرست کالونی بنائی گئی تھی کہ علاقے کو کبھی پر امن نہ ہونے دے بالکل

ویسے ہی جنوبی افریقہ یہ کام برا عظیم افریقہ میں کرتا تھا۔ وہی نیٹ ورک، وہی سپاہی، وہی بینک اور وہی پیسہ، سب کچھ دوبارہ مختلف ناموں سے استعمال ہوتا ہے۔

یہ کہانی امریکہ اور اسکے اتحادیوں نے سرد جنگ کے دوران بار بار دہرانی تھی۔ جس میں چھوٹے مالک کو کبھی اپنے پیروں پر کھڑا ہی نہیں ہونے دیا گیا۔ صرف ایک کسمٹ افسر کی حاضر دماغی نے اس دن سی شیلز کو بچا لیا، ورنہ شاید آج وہ بھی افریقہ کے ان مالک میں شامل ہوتا جنہیں کرانے کے فوجیوں نے بتاہ کر دیا تھا۔

آج جب دنیا میں خفیہ آپریشن، جعلی این جی اوز، اور پر اکسی جنگوں کی بات ہوتی ہے تو مہے ایسپورٹ کی کہانی سے رہنمائی لی جا سکتی ہے۔

-----فائل 14-AF کا اختتام-----

ملک: یونڈا

سال: 1981

فائل: AF-15

سنہ 1981 کے آغاز میں یونڈا ہےنے کو تو ایک ریاست تھا مگر حقیقت میں ریاست کا ملہ بکھرا پڑا تھا۔ آٹھ سال کے عین دور نے ملک کو اجائز کر رکھ دیا تھا۔ تین لاکھ لوگ مارے جا چکے تھے، خزانہ خالی، سڑکیں ٹوٹی ہوئیں، اور بندوق بردار ہر چوک پر حکومت کر رہے تھے۔ جب ملٹن اوبوئی دوبارہ اقتدار میں آیا تو اس کے پاس نہ منظم فوج تھی نہ ہی فعال ریاست۔ ایسے میں ایک نوجوان یوری موسیوینی چھبیس سال تھیوں اور ستائیں بندوقوں کے ساتھ لویرو کے جنگلوں میں پہنچا اور اس نے ایک نقشہ ہاتھ میں لے کر ایک تی نیشنل سٹ تحریک کا آغاز کیا۔

ریگن حکومت چاہتی تھی کہ اوبوئی قائم رہے کیونکہ وہ آئی ایم ایف کو اپس بلا رہا تھا اور مغرب کی شرطیں ماننے کی بات کر رہا تھا۔ مگر واشنگٹن کے سفارت کار جانتے تھے کہ اگر حالات خراب رہے تو لیبیا یا سوویت یونین یونڈا میں گھس آئیں گے۔ موسیوینی چونکہ انگریزی بولنے والا، تعلیم یافتہ اور خود کو "قوم پرست" کہتا تھا، اس لیے امریکہ کے لیے وہ ایک قابل قبول متبادل بن گیا۔

جون 1981 میں امریکی سفارت خانے نے نیروی کے راستے سوڈانی انٹلی جس کے ہاتھوں ایک لاکھ ڈالر موسیوینی کے گروپ کو بھجوائے۔ بظاہر یہ رقم "پناہ گرینوں کی امداد" کے لیے تھی مگر حقیقت میں اس سے ایمنیشن خریدا گیا۔ اس منصوبے کو خفیہ طور پر OAKTREE کا نام دیا گیا۔ یہ وہی پیسہ تھا جس سے موسیوینی نے اتحوپیا کے افسروں سے سات اعشاریہ باسٹھ ملی یہڑکی گولیاں خریدیں اور اپنی پہلی بڑی جھڑپ جیتی۔

اگلے دو برسوں میں نیشنل ریز سٹنس آرمی نے چار ہزار جنگجو اکٹھے کر لیے۔ سی آئی اے کے جہازوں سے مل گئی فضائی تصاویر موسیوینی کو دی گئیں جن میں حکومتی فوجی کیپوں اور اسلحہ خانے کے نقشے موجود تھے۔ انہی نقشوں کی مدد سے اس نے جنوری

1983 میں ماسنڈی میں پر حملہ کیا اور چھ سو رائفلیں، تین بھاری اینٹی ائر کرافٹ گز اور ایک ایمبو لنس قبضے میں لی۔ اس کامیابی نے دیہات کے لوگوں کو یقین دلایا کہ یہ جنگ جیتی جا سکتی ہے۔

سنہ 1984 تک موسیوینی کے پاس وسطی یونڈا کافی علاقہ آگیا تھا۔ یہ وہی زرخیز خط تھا جہاں سے ملک کی قیمتی کافی پیدا ہوتی تھی۔ امریکہ کو ڈر تھا کہ اگر موسیوینی خود یہ کافی بچنے لگا تو مالی طور پر آزاد ہو جائے گا اور لپیا یا روس سے بھاری ہتھیار خریدے گا۔ اس خطرے سے بچنے کے لیے مارچ 1984 میں ایک خفیہ منصوبہ بنایا گیا جسے COFFEE SWAP کہا گیا۔ اس کے تحت موسیوینی کو اجازت ملی کہ وہ چار ہزار ڈن کافی کینیا کے ذریعے بیچے۔ چھ ملین ڈالر میں سے چالیس فیصد رقم اسے دی گئی تاکہ وہ اپنی جنگی ضرورتیں پوری کرے، باقی مخدوم رکھی گئی تاکہ وہ مکمل خود مختار نہ ہو۔ اس پیسے سے نیشنل ریز سٹنس آرمی نے طبی سامان، وائرلیس اور سپلائیز خریدیں۔

جولائی 1985 میں ابوٹے کے خلاف بغاوت ہوئی اور فوج لنگی اور اچھی گروپوں میں بٹ گئی۔ یہ وہ موقع تھا جس کا موسیوینی کو انتظار تھا۔ سی آئی اے نے جنوبی سوڈان سے آٹھ سو ایف این رائفلیں اور دو لاکھ گولیاں بھجوائیں۔ امریکہ نے کینیا کو اشارہ دیا کہ موسیوینی کے قافلوں کو روکنے کی ضرورت نہیں۔ یوں نومبر میں باغی فوجیں دارالحکومت کے قریب پہنچ گئیں۔ جنوری 1986 میں موسیوینی نے حملہ کیا۔ تین دن کی لڑائی میں حکومت گرفتگی اور موسیوینی صدر بن گیا۔

یہ ساری مدد کبھی سرکاری طور پر تسلیم نہیں کی گئی مگر اس کے اثرات بہت گہرے تھے۔ موسیوینی نے اقتدار میں آتے ہی لیپیائی فوجی مشیروں کو ملک سے نکالا، روس کے ساتھ بھری اڈے کا معابدہ منسوخ کیا، اور وہی آئی ایم ایف دوبارہ بلا لیا جسے ابوٹے نے نکال دیا تھا۔ واشنگٹن نے بغیر فوج اتارے، صرف چند ملین ڈالر سے یونڈا کو اپنے حلقے میں شامل کر لیا۔

داخلی طور پر اس خفیہ مدد نے موسیوینی کو ایک خود ساختہ "خود مختار رہنماء" بنادیا۔ چونکہ رقم اور اسلحہ براہ راست امریکہ سے نہیں بلکہ کینیا کے راستے آتے تھے، اس نے عوام کو یقین دلایا کہ اس کی تحریک مکمل طور پر مقامی ہے۔ یہی تاثر بعد میں اس کے آمرانہ نظام کا جواز بن گیا جو آج تک چل رہا ہے۔

آج جب چین افریقہ میں ترقی اور امید کا نیا پیغام لے کر ہے چاہے تو امریکہ ایک نئی سرد جنگ کی تیاری کر چکا ہے۔ پرانے یونڈا کے واقعات پھر دہراتے جانے لگے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اب خفیہ امداد کا نام "سکیورٹی پارٹنر شپ" ہے اور بندوقوں کے ساتھ اب ڈیٹا اور ٹیکنالوجی بھی دی جا رہی ہے۔ لیکن کھیل وہی ہے، صرف انداز بدلा ہے۔

-----**فال 15 AF کا اختتام**-----

ملک: زمبابوے

سال: 1982

فائل: AF-16

حوالی 1982 کی ایک سردرات تھی جب زمبابوے کے پہاڑی علاقے گور و پرجیٹ ایندھن کے دھوئیں کی تیز بوجھیل گئی۔ صبح کی روشنی میں جب لوگ جائے تو دیکھا کہ ان کا پورا فضائی بیڑا را کھبن چکا ہے۔ صرف تیس منٹ میں دس جنگلی طیارے پجھل کر ایلو میسینم کے ڈھیر بن گئے تھے۔ یہ حملہ کسی عام توڑ پھوڑ یا نسلی انتقام کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ ایک سوچا سمجھا، بین الاقوامی سطح پر جزا ہوا منصوبہ تھا جس کے دھاگے واشنگٹن، پریٹوریا اور ہرارے نک پھیلے ہوئے تھے۔

یہ کہانی اس وقت کی ہے جب زمبابوے ایک نیا ملک تھا۔ سن 1980 میں جب رہوڈیشیا آزادی کے بعد زمبابوے کے گھلایا، تو جنوبی افریقہ کی سفید فام حکومت کے لیے یہ ایک جھٹکا تھا۔ ان کے دروازے پر اب ایک سیاہ فام حکومت تھی جو ماسکو سے تعلقات بڑھا رہی تھی۔ اس دور میں سرد جنگ عروج پر تھی۔ امریکہ اور سوویت یونین افریقہ میں اثر و رسوخ کے لیے خاموش جنگ لڑ رہے تھے۔ جنوبی افریقہ، جو خود نسلی امتیاز کے نظام تلے چل رہا تھا، نہیں چاہتا تھا کہ اس کے شمال میں کوئی سو شلسٹ یا سوویت نواز حکومت مضبوط ہو۔

رابرت موگابے نے آزادی کے فوراً بعد سوویت یونین سے رابطہ کیا تاکہ برطانیہ کے پرانے ہتھیاروں کی جگہ نئے روسی ہتھیارے سکے۔ روسی فوجی مشیر ہرارے پہنچے۔ روسی ہیلی کاپٹر آئے جنہیں روسی پائلٹ زمبابوے کے وردی میں اڑاتے تھے۔ جنوبی افریقہ کے انٹیلی جنس ادارے شکاری کتوں کی طرح پر وقت کسی بھی خطرے کی بو سونگھنے کو تیار تھے۔ دوسری طرف امریکی سی آئی اے بھی صورتحال پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ ان کے پاس سیٹلائز تصاویر تھیں، ماسکو کے ساتھ زمبابوے کے رابطوں کے کوانٹ کے، مگر وہ ہرارے کو آگاہ کرنے کے بجائے یہ معلومات پریٹوریا کے ساتھ شیئر کر رہے تھے۔ مقصد واضح تھا کہ زمبابوے کو کمزور رکھا جائے تاکہ وہ جنوبی افریقہ کے لیے خطرہ نہ بن سکے۔

اسی منصوبے کے تحت "آپریشن ڈراما" شروع کیا گیا۔ اس کے چار اہداف طے ہوتے: گولہ بارود کے ڈپ، ایندھن کے ذخیرے، حکمران جماعت کے دفاتر، اور سب سے اہم زمبابوے کی فضائیہ۔ اگست 1981 میں ایک دھماکے نے انکوموبیر ک کوتباہ کر دیا۔ دسمبر میں ہمارے میں پارٹی ہیڈکوارٹر پر حملہ ہوا۔ اگست 1982 میں دارالحکومت کے قریب قومی اسلحہ ڈپوجل کر خاک ہو گیا۔ مگر اصل کاری ضرب اگلے ماہ لگی جب تھورنیل ایئر بیس کو نشانہ بنایا گیا۔

یہ کارروائی ایک نوجوان پائلٹ نیول ویر کے ذریعے ممکن ہوئی جو سابق رہوڈیشن اسپیشل فورس کا رکن تھا اور موگابے کی حکومت میں ترقی نہ ملنے پر دل برداشتہ ہو چکا تھا۔ وہ جنوبی افریقہ گیا، وہاں کے خفیہ اہلکاروں سے ملا، اور حملے کے لیے رضامندی ظاہر کی۔ امریکی سی آئی اے کی سیٹلائز ٹصاویر نے بتایا کہ کون سے طیارے قابل پرواز ہیں اور کون سے محض ڈیکوئے۔ جنوبی افریقہ نے ان تصاویر کی مدد سے تھورنیل میں کا ایک جعلی ماؤنٹ بنا�ا اور مکمل ریہر سل کی۔

پھر جولائی 1982 کی رات نیول ویر، گویرو میں ایک شادی کی تقریب میں شریک ہوا، رات ایک بجے چکے سے نکلا، اور دو خفیہ ایجنٹوں کے ساتھ میں کی باڑکاٹ کر اندر داخل ہوا۔ اس نے پہرے دار کو شراب ملی چانے پلا کر سلایا اور طیاروں کے انجنوں میں فاسفورس بم رکھ دیے۔ صحیح تین بجے وہ واپس جنوبی افریقہ جا چکا تھا اور تھوڑی دیر بعد زمبابوے کی فضائی طاقت شعلوں میں بدل چکی تھی۔

موگابے کا پہلا رد عمل شدید تھا۔ اس نے نوراً تمام سفید فام افسران کو گرفتار کروادیا۔ برطانیہ اور امریکہ نے احتجاج کیا۔ جب عدالت نے ان افسروں کو بری کیا تو موگابے نے انہیں دوبارہ حراست میں لے لیا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب زمبابوے اور مغرب کے درمیان اعتماد ہمیشہ کے لیے ٹوٹ گیا۔

فوہی لحاظ سے یہ حملہ تباہ کن تھا۔ زمبابوے کے پاس اپنے فضائی دفاع کے لیے کچھ نہیں بچا۔ اس کے بعد موگابے نے ماسکو سے مکمل اتحاد کر لیا۔ سنہ 1985 میں فوہی امداد کا معابدہ ہوا۔ رومنی انسٹرکٹرز ہمارے میں کورس پڑھانے لگے۔ سوویت قرض سے نیا ریڈار سسٹم نصب ہوا۔ مگر اندون ملک صورتحال بگڑ گئی۔ جنوبی افریقہ نے ناراض سابق جنگجوؤں کو اسلحہ دینا شروع کیا۔ موگابے نے "فتحہ بریگیڈ" کو اندرونی دشمنوں کے خلاف استعمال کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ 1983 سے 1985 کے درمیان ماتا میلی لینڈ میں یہاں سے زیادہ شہری مارے گئے۔ یہ وہ زخم ہے جو آج بھی زمبابوے کی سیاست میں رس رہا ہے۔

معاشی طور پر بھی نقصان شدید تھا۔ فضائی تحفظ کے بغیر زمبابوے کو اپنی فوج اندر رکھنے پر مجبور ہونا پڑا، جس سے موزیق میں تیل کی پائپ لائن غیر محفوظ ہو گئی۔ جنوبی افریقہ نے بندگا ہوں پر کثروں مضبوط کیا اور زمبابوے کی درآمدات پر عملًا اضافی خفیہ محصول لگا دیا۔ مغربی سربایہ کا ر بھاگ گئے، معیشت پچاس فیصد سکڑ گئی، اور جنوبی افریقہ کے فرنٹ کمپنیاں اندر گھس آئیں۔ مغرب نے زمبابوے کے خلاف ایک کے بعد دوسرا سازش جاری رکھی۔

آج جب ہم پچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو یہ واقعہ صرف ایک فضائیہ کی تباہی کی کہانی نہیں بلکہ سرد جنگ کے اس کھیل کی علامت ہے جس میں مغربی طاقتوں نے کرو ر افریقی ریاستوں کو کبھی سنبھلنے ہی نہیں دیا۔ امریکہ نے براہ راست حملہ تو نہیں کیا مگر جنوبی افریقہ کو خفیہ طریقے سے بھر پور مدد دی۔

-----فائل 16-AF کا اختتام-----

ملک: سوڈان

سال: 1983

فائل: AF-17

سنہ 1983 میں جان گارانگ نامی ایک سابق فوجی افسر نے سوڈان کے جنوبی علاقے سے ہتھیار اٹھائے تو کسی کو کیا پتہ تھا کہ یہ جنگ دو ہائیوں تک چلے گی اور میں لاکھ لوگ مارے جائیں گے۔ اس جنگ نے نہ صرف سوڈان کو دو حصوں میں بانٹ دیا بلکہ پورے مشرقی افریقہ کا نقشہ بدل دیا۔ سوڈان کے لوگ اس جنگ کو امریکی اور اسرائیلی سازش قرار دیتے ہیں۔

سوڈان کے شمال میں عرب نژاد مسلمان اور جنوب میں افریقی نسل کے عیسائی اور رولیتی مذاہب کے ماننے والے بستے تھے لیکن یہ لوگ صدیوں سے ایک دوسرے کیسا تھا مل جل کر رہے تھے۔ انگریزوں نے نوآبادیاتی دور میں شمال کو الگ اور جنوب کو الگ رکھ کے ان میں تقسیم ہیدا کی اور پھر آزادی کے بعد موقع ملتے ہی دونوں حصوں کو ایک دوسرے سے لڑوا دیا۔ سنہ 1973 میں ایک امن معاهدہ کے بعد پہلی خانہ جنگی ختم ہوئی لیکن جب صدر جعفر نمیری نے 1983 میں شریعت نافذ کی تو جنوبی حصے میں غصہ بھڑک اٹھا۔ اسی سال جان گارانگ نے "سوڈان پیپلز بریشن آرمی" کے نام سے بغاوت شروع کی۔

ابتداء میں امریکہ اور اسرائیل دونوں کا اس تحریک سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ امریکہ اس وقت نمیری کا اتحادی تھا اور سوویت اثر کے خلاف اسے اپنا دوست سمجھتا تھا۔ اسرائیل نے تو سوڈان سے تعلقات کب کے توڑ دیے تھے اور اسے غیر اہم عرب ملک سمجھتا تھا۔ لیکن جیسے ہی 1985 میں نمیری کا تختہ اللہ اور اسلام پسندوں نے اثربڑھانا شروع کیا، حالات بدل گئے۔ سنہ 1989 میں جب عمر البشیر اور حسن الترابی نے فوجی بغاوت کر کے اقتدار سنبھالا تو وہ دور سوویت یونین کے بعد کا تھا جب امریکہ اور اسکے اتحادی نام نہاد دھشتگردی کی جنگ کا ماحول بنارہے تھے۔ القاعدہ کے شدت پسندوں کا بہانہ بنایا کرو اشنگٹن نے سوڈان کو دشمن قرار دے دیا۔

یہیں سے کہانی میں وہ موڑ آیا جس نے کئی غلط فہمیاں پیدا کیں۔ امریکہ نے انسانی امداد اور سفارتی مدد کے بھانے سے اس علیحدگی پسندی کی تحریک کو مضبوط بنایا۔ امریکہ پر اپنے ملکی قانون کی پابندی تھی کہ جب تک جنگ جاری ہو، کسی فریق کو ہتھیار نہیں دی جا سکتے۔ سنہ 1993 سے 2005 تک امریکہ نے دو ارب ڈالر سے زیادہ امداد دی لیکن یہ بظاہر خوراک، پناہ گزینیوں اور امن مذکرات پر خرچ ہوئی۔

اسرائیل کا کردار بھی اسی طرح مشکوک رہا اور اسرائیل نے خفیہ طور پر اسلحہ دیا۔ اسرائیل کی زیادہ توجہ ایتھوپیا اور ایران کے اثر کو روکنے پر تھی، سوڈان کے بااغی اس کے مرکزی امجنڈے میں نہیں تھے لیکن اسرائیل بہر حال اس سازش کا حصہ بنا۔ امریکہ کے اتحادی حمایت جنوب کے پُوسی ممالک سے سوڈان کے ہمسایہ ممالک میں سے امریکی اتحادیوں ایتھوپیا کے مینگستو اور یونگنڈا کے یوری موسیوینی نے جان گارانگ کو اسلحہ فراہم کیا۔ یونگنڈا ایس پی ایل اے کا سب سے بڑا سہارا بن گیا۔ ہتھیار زیادہ تر مشرقی یورپ سے خریدے گئے۔

امریکی نے خفیہ طریقے سے اس پوری سازش کی نگرانی کی۔ کانگریس کے کچھ اراکین، خاص طور پر بلیک کا کس اور ایو نجیلیکل گروہ، جنوبی سوڈان کے عیسائیوں کی حمایت کرتے تھے مگر حکومت نے براہ راست عسکری مدد سے گریز کیا۔ کلنٹن اور بعد میں بیش انتظامیہ نے بظاہر مذکرات پر زور دیا۔ سنہ 2002 کے "ماچاکوس پروٹوکول" نے امن کی راہ ہموار کی اور سنہ 2005 میں ایک جامع معاهدے کے بعد جنگ ختم ہوئی۔ اسی معاهدے نے جنوبی سوڈان کو خود مختاری دی اور 2011 میں وہ الگ ملک بن گیا۔ لیکن قیمت بہت بھاری تھی۔ دو ملین جانیں ضلع ہوئیں، چار ملین لوگ بے گھر ہوتے، جنوبی علاقے مکمل طور پر بتاہ ہو گئے۔ اس جنگ نے مذهبی اور نسلی تقسیم کو مزید گہرا کیا۔ سوڈان کے شمال میں یہ یقین پختہ ہوا کہ جنوبی باغیوں کو مغرب کی پشت پناہی حاصل ہے، جس نے نہ صرف امریکی مخالفت کو ہوا دی بلکہ فوجی آمیریت کو جواز دیا۔

سوڈان کے لیے یہ جنگ صرف ایک خاذ جنگی نہیں تھی بلکہ ایک ایسا عمل تھا جس نے اس کے مستقبل کی سمت طکر دی۔ سوڈان میں پھیلی مذهبی انتہاء پسندی بھی امریکہ اور اتحادیوں کی ہی دین تھی۔ سوویت یونین کے مقابلہ کرنے کیلئے جس طرح پاکستان میں عرب ممالک کی مدد سے سلفیت، وہابیت اور تکفیریت پھیلائی گئی تھی ویسے ہی سوڈان میں بھی کیا گیا تھا۔ سوڈان میں سو شلسٹ تحریک بہت مضبوط تھی مگر اسے امریکی مدد سے ختم کیا گیا تھا۔ عمر البشیر نے اسی جنگ کے ساتھ میں اپنی

طااقت کو مصبوط کیا اور مغرب کو موقع مل گیا کہ سودانی عالمی تہائی میں دھکیل دے۔ ادھر جنوبی سودان آزادی کے بعد خود خانہ جنگی کا شکار ہوا کیونکہ امن معابدہ جلدی میں ہوا تھا، اور مسائل جیسے تیل کی تقسیم اور سرحدی جھگڑے حل نہ ہو سکے تھے۔ آج سودان ایک بار پھر انتشار میں ڈوبا ہوا ہے، وہی پرانے زخم اب نئے ناموں کے ساتھ پھر سے سامنے آگئے ہیں۔ فوج اور نیم فوجی فورسز کی لڑائی، بیرونی مداخلت، اور ٹوٹی ہوئی ریاستی ساخت ایک بار پھر ثابت کر رہی ہے کہ مغربی ممالک کی مداخلت اچھے بھلے ملک کے پیر اکھاڑ کر اسے اپنے راستے سے ایسے بھٹکاتی ہے کہ پھر انہیں کبھی منزل نہیں ملتی۔

-----فائل 17-AF کا اختتام-----

ملک: بوٹسوانا

سال: 1985

فائل: AF-18

---

چودہ جون 1985 کی رات جنوبی افریقہ کے کمانڈوز نے سرحد پار کر کے بوتسوانا کے دارالحکومت گابورون میں عام گھروں پر دہشتگردانہ حملہ کیا۔ ان گھروں میں عام پناہ گزین، اساتذہ اور صحافی رہتے تھے۔ صرف توے منٹ میں بارہ لوگ مارے گئے، ان میں ایک چھ سالہ بچہ بھی شامل تھا۔ یہ ایک منصوبے کے تحت کی گئی کارروائی تھی۔ حملہ آوروں کے پاس سی آئی اے کی دی ہوئی تصاویر، نقشے اور وہ تفصیلات تھیں جن کے بغیر کسی خفیہ فوجی آپریشن کا تصور بھی ممکن نہیں تھا۔

یہ واقعہ سمجھنے کے لیے تھوڑا سا پس منظر جانتا ضروری ہے۔ 1980 کی دہائی میں جنوبی افریقہ میں نسل پرستی کے خلاف جدوجہد اپنے عروج پر تھی۔ افریقنز نیشنل کانگریس یعنی اے این سی کے ہزاروں کارکن گرفتار ہو چکے تھے یا ملک چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ بوتسوانا جیسے چھوٹے اور پر امن ملک نے ان پناہ گزینوں کو پناہ دی۔ دارالحکومت گابورون کے محلوں ایکسٹیشن 12 اور 13 میں سینکڑوں کارکن رہنے لگے۔ وہاں وہ امن سے رہتے، پڑھاتے، اخبار نکالتے اور خفیہ طور پر جدوجہد جاری رکھتے۔ ان کے دروازے رات میں بند بھی نہیں ہوتے تھے۔ کسی نے سوچا بھی نہ تھا کہ ایک دن یہی امن ان کے لیے موت کا پھندا بن جائے گا۔

جنوبی افریقہ کے جریلوں کو یہ بات برداشت نہیں تھی کہ ان کے دشمن چند میل دور اطمینان سے زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن مستعلماً یہ تھا کہ بوتسوانا کی سر زمین ان کی رسائی سے باہر تھی۔ تب امریکی خفیہ ادارہ سی آئی اے نے مدد کا ہاتھ بڑھایا۔ گابورون میں امریکی سفارت خانے کے اندر سی آئی اے کا ایک خفیہ اسٹیشن تھا جو PROJECT BANNERET کے نام سے چل رہا تھا۔ اسی کے تحت سی آئی اے نے جنوبی افریقہ کو اے این سی کے گھروں کی سیٹلائزٹ تصاویر، ٹیلی فون گفتگو کی ریکارڈنگ اور ان

لوگوں کے نام اور پتے دیے جو وہاں آتے جاتے تھے۔ ایک بوسوانی امیگریشن کلرک کو ماہانہ چار سو ڈالر دے کر خفیہ طور پر بھرتی کیا گیا تھا تاکہ وہ آنے جانے والوں کی گاڑیوں کے نمبر اور رہائشی پتے روپرٹ کرے۔

تین جون 1985 کو ایک امریکی افسر نے پریسٹوریا میں نیشنل انٹلی جنس سروس کے ڈپٹی ڈائریکٹر کو ایک فولڈر دیا جس پر لکھا تھا BOT ANC ORD 85 06 03 دیکھی گئی ہیں۔ انہی گھروں پر حملہ نو دن بعد ہوا۔

چودہ جون کی رات ڈیڑھ بجے تقریباً پچاس کمائنڈوز اٹھارہ وینوں میں سوار ہو کر سرحد پار کر گئے۔ ان کے پاس جعلی نمبر پلیٹیں تھیں۔ انہوں نے پہلے فون لائیں کاٹیں، پھر سڑکوں پر کیل بکھیر دیے تاکہ پولیس کی گاڑیاں نہ پہنچ سکیں۔ اس کے بعد انہوں نے آٹھ گھروں پر حملہ کیا۔ کھڑکیوں سے دستی بم پھینکے، کروں پر خودکار ہتھیاروں سے فائزنگ کی۔ نوے منٹ میں وہ واپس چلے گئے۔ صحیح تک شہر میں صرف لاٹھیں بیچی تھیں۔

مارے جانے والوں میں اے این سی کے مشہور آرٹسٹ تھامسانگا میںے لے بھی تھے جو اپنی میز پر بیٹھے خاکہ بنارہے تھے۔ ان کے علاوہ ایک بوڑھا ڈرائیور، ایک میاں بیوی، ایک بچہ اور ایک غیر ملکی تاجر بھی مارے گئے جو وہاں صرف کاروبار کے لیے آیا تھا۔

جنوبی افریقہ نے اسے دہشت گردوں کے خلاف "سر جکل اسٹرائیک" کہا، مگر بعد میں ٹرو مخ اینڈ ریکنسلی ایشن کمیشن کی روپرٹ میں واضح کیا گیا کہ زیادہ تر مارے جانے والے عام شہری تھے۔

ایک سال بعد چودہ جون 1986 کو ایک اور چھوٹا حملہ ہوا۔ اس بارے این سی کے رکن ٹھیکل پوکو لے لا کو ان کے بستر پر گولی مار کر قتل کیا گیا۔ ان کے گھر تک پہنچنے کا راستہ بھی امریکی سینٹلائٹ تصاویر سے شناخت کیا گیا تھا۔

ان حملوں کے اثرات گھرے تھے۔ بوسوانا نے اپنا سفیر واپس بلا لیا اور اقوام متحدہ سے انصاف مانگا۔ امریکا نے ایک رسمی بیان جاری کیا کہ اسے افسوس ہے، مگر پس پرده یہی مؤقف رکھا کہ یہ سب کیونسٹ اثرات کے خلاف عالمی جنگ کا حصہ ہے۔ اے این سی نے گابوروں چھوڑ دیا اور اپنی سرگرمیاں زمبابوے اور زامبیا منتقل کیں، جس سے ان کے نیٹ ورک کو سخت نقصان پہنچا۔

یہ حملہ دراصل جنوبی افریقہ کے لیے ایک نموذج بن گیا۔ اس کے بعد انہوں نے اسی طرز پر دوسرے ممالک میں بھی ایسی ہی دہشتگردانہ کارروائیاں کیں۔ ہر جگہ ایک ہی فارمولہ تھا۔ مغربی انگلیسی جنس کی معلومات، خصوصی فورسز کے کمانڈوز، اور آخر میں سیاسی انکار۔

ان واقعات کا سب سے بڑا نقصان عام انسانوں نے اٹھایا۔ وہ لوگ جو ظلم سے بچنے کے لیے پناہ لینے آئے تھے، وہی غیر ملکی سازشوں کے نشانے بن گئے۔ شہر کے محلے جہاں کبھی موسمی بھتی تھی اور بچے کھیلتے تھے، اچانک خاموش قبرستان بن گئے۔ بعد میں جب ٹروٹھ کمیشن نے تحقیقات کیں تو یہ بات ثابت ہو گئی کہ اگر سی آئی اے کی مدد نہ ہوتی تو یہ حملہ ممکن ہی نہیں تھا۔ واشنگٹن کے لیے اصل فکر یہ تھی کہ جنوبی افریقہ کے ساتھ خفیہ تعلق خراب نہ ہو۔ جب بوئوسانا نے وضاحت مانگی تو امریکی سفارت خانے نے الٹا مشورہ دیا کہ اے این سی کے کارکنوں کو زیادہ نظم و ضبط اختیار کرنا چاہئے۔

-----فال 18-AF کا اختتام-----

ملک: موزیق

سال: 1986

فائل: AF-19

انیں اکتوبر 1986 کو موزیق کے صدر سامورا ماشیل کا جہاز جنوبی افریقہ کی سرحد کے اندر گر کر تباہ ہو گیا۔ صدر سمیت ہلاک ہونے والوں کی تعداد چوتیس تھی۔ یہ کوئی حادثہ نہیں تھا بلکہ ایک ایسی جنگ کا ایک باب تھا جسے باہر سے تخلیق کیا گیا تھا۔ یہ کہانی دراصل اس دن سے شروع ہوتی ہے جب موزیق نے پرتگالی سامراج سے آزادی حاصل کی۔ ملک کے پاس کوئی باقاعدہ فوج نہیں تھی، نہ ہی زیادہ تعلیم یافتہ لوگ تھے۔ صدر ماشیل نے آزادی کے فوراً بعد ہی کہا کہ جدوجہد جاری ہے، لیکن ان کا اصل دشمن ابھی سامنے نہیں آیا تھا۔ جب انہوں نے اپنے پڑوسی ملک رہوڈیشیا کی سفارتی اور معاشی ناک بندی کی تو وہاں کی سفید فام اقلیتی حکومت نے جوابی کارروائی کی۔ انہوں نے موزیق میں ایک پرائسی فورس بنانے کا فیصلہ کیا جس کا نام تھا رینامو۔

اس گروپ کے لیے رہوڈیشیا کی خفیہ اجنسی نے ایک ایسے فریلیمو کمانڈر کو منتخب کیا جو ریپ کے ہرم میں جیل میں تھا۔ اس کا نام تھا آندرے ماتسانگا نسا۔ اسے رہائی کے بدے میں ایک تحریک کاری دستے کی قیادت کرنی تھی۔ مئی 1977 میں اسے اور اس کے چھتہر ساتھیوں کو ہتھیاروں کے ساتھ گوریگونسا کے پہاڑی سلسلے میں اتار دیا گیا۔ ان کا کام تھا پلوں، اسکلوں اور ہسپتاں کو تباہ کرنا۔ ماتسانگا نسا تو پہلی ہی کارروائی میں مارا گیا، لیکن اس کا نائب، ایک چویس سالہ نوجوان الفانسو ڈیلا کاما، اس کا جانشین بنا اور اس نے رینامو کو ایک خوفناک جنگجو گروپ میں بدل دیا۔

جب رہوڈیشیا کی جگہ زمبابوے نے لے لی تو جنوبی افریقہ نے رینامو کی کمان سنبھال لی۔ انہوں نے اسے سرد جنگ کے دور میں ایک اینٹی کمیونسٹ فورس کے طور پر پیش کیا۔ امریکی سی آئی اے سے شروع ہی سے اس گروپ کو فنڈنگ فراہم کر رہی تھی، جو جنوبی افریقہ کے راستے بھیجی جاتی تھی۔ یہ رقم ہتھیاروں، بارودی سرنگوں اور سینٹائیٹ معلومات کی شکل میں آتی تھی۔

رینامو کی جنگ اب مجاز آئی نہیں رہی تھی بلکہ معاشرے کو مکمل تباہ کرنے کی کوشش تھی۔ انہوں نے اسکول جلاتے، کلینک تباہ کیے، اور پچاس ہزار بچوں کو اغوا کیا۔ لڑکیوں کو کمانڈروں کے حوالے کر دیا جاتا اور لڑکوں کو بندوقیں پکڑا دی جاتیں۔ انہوں نے زینی بارودی سرنگیں ایسی جگہوں پر بچھائیں جہاں عام لوگ پانی بھرنے جاتے تھے۔ اقوام متحده کے اندازے کے مطابق ہر چالیس منٹ بعد ایک عام شہری ہلاک ہو رہا تھا۔

فریلیمو حکومت نے سخت مقابلہ کیا۔ فوج بڑھائی، نوجوانوں کو بھرتی کیا اور سوویت یونین سے دہشتگردی کے خلاف مدلی۔ بارودی سرنگوں کو صاف کیا، پلوں کو دوبارہ بنایا، دوسری طرف امریکی کی مدد سے رینامو کی دہشتگرد تنظیم اسے دوبارہ تباہ کرتی رہی۔ اس جنگ کا واحد مقصد دہشتگردی تھا۔ امریکہ اور جنوبی افریقہ، موزبیق میں صرف خون بہانا چاہتے تھے۔

صدر ماشیل کے جہاز کے حادثے کے بعد بھی جنگ جاری رہی۔ آخر کار دونوں فریق تھک گئے۔ جنوبی افریقہ خود اندر ونی بحران کا شکار ہو گیا اور امریکہ کو بھی موزبیق کے تعاون کی ضرورت تھی۔ بات چیخت کا عمل شروع ہوا اور 1992ء میں امن معاهدہ طے پایا۔ اس جنگ کے نتیجے میں دس لاکھ افراد ہلاک ہوتے، پچاس لاکھ بے گھر ہوتے، اور پندرہ لاکھ بارودی سرنگیں زین میں دبائی گئیں۔ ملک کی معيشت تباہ ہو گئی۔

اس جنگ کے اثرات آج بھی موجود ہیں۔ موزبیق دنیا کے غریب ترین ممالک میں سے ایک ہے۔ کسانوں کی کھیتی باڑی کی زینیں آج بھی بارودی سرنگوں سے بھری ہیں۔ آج بھی کوئی نہ کوئی بچہ کھلتے ہوئے بارودی سرنگ پھٹنے سے مر جاتا ہے۔ امریکہ نے اس جنگ کا فارمولہ کئی جگہ دہرا�ا ہے۔ یونڈا، روانڈا، کانگو میں اسی طرح کی پر اکسی فوجیں بنائی گئیں۔

-----فائل 19-AF کا اختتام-----

ملک: برکینا فاسو

سال: 1987

فائل: AF-20

پندرہ اکتوبر 1987، افریقہ کی تاریخ کا وہ سیاہ دن ہے جب ایک ایسے شخص کو گولی مار دی گئی جس نے اپنی قوم کو غربت، خوف اور غلامی سے نکالنے کا خواب دیکھا تھا۔ تھامس سنکارا، برکینا فاسو کا نوجوان صدر، اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک میٹنگ میں بیٹھا تھا جب اس کے ہی قریبی دوست اور فوجی ساتھی بلیز کپاؤرے کے سپاہیوں نے اندر داخل ہو کر اسے موقع پر ہی قتل کر دیا۔ وہ صرف سینیٹس برس کا تھا۔

تھامس سنکارا کا تعلق اس زمانے کے ان چند افریقی رہنماؤں میں تھا جنہوں نے مغربی طاقتوں کے تسلط کو کھلے عام لکارا تھا۔ اس نے سنہ 1984 میں ملک کا نام اپر و ولٹا سے بدل کر برکینا فاسو رکھا، جس کا مطلب ہے "ایماندار لوگوں کی سرزین"۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کا ملک دوسروں کے سہارے پر نہیں بلکہ اپنی محنت اور وسائل پر کھڑا ہو۔ اس نے زین کی ملکیت عام کسانوں میں تقسیم کی، خواتین کے حقوق کے لیے سخت قوانین بنائے، زچل کے دوران اموات کم کرنے کے لیے ملک گیر و یکسینیشن مہم شروع کی، اور بچیوں کے ختنہ کے عمل پر پابندی لگائی۔

سنکارا نے عالمی مالیاتی اداروں کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ غیر منصفانہ قرضے واپس نہیں کرے گا کیونکہ وہ غلامی کی ایک اور شکل ہیں۔ یہ بات فرانس اور امریکہ دونوں کو ناگوار گزرا۔ فرانس جو اس وقت بھی اپنے سابق نوآبادیاتی ممالک کو اپنی کرنی فرانک کے ذریعے قابو میں رکھتا تھا، اسے سنکارا کی آزاد سوچ پسند نہیں آئی۔ امریکہ کو بھی سنکارا کی آزادی کی خواہش قبول نہیں تھی۔

در اصل برکینا فاسو کی حیثیت ایک ایسے چھوٹے مگر خودار ملک کی تھی جو عالمی نظام کو چیلنج کر رہا تھا۔ لیکن طاقتوں ملک کبھی بھی کسی کم و مر ریاست کو آزاد راستہ نہیں لینے دیتے۔ سنکارا کا اپنا قریبی ساتھی بلیز کمپاؤرے مغرب کے ہاتھوں بک گیا۔ اس نے اپنے دوست سنکارا اور اپنی قوم کی ساتھ غداری کی۔

پندرہ اکتوبر کی صبح فوج کے چند سنتے صدارتی محل پہنچے۔ سنکارا مینگ میں موجود تھا جب فائزگ شروع ہو گئی۔ چند منٹوں میں وہ اور اس کے بارہ ساتھی مارے جا چکے تھے۔ ان کی لاشیں جلدی میں ایک گڑھے میں دفن کر دی گئیں۔ کمپاؤرے نے فوراً اقتدار سنبھال لیا اور سنکارا پر الزام لگایا کہ وہ آمر بن گیا تھا۔ لیکن دنیا جانتی تھی کہ وہ غدار ہے اور سنکارا ایک وطن پرست عظیم نظریاتی تھا۔

کئی عینی شاہدین نے بعد میں بتایا کہ اس دن سرکاری ریڈیو اسٹیشن کی نشریات اچانک بند ہو گئی تھیں۔ اس وجہ سے سنکارا کے حامی کوئی منظم مذاہمت نہ کر سکے۔ بعد میں سامنے آنے والے امریکی سفارتی خطوط سے پتا چلا کہ ریڈیو سکنل میں "غیر معمولی مداخلت" میں امریکہ کا ہاتھ تھا۔ مگر امریکہ نے کہا کہ یہ اندرونی فوجی رابطوں کی وجہ سے ہوا۔ لچسپ بات یہ ہے کہ فرانس کے پاس ناجھر میں ایک سکنل انٹلی جنس اسٹیشن موجود تھا جو ان ہی فریکوننسیز کو جام کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا جن پر برکینا فاسو کا ریڈیو کام کرتا تھا۔ فرانس بھی اس سازش میں شامل تھا۔

قتل کے فوراً بعد فرانس اور امریکہ دونوں نے کمپاؤرے کی حکومت کو تسلیم کر لیا اور امداد بحال کر دی۔ اس کے بعد برکینا فاسو ایک بار پھر انہی مالیاتی اداروں کے شکنجه میں آگیا جن سے سنکارا نے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ زین دوبارہ سرداروں کے حوالے کر دی گئی، غیر ملکی قرضے واپس لینے لگے، اور ملک مغربی ائمیں واپس آگیا۔ اگلے ستائیں سال کمپاؤرے نے سخت آمریت کے ساتھ حکومت کی۔

سنکارا کی موت کے بعد پورے برا عظم میں ایک گہرا خلپیدا ہو گیا۔ وہ صرف ایک سیاستدان نہیں تھا بلکہ افریقہ کی خوداری کی علامت بن چکا تھا۔ اس کے قتل نے یہ پیغام دیا کہ جو رہنمای مغرب کے سامنے جھکنے سے انکار کرے گا، وہ زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔ لیکن وقت کے ساتھ سنکارا ایک علامت بن گیا۔ اس کی تصویریں آج بھی افریقہ کے کئی شہروں کی دیواروں پر بنی ہوئی ہیں۔ نوجوان اس کے اقوال دھراتے ہیں اور اسے اپنے ہیر وزیں شمار کرتے ہیں۔

سن 2021 میں آفریکا اس قتل کے مقدمے کی سماعت ہوئی۔ بلیز کپاؤرے کو غیر حاضری میں سزا سنائی گئی لیکن وہ اب بھی آئیوری کوسٹ میں پناہ لیتے ہیں۔ دو فرانسیسی اہلکاروں پر بھی الزام لگا کہ وہ اس واقعے میں شامل تھے لیکن فرانس نے تعاون سے انکار کر دیا۔ اس مقدمے نے ایک بار پھر واضح کر دیا کہ افریقی ملک غیر ملکی طاقتوں کی سازشوں سے بچے بغیر خوشحال نہیں ہو سکتے۔

آج جب برکینا فاسو ایک بار پھر سیاسی عدم استحکام اور دہشت گردی کا شکار ہے، اس کا نیا فوجی رہنماء ابراہیم تراورے، تھامس سنکارا کو اپنا ہیرو مانتا ہے۔ اس نے فرانس کے فوجی اڈے بند کر دیے ہیں اور روس و ترکی سے تعلقات بڑھانے ہیں۔ لوگ اس سے بھی سنکارا کی طرح محبت کرتے ہیں۔ مغرب نے اسکے جسم کو تودفنا دیا تھا مگر تھامس سنکارا کی روح آج بھی افریقہ میں زندہ ہے۔

-----فائل AF-20 کا اختتام-----

ملک: الجزائر

سال: 1992

فائل: AF-21

جنوری 1992 میں الجزائر کی فوج نے اچانک عام انتخابات منسوخ کر دیے۔ وہی انتخابات جن میں اسلامی سالویشن فرنٹ نامی جماعت نے شاندار کامیابی حاصل کر لی تھی اور اگلے مرحلے میں حکومت بنانے جا رہی تھی۔ اس ایک فیصلے نے پورے ملک کو آگ میں جھونک دیا۔ اگلے سات برسوں میں دو لاکھ انسان مارے گئے، ہزاروں غائب ہوئے، اور ایک پوری نسل فوجی آمریت کے سائے میں پروان چڑھی۔ مگر اصل سوال یہ ہے کہ یہ سب ہوا کیسے؟ فوج کے پاس اتنی طاقت آئی کہاں سے؟ جواب سیدھا ہے۔ فرانس اور امریکہ نے خود اپنے ہاتھوں سے وہ ہتھیار، تربیت اور سفارتی تحفظ دیا جس نے اس خانہ جنگلی کو ممکن بنایا۔ پس منظریہ تھا کہ نوے کی ڈائی کے آغاز میں الجزائر میں عوام اسلامی جماعتوں کی طرف مائل ہو چکے تھے۔ اسلامی سالویشن فرنٹ نے نعرہ لکایا کہ اسلام ہی حل ہے۔ پہلی قسط کے انتخابات میں ان کی غیر معمولی فتح نے یورپ اور امریکہ میں خطرے کی گھنٹی بجادی اور دونوں جمیوریت پسند طاقتوں نے مل کر فیصلہ کر لیا کہ ووٹوں کے بجائے ٹینکوں کو موقع دینا چاہئے۔ اسی فیصلے کے بعد فرانس نے فوری طور پر وہ فوجی قرض بحال کر دیے جو 1988 کے فسادات کے بعد معطل کر دیے گئے تھے۔ جدید بکتر بندگاڑیاں، فاماں رانفلیں، ہیلی کاپڑ اور گولہ باروں والے الجزائر کی بندگاہوں پر اترنے لگے۔ فرانس کے تربیت کاروں نے صحرائیں قائم اڈوں پر الجزائر کے خصوصی دستوں کو شہری علاقوں میں آپریشن سکھائے۔ امریکیوں نے تھوڑا پر وہ رکھا لیکن ان کی مدد کم خطرناک نہیں تھی۔ سی آئی اے کے ماہرین نے الجزائر کے خفیہ ادارے کے اندر ایک مرکز قائم کرایا جہاں موبائل کالرز اور بینک ٹرازنیکشنز کو ایک ساتھ ٹریس کرنے کا نظام بنایا گیا۔ امریکی سیٹلائٹس روزانہ کی بنیاد پر مراحتی گروہوں کی نقل و حرکت کی تصویریں فراہم کرتے تھے۔

فوج کے لیے ایک مستقلہ تھا کہ وہ پورے ملک میں ہر گاؤں پر قابو نہیں رکھ سکتی تھی۔ اس کا حل بھی مغرب نے دیا۔ وہی علاقوں میں مقامی ملیشیا بنائی گئی جنہیں خود فرانس نے اسلحہ فراہم کیا۔ یہ ملیشیا دراصل دیہاتی لوگوں میں سے بنی جنہیں بتایا گیا کہ وہ اپنے دفاع کے لیے ہتھیار اٹھا رہے ہیں مگر جلد ہی وہ ریاستی قتل و غارت کا حصہ بن گئے۔ دوسری طرف شہری علاقوں میں ”پریاٹس مومنٹ“ کے نام سے گروہ بنائے گئے جنہیں امریکی بندوقیں دی گئیں اور ماہانہ تباہیں فرانس کے سفارت خانے کے تعاون سے ملتی رہیں۔

سنہ 1997 اور 1998 کے درمیان رمضان کے مہینوں میں وہ سب کچھ ہوا جسے الجزائر آج بھی سیاہ دہائی کہتا ہے۔ دارالحکومت کے قریب قصبوں میں ایک کے بعد ایک قتل عام ہوا۔ رائس، بنتالحہ اور سیدی حامد میں درجنوں عورتیں، بچے اور بوڑھے راتوں کے رات ذبح کر دیے گئے۔ عینی شاہدین نے بتایا کہ فوجی دستے بالکل قریب موجود تھے مگر کسی نے مداخلت نہیں کی۔ قاتلوں کے پاس رات میں دیکھنے والی عینکیں تھیں جو صرف فوج کے پاس تھیں۔ اس وقت فرانس اور امریکہ نے ایک لفظ بھی احتجاج میں نہیں کہا۔ بلکہ الٹا الجزائر کے صدر کو نہاد ”دہشت گردی کے خلاف جنگ“ میں کامیابی پر شباباش دی گئی۔

نتیجیہ ہوا کہ 1999 تک اسلامی مذاہمت تو ختم کر دی گئی مگر اس کے ساتھ ہی جمہوریت، شفافیت اور انصاف بھی دفن ہو گئے۔ جزوں نے اپنا ایک امیدوار، عبدالعزیز بوقلیقہ، کھڑا کیا جس نے ستر فیصد ووٹ لے کر صدر بننے کا اعلان کیا۔ مغرب نے اسے خوش آمدید کہا اور اعلان کیا کہ الجزائر واپس آئینی نظام میں آگیا ہے۔ مگر اندر سے ملک ایک فوجی کمپنی بن چکا تھا جس کے جنرل وزارتوں، گیس کے معابدوں اور بیروفی قرضوں پر قابض تھے۔

آج الجزائر کی ریاست اب بھی انہی لوگوں کے ہاتھ میں ہے جنہوں نے اس دہائی میں ہزاروں لوگوں کو غائب کیا۔ انسانی حقوق کی تنظیمیں کہتی ہیں کہ اٹھا رہے ہزار افراد کے لاپتہ ہونے کے ثبوت موجود ہیں مگر کوئی مقدمہ نہیں چل سکتا کیونکہ جس خفیہ ادارے نے یہ سب کیا وہی اب انصاف کے نظام پر قابض ہے۔

ملک: روانڈا

سال: 1994

فائل: AF-22

چھ اپریل 1994 کی شام ایک طیارہ روانڈا کے دارالحکومت کیکالی کے قریب گرفتار ہوا۔ یہ وہ حادثہ تھا جس نے اگلے سو دنوں میں آٹھ لاکھ انسانوں کی جان لے لی۔ طیارے میں صدر جو وینال ہابیماریمانا سوار تھے، اور ان کی موت کے ساتھ ہی وہ آگ بھڑک اٹھی جس نے افریقہ کی جدید تاریخ کو خون میں نہلا دیا۔ لیکن کہانی یہاں سے شروع نہیں ہوتی۔ اصل کھیل تو کئی سال پہلے واشنگٹن اور لندن کے بند کروں میں طے ہو چکا تھا۔

ایس سو اسی کی دہائی کے آخر میں روانڈا کے ہزاروں تنسی پناہ گزین یوگنڈا میں رہ رہے تھے۔ وہ لوگ اپنے وطن سے اس وقت نکالے گئے تھے جب وہاں بادشاہت ختم ہوئی اور نسلی فسادات شروع ہوئے۔ ان میں سے کئی لوگ یوگنڈا کے صدر یوری موسوینی کی فوج میں شامل ہو گئے۔ یہی وہ مقام تھا جہاں سے روانڈا پیٹریاٹک فرنٹ یعنی آرپی ایف کی بنیاد پڑی۔ ان پناہ گزینوں کی قیادت فریڈ رو گیما اور پال کاگامے جیسے افسروں کے ہاتھ میں تھی۔ یہ وہی کاگامے ہیں جو آج روانڈا کے صدر ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ اس وقت یوگنڈا کو اپنا اتحادی بنانا چاہتے تھے۔ سرد جنگ ختم ہو رہی تھی اور مغرب چاہتا تھا کہ افریقہ میں فرانس کے اثر کو کم کیا جائے۔ موسوینی نے مغرب کو یقین دلایا کہ اگر وہ مدد کریں تو یہ خط ان کے زیر اثر آسکتا ہے۔ یہی وہ لمحہ تھا جب مغربی طاقتوں نے ایک پناہ گزین فوج کو ایک ریاست کے خلاف لڑنے کی اجازت دی۔

سنہ 1990 کے شروع میں امریکی سی آئی اے نے یوگنڈا کے راستے آرپی ایف کو اسلحہ فراہم کرنا شروع کیا۔ ریکارڈ میں یہ ہتھیار "غیر مہلک ساز و سامان" کہہ کر درج کیے گئے لیکن دراصل ان میں دو ہزار چار سو خودکار را تھیں، ساٹھ راکٹ لانچر اور لاکھوں گولیاں شامل تھیں۔ برطانیہ نے اپنے فوجی ٹرینر بھیجے جنہوں نے بمبو کیمپ میں سینکڑوں باغیوں کو تربیت دی۔ برطانوی وزارت دفاع کے فنڈ سے یہ سارا خرچ ادا کیا گیا تاکہ پارلیمنٹ میں سوال نہ اٹھ سکے۔

یکم اکتوبر 1990 کی رات آرپی ایف کے تقریباً چار ہزار جنگجو یونڈاکی سرحد پار کر کے روانڈا میں داخل ہوئے۔ یہ وہ لمحہ تھا جس نے پورے ملک کو خانہ جنگی میں دھکیل دیا۔ فرانس، جو اس وقت روانڈا کی حکومت کا اتحادی تھا، صورتحال پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ مگر واشنگٹن اور لندن نے خاموشی اختیار کی۔ نہ کسی نے مداخلت کی بات کی، نہ کسی نے یونڈا کو روکا۔ اس خاموشی کا مطلب واضح تھا۔ باغیوں کے لیے راستہ کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔

سنہ 1993 میں جب عروشا میں امن مذاکرات جاری تھے، آرپی ایف اچانک حملہ کر کے دارالحکومت کے قریب پہنچ گیا۔ فرانس نے دونوں فریقوں پر اسلحے کی پابندی کی تجویز دی لیکن برطانیہ نے اسے روک دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت کی سپلائی بند ہو گئی اور باغیوں کے پاس ہر چیز موجود رہی۔

چھ اپریل 1994 کو صدر کا طیارہ میزائل سے مار گرا یا گیا۔ سب جانتے ہیں کہ یہ کام کون کرو سکتا تھا۔ اس حادثے سے چند دن پہلے امریکی اور برطانوی نمائندے واضح طور پر کہہ چکے تھے کہ اگر صدر امن معاہدے میں رکاوٹ بنے تو "انہیں نتائج کا سامنا کیلئے کرنا پڑے گا"۔ حادثے کے فوراً بعد قتل عام شروع ہو گیا۔ ہوتا انتہا پسندوں نے تسلیم اور معتمد ہتوؤں کو چن کر مارنا شروع کیا۔ اس دوران آرپی ایف نے دوبارہ حملہ کیا اور تین مہینوں میں پورا ملک فتح کر لیا۔

جب یہ سب ہو رہا تھا تو اقوام متحده کی امن فوج کو کم کر دیا گیا تھا۔ امریکہ اور برطانیہ نے قراردادوں کو نرم رکھا تاکہ باغی فوج بلا روک ٹوک آگے بڑھ سکے۔ جولائی 1994 میں کاگامے کی قیادت میں آرپی ایف نے کیگالی پر قبضہ کر لیا۔ قتل عام رک گیا، مگر تب تک آٹھ لاکھ سے زیادہ لوگ مر چکے تھے۔ مغربی دنیا نے تی حکومت کو فوراً تسلیم کیا۔ امداد کے دروازے کھل گئے، سفارت خانے دوبارہ قائم ہو گئے، اور آرپی ایف کو "استحکام کی قوت" کہا گیا۔

لیکن کہانی یہیں ختم نہیں ہوئی۔ لاکھوں ہتوپناہ گزینوں نے کانگو کا رخ کیا۔ آرپی ایف نے ان کا پیچھا کیا اور 1996 میں پہلی کانگو جنگ شروع ہو گئی۔ مغربی سیٹلائٹس اور مشیروں نے ایک بار پھر راستہ دکھایا۔ اس جنگ نے زانیم کے صدر موبوٹو کو گرا دیا اور پھر دوسری کانگو جنگ چھڑ گئی جس میں نو ماک ملوٹ ہوئے اور پانچ ملین لوگ مارے گئے۔

اگر امریکہ چاہتا تو یہ خونریزی مل سکتی تھی۔ سابق امریکی اہلکار پرڈنیس بشنل نے بعد میں اعتراف کیا کہ "ہم جانتے تھے آپی ایف کی حمایت کے خطرات کیا ہیں، مگر اس وقت ہمیں لیبیا کو قابو میں رکھنا اور فرانس کو پچھے کرنا زیادہ ضروری لگا۔" یہ جینو سائیڈ اتفاقیہ نہیں تھا بلکہ کروایا گیا تھا۔

امریکہ نے روانڈا سے کانگوتک پورے خط کو برباد کر دیا۔ طاقتور ملکوں کے لیے یہ صرف جغرافیائی شترنج تھی، مگر جنہیں مہرے بنایا گیا وہ انسان تھے۔

دوستو جب آپ افریقیا مشرق و سطحی کی خبریں سنتے ہیں تو ماضی کی کہانیاں ضرور یاد رکھا کجھیے کہ کس طرح بڑی طاقتوں نے اپنے مفادات کے لیے لاکھوں لوگوں کے قتل عام کو یقینی بنایا۔ آپ کو یاد ہے کہ ہمیں اخبارات اور ٹیلیویژن پر کیا دکھایا گیا تھا؟ ہمیں یہ تاثر دیا گیا تھا کہ جیسے امریکہ اور اسکے اتحادیوں نے روانڈا کا جینو سائیڈ روکا تھا۔

جینو سائیڈ کا سب سے بڑا مجرم کابوگا 26 سال تک مغفور رہا اور پوری دنیا میں گھومتا پھرتا رہا اور آخر کار جب اسے بچانے کی ضرورت نہ رہی تو وہ فرانس میں پکڑا گیا۔ کابوگا جینو سائیڈ کے بعد سونٹرلینڈ میں اپنے بینک سے پیسے نکلوانے کے بعد غائب ہوا تھا۔ سب جانتے تھے کہ وہ کدھر ہے۔

شترنج کی دونوں سائیڈز کے مہرے ان کے ہاتھ میں تھے۔ دونوں طرف سے چالیں یہ خود چل رہے تھے۔ روانڈا کے جینو سائیڈ کی تمام تر ذمہ داری انہی پر عاید ہوتی ہے۔

افریقہ کے تمام ڈکٹیٹرز اور جراحتم پیشہ جنگجوؤں، مسلم دہشتگردوں کو مغربی اتحادیوں کی مکمل حمایت حاصل رہی ہے۔ ابھی حال ہی میں امریکی سینیٹ ہیرنگ میں اعتراف کیا گیا ہے کہ یہ ایس ایڈ دنیا بھر کی دہشتگرد تنظیموں کو فنڈ کرتا رہا ہے۔

-----فائل 22-AF کا اختتام-----

ملک: کانگو

سال: 1996

فائل: AF-23

---

سنہ 1996 کے آخر میں مشرقی افریقہ میں ایک خفیہ جنگ شروع ہوئی جس نے آنے والے سات برسوں میں پچاس لاکھ سے زیادہ جانیں لے لیں۔ یہ جنگ دنیا کی نظروں سے تقریباً او جھل رہی مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ دوسری عالمی جنگ کے بعد انسانیت کی سب سے بڑی تباہی تھی۔ اور سب سے حیران کن بات یہ کہ اس جنگ کی جڑیں روانڈا کے ایک قتل عام میں تھیں جسے مغرب نے پہلے تو ہوا دی، پھر اسے روکا نہیں اور بعد میں اسی جینو سائیڈ کے نام پر ایک نئی جنگ چلا دی۔

پس منظر یہ ہے کہ اپریل 1994 میں روانڈا میں صرف سو دنوں کے اندر آٹھ سے دس لاکھ لوگ مارے گئے۔ ہوتونسل کے انتہا پسندوں نے تو تسویی اقلیت کا بے دریغ قتل عام کیا۔ جب تو تسویی قیادت نے روانڈا پیٹریاٹک فرنٹ کے ذریعے اقتدار سنبحا لاتو لاکھوں ہوتے افراد، جن میں قاتل بھی شامل تھے، بھاگ کر پڑو سی ملک زائر پہنچ گئے۔ زائر کا حکمران موبوتو سیسے سیکو امریکہ کا پرانا اتحادی تھا مگر اب بوڑھا اور کمزور ہو چکا تھا۔ اس نے ان پناہ گزنبوں کو سرحدی کیمپوں میں رہنے دیا بلکہ بعض جگہ ان کی پشت پناہی بھی کی تاکہ تو تسویی اشہر و رسوخ کو روکا جاسکے۔

روانڈا کے نئے صدر پال کا گامے نے اسے اپنے ملک کی سلامتی کے لیے خطرہ قرار دیا۔ اس وقت یوگنڈا بھی اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ دونوں ممالک کے فوجی اور اٹیلی جنس ادارے امریکی ایجنسیوں کے حمایت یافتے تھے۔ سنہ 1996 کے وسط میں کا گامے واشنگٹن گیا جہاں سے اشارہ مل گیا کہ موبوتو کو ہٹا دو، امریکہ ساتھ ہے۔ اسی دوران امریکی سی آئی اے اور ڈیفسن اٹیلی جنس ایجنسی نے روانڈا اور یوگنڈا کو سیٹلائزٹ تصاویر اور کمیونیکیشن اسٹریپٹس فراہم کیے۔

اکتوبر 1996 میں روانڈا اور یوگنڈا کی فوجیں، کانگولی باغیوں کے بھیں میں، زائر میں داخل ہوئیں۔ ایک نیا گروپ بنایا گیا جسے الائنس آف ڈیموکریٹک فورسز فار لبریشن آف کانگو زائر کہا گیا اور اس کا سربراہ لوران کابیلا کو بنایا گیا۔ یہ سی آئی اے کا منصوبہ

تھا تاکہ حملہ مقامی بغاوت لگے۔ چند ہفتوں میں یہ افواج کمپاؤن پر چڑھ دوڑیں۔ لاکھوں ہو تو شہری مارے گئے۔ ہزاروں کو جنگلوں میں بھگا دیا گیا جہاں وہ بھوک اور بیماری سے مر گئے۔ امریکی حکومت نے ابتداء میں روانڈا کے کردار سے انکار کیا لیکن انکار محض سفارتی پرداز تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ امریکی فضائیہ کے سی ون تھرٹی طیارے اس وقت علاقے کی فضائی نگرانی کر رہے تھے اور ان کی معلومات روانڈا کو دی جا رہی تھیں۔

جب یہ فوجیں دارالحکومت کنشا سا کے قریب پہنچیں تو امریکہ نے کھل کر سیاسی دباؤ ڈالا۔ گھنٹن انتظامیہ کے نمائندے بل رچرڈسن نے موبوتو کو پیغام دیا کہ استعفی دو یا زبردستی ہٹا دیے جاؤ گے۔ متی 1997 میں موبوتو ملک چھوڑ گیا اور لوران کابیلا کو صدر بنادیا گیا۔ کانگو کا نیا نام ڈیموکریٹک ریپبلک آف کانگو رکھا گیا۔ مگر چند ہی ماہ بعد کابیلا نے اپنے سرپرستوں کو نکالنے کی کوشش کی۔ اس نے ملک سے تمام غیر ملکی فوجیں واپس بلائیں۔ جواب میں روانڈا اور یوگنڈا نے دوسری جنگ شروع کر دی جو پورے وسطی افریقہ میں پھیل گئی۔

یہ دوسری کانگو جنگ تھی۔ اس میں آدھا افریقہ شامل ہو گیا۔ انگولا، زمبابوے اور نمیبیا نے کابیلا کا ساتھ دیا۔ روانڈا اور یوگنڈا نے نئے باغی گروپوں کو سہارا دیا۔ اصل مقصد کانگو کے معدنی وسائل پر قبضہ تھا۔ ہیروں، سونے، کولٹن اور لکڑی کی لوٹ مچی رہی۔ روانڈا اور یوگنڈا کے فوجی مشرقی کانگو کے بڑے حصے پر قابض ہو گئے۔ ان علاقوں سے نکلنے والی معدنیات عالمی مارکیٹ میں جاتی رہیں۔ امریکہ نے دونوں ممالک کو مالی اور عسکری امداد جاری رکھی۔ امریکی فوجی تربیتی پروگرام IMET کے تحت روانڈا کے افسران کو باقاعدہ تربیت دی جاتی رہی۔

ان برسوں میں انسانیت کا بدترین الیہ برپا ہوا۔ بھوک، بیماری اور قتل و غارت سے کروڑوں لوگ مر گئے۔ عورتوں کے ساتھ اجتماعی زیادتی عام ہو گئی۔ بچوں کی فوجی بھرتی کی گئی۔ سینکڑوں گاؤں جلا دیے گئے۔ اقوام متحده کی رپورٹوں میں روانڈا اور یوگنڈا دونوں کے فوجیوں کو سنگین جرم میں ملوث پایا گیا مگر امریکہ نے ہمیشہ ان روپوں کو کمزور کرنے کی کوشش کی کیونکہ یہ دونوں ممالک اس کے اتحادی تھے۔ اس سب ظلم کے پچھے امریکہ کی بدنام زمانہ سی آئی اے تھی۔

سنہ 2003 میں سن سٹی معاهدے کے بعد جنگ بظاہر ختم ہو گئی۔ ایک عبوری حکومت بنی مگر حقیقت میں مشرقی کانگو اب بھی روانڈا اور یوگنڈا کے اثر میں رہا۔ بعد میں جب ایم تیکس نامی نیا گروہ ابھر ا تو پتہ چلا کہ اس کے پچھے بھی روانڈا یعنی سی آئی اے کی

سرپرستی تھی۔ سنہ 2010 کی اقوام متحده رپورٹ میں صاف لکھا گیا کہ روانڈا کی افواج نے منظم نسل کشی کی مگر عالمی برادری نے کوئی کارروائی نہیں کی۔

آج بھی مشرقی کانگو میں قتل و غارت جاری ہے۔ ایم تیس دوبارہ فعال ہے۔ روانڈا کے فوجی اب بھی اندر داخل ہو کر کارروائیاں کرتے ہیں۔ چین افریقہ میں امن اور ترقی کیلئے کوشش ہے جبکہ امریکہ معدنی وسائل کی دوڑیں مصروف ہے اس لیے کانگو کی تباہی سے نظریں چراہا ہے۔ وہی معدنیات جو کولٹن اور کوبالت کی شکل میں ہمارے موبائل اور بیٹریوں میں جاتی ہیں انہی زمینوں سے نکالی جاتی ہیں جن پر لاکھوں لوگ مارے گئے۔

-----فائل 23-AF کا اختتام-----

ملک: اریٹریا

سال: 2002

فائل: AF-24

---

سنہ 2002 میں جب امریکہ نے افریقہ میں اپنی نئی فوجی کمانڈ AFRICOM قائم کی تو تقریباً پورا برا عظم اس کے ساتھ تعاون پر تیار تھا۔ لیکن صرف ایک چھوٹے سے ملک نے دو ٹوک جواب دیا۔ اس ملک کا نام اریٹریا تھا۔ صدر عسیلس افورقی نے اعلان کیا کہ اریٹریا اپنی سر زمین پر کسی غیر ملکی فوجی اڈے کی اجازت نہیں دے گا۔ نہ کوئی امریکی فوجی اڈہ، نہ مشترک مشقیں، نہ انٹیلی جنس تعاون۔ یہ اعلان اس وقت کیا گیا جب امریکہ اپنے آپ کو دنیا کی واحد سپرپاور سمجھتا تھا۔ امریکی اس بات کو کیسے برداشت کرتے؟

اریٹریا وہ ملک تھا جو کبھی آزادی کی مثال سمجھا جاتا تھا۔ تین دہائیوں کی جدوجہد کے بعد 1993 میں اس نے ایتحوپیا سے آزادی حاصل کی تھی۔ شروع میں اسے ایک آزاد اور باوقار ریاست کے طور پر دیکھا جاتا تھا لیکن جلد ہی اس پر امریکہ کا سایہ پڑ گیا۔ امریکہ نے جب 2002 میں افریقہ میں اپنی نئی فوجی موجودگی کی بنیاد رکھی تو ہبانہ "نام نہاد و ہشت گردی" کے خلاف جنگ" کا تھا اور مقصد اس جنگ کے نام پر پورے برا عظم پر اپنا اثر و رسوخ بڑھانا تھا۔ لیکن اریٹریا نے صاف کہہ دیا کہ وہ کسی نئے نوآبادیاتی کھیل کا حصہ نہیں بنے گا۔

سنہ 2005 اور 2006 میں امریکہ ایتحوپیا کو صومالیہ کے خلاف امداد، انٹیلی جنس اور لاجستک سہولتیں دے رہا۔ اریٹریا نے صومالیہ کی مدد کی، واشنگٹن نے اس ہانے کو غنیمت جانا۔ اسی دور میں امریکی وزیر خارجہ کونڈولیزازار ائس نے خفیہ ہدایت دی کہ اریٹریا کے خلاف عالمی سطح پر پابندیوں کی تیاری کی جائے۔ اس منصوبے کا مقصد ہشت گردی ختم کرنا نہیں بلکہ اریٹریا کو سبق سکھانا تھا کہ امریکی فوجی پالیسیوں سے انکار کی کیا قیمت ہوتی ہے۔

سنہ 2009 میں وہ موقع آگیا۔ امریکہ نے افریقی یونین کے ذریعے دباؤ ڈالا کہ اقوام متحده سے اریٹیریا پر پابندیاں منظور کروالیں۔ قرارداد 1907 کے تحت اس کے رہنماؤں پر سفری پابندیاں، اثنائے منجمد کرنے اور ہتھیاروں کی خرید پر پابندی لگادی گئی۔ بظاہر الزام یہ تھا کہ اریٹیریا الشباب کو اسلحہ فراہم کرتا ہے مگر اقوام متحده کی اپنی روپورٹوں میں اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔ اصل مقصد سیاسی تھا۔ امریکہ نے اریٹیریا کو خطے کا بدمعاش ملک قرار دے کر اسے عالمی سطح پر تنہا کر دیا۔ یاد رہے کہ حال ہی میں جب امریکہ نے یو ایس ایڈ کو ختم کیا تو ایک سینیٹ ہیرنگ میں امریکی حکام نے تسلیم کیا کہ یو ایس ایڈ الشباب، القاعدہ، داعش سمیت دنیا بھر کی دہشتگرد تنظیموں کو مالی امداد دیتی رہی ہے۔ الجولانی کا قصہ تو ابھی کل کی بات ہے۔

اسی دوران امریکی سیٹلاتٹ انٹلی جنس اداروں نے اریٹیریا کی فوجی نقل و حرکت، بندگاہوں اور بارڈر کی مسلسل نگرانی شروع کر دی۔ ہر تصویر، ہر اشارہ اریٹیریا کے خلاف شواہد کے طور پر پیش کیا گیا۔ لیکن برسوں گزر گئے اور کوئی ٹھوس ثبوت سامنے نہیں آیا۔ اریٹیریا نے اقوام متحده کی ٹیموں کو داخل ہونے سے روک دیا کیونکہ ان پر امریکی اثر و رسوخ کا الزام تھا۔ مغرب نے اسی کو اریٹیریا کی نافرمانی قرار دے کر مزید پابندیاں لگادیں۔

پابندیوں نے اریٹیریا کی میشہت توڑ کر رکھ دی۔ اس کے پاس روسری دور کا پرانا اسلحہ ہی باقی رہ گیا۔ یہ نکوں نے لین دین روک دیا۔ غیر ملکی سرمایہ کار کان کنی کے منصوبوں سے پچھے ہٹ گئے۔ سیاحت ختم ہو گئی۔ حکومت اس دباؤ کے تحت نہایت برے حالات میں جکڑ گئی۔

پابندیاں ایک دو نہیں بلکہ تین بار بڑھائی گئیں۔ اقوام متحده کے ماہرین ہر بار بھی لکھتے کہ کوئی نیا ثبوت نہیں ملا، لیکن امریکہ ہر بار نئی توجیہ دے کر توسعہ کروالیتا۔ ایک لیک شدہ سفارتی خط میں امریکی اہلکاروں نے خود تسلیم کیا کہ یہ پابندیاں تنکیکی نہیں بلکہ سیاسی ہیں۔ اصل مستسلہ اریٹیریا کا امریکی فوجی منصوبوں میں حصہ نہ لینا تھا۔

پھر 2018 میں ایک غیر متوقع موڑ آیا۔ ایتھوپیا کے نئے وزیر اعظم ابی احمد نے اریٹیریا کے ساتھ یہ میں سال پر اُن سرحدی تنازعے کو ختم کر دیا۔ سعودی عرب اور متحده عرب امارات کی ثالثی میں امن معاهدہ ہوا۔ اقوام متحده کی روپورٹ میں صاف لکھا گیا کہ اریٹیریا الشباب کی مدد نہیں کر رہا۔ امریکہ کو اپنی مرضی کے خلاف اقوام متحده کی قرارداد و اپس یعنی پڑی۔ مگر واشنگٹن نے ووٹ دینے کے بعد جائے صرف غیر حاضری اختیار کی تاکہ اپنا موقف بدلنے کا تاثر نہ جائے۔

پابندیاں ختم ہوئیں لیکن نگرانی ختم نہیں ہوتی۔ امریکی بھری جہاز اب بھی اریٹیریا کے ساحلوں کے قریب گشت کرتے ہیں۔ سیمیلائٹ نگرانی جاری ہے۔ 2020 میں جب اریٹیریا نے ایتھوپیا کے ساتھ ٹگرانے کے باعیوں کے خلاف لڑائی میں حصہ لیا تو ایک بار پھر مغرب نے انسانی حقوق کے نام پر نتی پابندیاں لگانے کی کوشش کی۔ امریکہ نے وزیر اپابندیاں، امداد کی معطلی اور اریٹیریا کی حکمرانی جماعت پر مالی قد غنیمیں لگائیں۔

آج اریٹیریا پر اقوام متحده کی پابندیاں نہیں گر امریکہ کی یک طرف پابندیاں بدستور قائم ہیں۔ واشنگٹن اب بھی اسے سبق سکھانے کے موڈیں ہے۔ اس نے افریقی فوجی اتحاد IGAD میں اریٹیریا کی واپسی کو شک کی نظر سے دیکھا۔ اریٹیریا نے روس، چین اور عرب ممالک سے نئے تعلقات قائم کیے ہیں۔ اس کا بندرگاہی شہر عصب اب مشرق و سلطی اور افریقہ کے بیچ ایک نیا اسٹریجنگ پوائنٹ بن رہا ہے۔

اریٹیریا نے دو دہائیوں تک اپنی خود مختاری کی بھاری قیمت ادا کی ہے۔ امریکہ کے لیے سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ ایک افریقی ملک نے اس کے فوجی اسجنڈے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اور آج بھی یہی جرم اریٹیریا کا سب سے بڑا جرم ہے۔ طاقت کے کھیل میں آزادی کی قیمت بہت زیادہ رہی ہے، لیکن اریٹیریا ابھی تک خوش قسمت ثابت ہوا ہے۔

-----فائل AF-24 کا اختتام-----

ملک: وسطی افریقہ

سال: 2003

فائل: AF-25

---

پندرہ مارچ 2003 کی صبح وسطی افریقہ کے دارالحکومت بالگوئی میں اچانک ٹینکوں اور مسلح گاڑیوں کا شور سنائی دیا۔ صدر آنڈھ فیلکس پاتا سے اس وقت ایک سربراہی اجلاس میں شریک تھے، اور ان کی غیر موجودگی میں جزل فرانسوابوزیز کی فورسز نے بغیر کسی مراجحت کے اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ دنیا نے اسے ایک عام فوجی بغاوت سمجھا، مگر دراصل یہ ایک منظم آپریشن تھا جس کے عپर فرانس کی سازش تھی۔

یہ کہانی صرف ایک بغاوت کی نہیں بلکہ یورینیم کے ان ذخائر کی ہے جہوں نے فرانس اور وسطی افریقہ کے تعلقات کو آزادی کے دن سے ہی طے کر رکھا تھا۔ سنہ 1960 میں جب فرانس نے وسطی افریقہ کو آزادی دی تو بظاہر یہ ایک خود مختار ملک بن گیا، مگر درحقیقت فرانس نے خفیہ معاهدوں کے ذریعے تمام "اسٹریجیک معدنیات" یعنی یورینیم پر پہلا حق اپنے پاس محفوظ رکھا۔ یورینیم وہ ایندھن ہے جو فرانس کے ایٹمی ہتھیاروں اور اس کی ستر فیصد بجلی کا ذریعہ ہے۔ اس لیے اس کے لیے وسطی افریقہ کی سرزین جوہری خزانے کی تجویز تھی۔

سنہ 1970 کی دہائی میں فرانسیسی ماہرین نے ملک کے جنوب مشرقی ضلع بکوما میں یورینیم کے غیر تسلیم شدہ ذخائر دریافت کیے، مگر سیاسی عدم استحکام اور مقامی بادشاہ بکا سا کی غیر یقینی پالیسیوں کی وجہ سے کان کنی شروع نہ ہو سکی۔ پیرس کے لیے ہر صدر محض ایک چوکیدار کی حیثیت رکھتا تھا جس کا کام اس خزانے کی چابی سنبھالنا تھا، اور جس دن اس سے چابی کی حفاظت کرنا مشکل ہو جاتا وہ صدر فرانس کیلئے بے کار ہو جاتا۔

سنہ 1993 میں جب آنڈھ فیلکس پاتا سے انتخابات جیت کر صدر بننے تو انہوں نے فرانس کے اس غیر اعلانیہ قبضے کو چیلنج کرنا شروع کیا۔ دو ہزار ایک میں جب آئی ایم ایف نے ان کی حکومت کو مالی امداد سے محروم کیا تو انہوں نے جنوبی افریقہ، لیبیا اور روسی

کمپنیوں کو کان کنی کی پیشکش کرنے کا عندیہ دیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب فرانس کے کان کھڑے ہو گئے۔ اسی دوران انہوں نے اپنی فوج کے سربراہ فرانسو بوزیزے کو برطرف کیا جو دراصل ایک نئے بغاوتی منصوبے پر کام کر رہا تھا۔ بوزیزے چاڑ بھاگ گیا جہاں صدر اور اسیں دبی نے اسے تربیت اور اسلحہ فراہم کیا۔

فرانس نے پاتا سے کو اقتدار سے ہٹانے کا حکم دیا اور فرانس کے خفیہ ادارے اس دوران یورینیم کی پٹی کے نقشے تیار کر رہے تھے۔ پھر فوری 2003 میں فیصلہ کن قدم اٹھایا گیا۔ بوزیزے کے آٹھ سو جنگجو دار الحکومت کی جانب بڑھ رہے تھے مگر ان کے پاس ایندھن اور اسلحہ کی کمی تھی۔ دس مارچ کی رات ایک فرانسیسی فوجی طیارہ چاؤ کی سر زمین پر اترا اور بوزیزے کی فورسز کو تیس ٹن ایندھن، راکٹ لاپچر اور فرانسیسی مشیروں کی ایک ٹیم فراہم کی۔ دو دن کے اندر فرانسیسی ہیلی کا پڑ اسلحہ بانگلوئی کے قریب پہنچا رہے تھے، اور شہر کی حفاظت پر مأمور افریقی امن فوج کو ہدایت مل چکی تھی کہ کسی قسم کی مزاحمت نہ کی جائے۔

پندرہ مارچ کو بوزیزے کی فوج جب بالگوئی پہنچی تو راستہ بالکل صاف تھا۔ فرانس نے ہوانی اڑا اور صدر اتی محل پر قبضہ کر کے اقتدار کی منتقلی مکن بنائی۔ صرف تین دن بعد بوزیزے نے ایک خفیہ معابدے پر دستخط کیے جس کے تحت فرانس کی سرکاری ایٹمی کمپنی آریوا کو بکوما کے اٹھارہ ہزار مربع کلومیٹر کے علاقے میں خصوصی کان کنی کے حقوق دے دیے گئے۔ بدلتے میں فرانس نے تی حکومت کو بین الاقوامی سطح پر تسلیم کروایا اور فوری فوجی امداد فراہم کی۔

سنہ 2006 میں آریوا نے مقامی کمپنی کے ذریعے یورینیم کی تلاش شروع کی۔ الگے دو برس میں یہ ثابت ہو گیا کہ وہاں اتنے ذخائر ہیں جو فرانس کے ری ایکٹروں کو پانچ سال تک ایندھن فراہم کر سکتے ہیں۔ فرانس نے ان وسائل کو ایک کینڈین شیل کمپنی کے ذریعے اپنے کنٹرول میں رکھا تاکہ اسے نجی کاروبار کا رنگ دیا جاسکے۔

ان واقعات کے بعد ملک میں ایک نیا نظام قائم ہوا جس میں فوج اور معيشت دونوں چند قبانی گروہوں کے ہاتھوں میں چلے گئے۔ یورینیم کے راستوں پر چیک پوسٹیں بن گئیں جہاں مقامی لوگوں سے بھتہ لیا جاتا تھا۔ شمالی علاقے، جو پہلے ہی نظر انداز تھے، اب فوجی زون بن گئے جہاں سینکڑوں لوگ مارے گئے۔ یہ سب فرانس نے اپنے مفادات کی خاطر کروایا۔

علاقائی سطح پر اس بغاوت نے ایک واضح پیغام دیا کہ فرانس اپنی جوہری توافقی کے لیے افریقہ کے کسی بھی ملک میں مداخلت کرنے سے دربغ نہیں کرے گا۔ جنوبی افریقہ نے اسے نوآبادیاتی لوٹ مار قرار دیا، اور جب 2013 میں بوزیزے خود بغاوت کا شکار ہوا تو افریقی یونین نے وہاں دوبارہ فوج بھیجنے سے انکار کر دیا۔

آج بکوما کے ذخائر ابھی تک زین کے نیچے ہیں، مگر ان کے حقوق اب بھی فرانس کی کمپنی اور انوکے پاس ہیں۔ نئے قوانین میں بھی وہی شقیں ہیں جو 1960 کے معاهدوں میں لکھی گئی تھیں۔

-----فائل AF-25 کا اختتام-----

ملک: صومالیہ

سال: 2006

فائل: AF-26

---

دسمبر 2006 میں جب ایتھوپیا کے ٹینک صومالیہ کی سر زمین پر داخل ہوئے تو دنیا نے اسے ایک عام فوجی مداخلت سمجھا، مگر حقیقت میں یہ وہ لمحہ تھا جس نے پورے مشرقی افریقہ کا سیاسی اور سلامتی کا نقشہ بدل دیا۔ ایتھوپیا کی فوج نے صرف ایک حکومت گرانے کے لیے سرحد عبور نہیں کی تھی بلکہ ایسی جنگ کو جنم دیا جس نے اس خط کو ایک مسلسل آگ میں جھونک دیا۔

صومالیہ کی کہانی ہمیشہ قبائل، طاقت اور مزاحمت کے گرد گھومتی رہی ہے۔ سنہ 1960 میں جب یہ ملک برطانیہ اور اٹلی سے آزاد ہوا تو ابتداء میں ایک جمہوری حکومت قائم ہوئی مگر زیادہ دیر نہ چل سکی۔ سنہ 1969 میں جزل محمد سیاد بری نے اقتدار پر قبضہ کیا اور اگلے بیس سال تک ملک کو آہنی ہاتھ سے چلایا۔ وہ قبائل کے درمیان توازن قائم رکھ کر حکومت کرتے رہے، مگر یہی پالیسی آخر کار ان کے زوال کی بنیاد بنا۔ سنہ 1991 میں ان کی حکومت گرفتی اور صومالیہ کل مل طور پر ٹوٹ گیا۔ کوئی مرکزی حکومت باقی نہ رہی، ملک درجنوں جنگی سرداروں میں تقسیم ہو گیا اور عوام قحط، شدد اور بدمانی کے عذاب میں بتلا ہو گئے۔

اسی خلائیں 2005 کے آخر میں ایک نیا نظام ابھرنا شروع ہوا۔ یہ کوئی فوجی طاقت نہیں بلکہ شریعت پر بنی مقامی عدالتوں کا اتحاد تھا جسے اسلامی عدالتوں کا اتحاد کہا جاتا ہے۔ ابتداء میں ان عدالتوں کو تاجروں اور مقامی عماندین نے محض انصاف اور سکیورٹی فراہم کرنے کے لیے بنایا تھا، مگر وقت کے ساتھ یہ ایک متحد قوت بن گئیں۔ سنہ 2006 کے وسط تک انہوں نے موغادیشو پر قبضہ کر لیا، جنگی سرداروں کو شکست دی، بندرگاہ اور ہوائی اڈہ دوبارہ کھول دیے اور عام شہریوں کو برسوں بعد امن کی سانس ملی۔ مگر اسی کے ساتھ ان عدالتوں کے اندر ایسے گروہ بھی شامل تھے جنہیں مغرب نے سوویت یونین کے خلاف لڑنے

کیلنے جہاد اور شدت پسندی کا سبق پڑھایا تھا۔ وہ پورے خطے میں اسلامی حکومت کے خواب دیکھتے تھے۔ ایتحوپیا پر امریکہ کا گہرا اثر تھا۔

موقع ملتے ہی امریکہ نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لیا۔ سنہ 2006 کے آغاز میں سی آئی اے نے خفیہ طور پر صومالی جنگی سرداروں کے ایک گروہ کو فنڈ زدینا شروع کیے تاکہ وہ اسلامی عدالتون کو ختم کریں۔ مگر نتیجہ اٹانکلا۔ عوام نے غیر ملکی مداخلت کے خلاف اتحاد کر لیا اور اسلامی عدالتون نے چند ہفتوں میں امریکی حمایت یافتہ اتحاد کو مکمل طور پر شکست دے دی۔ جون 2006 میں موغادیشو کی دوسری جنگ میں سی آئی اے کی پوری حکمت عملی زین بوس ہو گئی۔

ابتدائی ناکامی کے بعد ستمبر 2006 میں ایتحوپیا نے امریکی اشارے پر صومالیہ پر بھر پور حملہ کر دیا۔ چند دنوں کی لڑائی میں اسلامی عدالتون کی فوجیں پسپا ہو گئیں، اور ایتحوپیا نے عبوری صومالی حکومت کو دارالحکومت میں بٹھا دیا۔ مگر یہ فتح کاغذی ثابت ہوتی۔ عوام کے دلوں میں ایتحوپیا کی موجودگی نے غصے کی آگ بھڑکا دی، اور اسی آگ سے ایک نئی اور خطرناک تحریک نے جنم لیا جس کا نام تھا الشabaab۔ ہمیشہ کی طرح امریکی مداخلت کے بدترین نتائج سامنے آئے۔ حال ہی میں امریکی حکام نے یہ ایڈ کے تحت الشabaab کو فنڈنگ کرنے کا اعتراف بھی کیا ہے۔

الشabaab اسلامی عدالتون کی پسپائی کا رد عمل تھا، جو ایتحوپیا کی مداخلت کے بعد ایک علیحدہ تنظیم کے طور پر ابھرا۔ اس نے خود کو ایک مذہبی اور قومی مزاجحتی قوت کے طور پر پیش کیا۔ سنہ 2007 سے 2009 کے درمیان الشabaab نے ایتحوپیا اور عبوری حکومت کے خلاف خوفناک گوریلا جنگ شروع کی۔ خودکش حملے، گھات لگا کر حملے، اور شہروں میں مسلسل لڑائی نے موغادیشو کو ملبے کے ڈھیر میں بدل دیا۔ ہزاروں لوگ مارے گئے، لاکھوں بے گھر ہوئے، اور صومالیہ ایک بار پھر قحط اور خانہ جنگی کی لپیٹ میں آگیا۔

یہ جنگ نہ صرف صومالیہ بلکہ پورے مشرقی افریقہ کے لیے ایک طویل المیرہ ثابت ہوئی۔ الشabaab نے رفتہ رفتہ پورے جنوبی صومالیہ پر کثروں قائم کر لیا اور ٹیکسوس ذریعے اپنی میشست بنالی۔ ایتحوپیا کی فتح محض چند ماہ کی مہماں ثابت ہوئی، کیونکہ ان کے اخلاق کے بعد پورا ملک الشabaab کے قبضے میں چلا گیا۔ اس دوران عبوری حکومت غیر ملکی فوجیوں کے سہارے قائم رہی، اور افریقی یونین کی امن فوج کو صومالیہ میں تعینات کرنا پڑا۔

یہ سب کچھ ایک ایسے عمل کا نتیجہ تھا جو دراصل دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر شروع کیا گیا تھا۔ امریکہ نے جن جنگی سرداروں کو پیسہ دیا، انہی کی تباہی نے الشاب کو جنم دیا۔ ایکھوپیا جس خطرے کو ختم کرنے آیا تھا، وہ خطرہ کئی گناہ بڑھ گیا۔ آج الشاب نہ صرف صومالیہ بلکہ کینیا اور یونڈا جیسے ممالک میں بھی حملے کر رہا ہے۔ موغادیشو میں اب بھی خودکش دھماکوں اور حملوں کا خطرہ روزمرہ زندگی کا حصہ ہے۔

سنہ 2006 کے امریکی فصیلے آج بھی پورے خطے کو قیمت ادا کرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ صومالیہ کی حکومت اب بھی یرومنی امداد پر قائم ہے اور عوام کا اعتماد حاصل نہیں کر سکی۔ امن مشن کے ہزاروں فوجی اب بھی صومالیہ میں موجود ہیں، مگر الشاب اپنی گرفت برقرار رکھے ہوئے ہے۔

-----فائل AF-26 کا اختتام-----

ملک: ڈیگر

سال: 2009

فائل: AF-27

مارچ 2009 میں صرف تین دن کے اندر ایک منتخب صدر کو ہٹا کر ایک ڈسک جاکی کو اقتدار میں لایا گیا۔ فوج نے بنوادی اٹھائی، صدارتی محل پر قبضہ کیا، اور یونی طاقتوں نے چپ چاپ تمثیل دیکھا۔ ڈیگر میں یہ سب کچھ ایسے منظم انداز میں ہوا جیسے کسی نے پہلے سے پورا اسکرپٹ لکھ رکھا ہو۔

یہ کہانی ایک ایسے ملک کی ہے جو کہنے کو تو آزاد تھا مگر اصل میں اپنے سابق نوابادیاتی مالکوں کے جال سے کبھی نہیں نکل پایا تھا۔ فرانس نے ڈیگر کو سنہ 1960 میں آزادی دی، مگر کرنی، تعلیم، فوجی تربیت اور معیشت سب کچھ اپنے کنٹرول میں رکھا۔ فرانس کے سفارتخانے میں دفاعی مشیروں کا ایک مستقل سیل بیٹھا رہتا تھا جو صدر سے لے کر جزل تک سب پر اثر رکھتا تھا۔ پھر سنہ 2002 میں ایک نیا چہرہ سامنے آیا، مارک راوالمانانا، ایک کاروباری شخص جس نے مقامی دودھ کی فیکٹری سے اپنی سیاست شروع کی اور تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا آگے بڑھا۔ راوالمانانا فرانس سے بہت کر امریکا، چین اور جنوبی کوریا سے تعلقات بڑھانے لگا۔ اس نے ملک کو جنوبی افریقہ کی ترقیاتی کمیونٹی میں شامل کیا، اور واشنگٹن کے ساتھ ملینیم چیلنج اکاؤنٹ پر دستخط کیے۔ فرانس کو اپنے غلاموں کی خود مختاری کیسے اچھی لگ سکتی تھی؟

سنہ 2008 میں جب راوالمانانا نے فرانسیسی سفیر کو ملک بدر کیا تو پیرس نے مددوک دی اور ایک نیا کھلاڑی ڈھونڈنا شروع کیا۔ یہ شخص تھا انتناریو و کا نوجوان میر، انٹری راجولینا، جو پہلے ڈسک جاکی رہ چکا تھا۔ فرانسیسی سفارتکاروں نے اس کے ساتھ خفیہ ملاقاتیں شروع کیں۔ اسی دوران فرانسیسی فوجی مشیروں نے اس کے ذاتی محافظوں کو تربیت دینا شروع کر دی۔ دوسری طرف امریکی افریقہ کمانڈ نے بھی ڈیگر کی فوج کے کچھ نوجوان افسروں کو اپنے استاف کالجوں میں تربیت کے موقع دیے۔ انہی

افسروں میں دونام بعد میں منظر عام پر آئے، کرنل آندرے آندریا راجونا اور کرنل چارلس آندریانا۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں دارالحکومت کے ایلیٹ پیراٹروپریونٹ کا کنٹرول تھا۔

چنگاری اس وقت بھڑکی جب حکومت نے دسمبر 2008 میں راجولینا کے ٹی وی چینل کو بند کر دیا۔ راجولینا نے ہڑتاں کی کال دی، ہجوم کو سڑکوں پر نکلنے کا بندوبست پہلے ہی کر لیا گیا تھا، سرکاری عمارتیں جلا دی گئیں، اور سات فوری کو صدارتی گارڈز نے فائزگر کر کے اکتیس افراد مار ڈالے۔ یہ ڈرامہ مغربی سامراج ماضی میں دنیا بھر کے ملکوں میں سیکٹروں بارہ براچکا تھا، انہیں فساد کروانے کی بہت پریکش تھی۔ وزیر دفاع نے استعفی دیا، اور فوج کے سربراہ نے الٹی یہ میم ڈیا کہ اگر سیاست داؤں نے حالات نہ سنبھالے تو فوج مداخلت کرے گی۔ انہی دونوں فرانسیسی مشیروں نے پیراٹروپریونٹ کے افسروں سے کہا کہ وہ عوام کو بچانے کے لیے کارروائی کریں۔

آٹھ مارچ کو فوجی بغاوت شروع ہوئی۔ پیراٹروپریونٹ نے کمپ پر قبضہ کیا اور اعلان کیا کہ وہ اب صدر کے احکامات نہیں مانیں گے۔ اگلے دن فرانسیسی سفارتخانے میں راجولینا کو لاایا گیا جہاں اس نے بغاوت کے رہنمای افسروں سے ملاقات کی اور عبوری حکومت کا خاکہ تیار کیا۔ چند دن میں وزیر دفاع مستعفی ہو گئے، آرمی چیف کو بطرف کر دیا گیا، اور نیا فوجی سربراہ صدر کی اجازت کے بغیر مقرر کر دیا گیا۔ سولہ مارچ کو فوج نے صدارتی محل اور مرکزی بینک پر قبضہ کر لیا۔ صدر راو اومانانا نے خون خرابے سے پچنے کے لیے اقتدار ایک فوجی کو نسل کے حوالے کیا، مگر چند گھنٹوں میں وہی کو نسل اقتدار راجولینا کو سونپ کر خود پھیپھی ہٹ گئی۔

فرانس نے فوری طور پر نئے حکمران کو تسلیم کرنے کی مہم شروع کر دی۔ صدر نیکولا سرکوزی نے ہمیشہ کی طرح انتخابات کا مطالبہ کر کے خود کو جمہوری ثابت کیا اور ساتھ ہی مطالبہ کر دیا کہ نافرمان سابق صدر کو عدالت میں گھسیٹا جائے۔ فرانسیسی سفارتکاروں نے دوسرے افریقی ممالک پر دباؤ ڈالا کہ وہ راجولینا کو تسلیم کریں۔ امریکا نے بظاہر امداد معطل کر دی، مگر پس پرده تعلقات برقرار رکھے۔ امریکی محلہ خارجہ کے افسروں نے کانگریس کو بتایا کہ نئے حکمران نے امریکی مفادات کا خیال رکھنے کی یقین دہانی کر دی ہے، خاص طور پر بھرہنڈ کے نیوں راستوں اور نشیات مخالف پروگراموں کے سلسلے میں۔

ملک کے اندر حالات تیزی سے بگڑ گئے۔ افریقی یونین اور جنوبی افریقی تنظیم نے مٹغا سکر کی رکنیت معطل کر دی، بیرونی امداد رک گئی، اور معیشت منہ کے بل گر پڑی۔ دو لاکھ مزدور بیروزگار ہو گئے، غربت 76 فیصد سے بڑھ گئی، اور سرمایہ کار ملک چھوڑ گئے۔

فوج کو اقتدار کا مزہ لگ گیا۔ وہی افسر جو صدر کو گرا کر لائے تھے، اٹھارہ ماہ کے اندر دو بار خود راجولینا کے خلاف بغاوت کر چکے تھے۔ ہر بار فرانسیسی اور امریکی سفارتکار مداخلت کرتے اور بحران سلجھانے کا دعویٰ کرتے، مگر نتیجہ یہی نکلتا کہ عوام کی مرضی پھر پس منظر میں چلی جاتی۔

وقت گزرا مگر اثرات باقی رہے۔ سنہ 2010 میں نیا آئین لایا گیا جس نے صدر بننے کی عمر کی حد پینتیس سال کر دی تاکہ راجولینا آئندہ ایکشن لڑ سکے۔ وہ 2013 اور پھر 2018 کے انتخابات جیت گیا۔ سابق صدر جلاوطنی میں ہیں اور ان کی پارٹی بکھر چکی ہے۔ فوج اب سیاست کی اصل طاقت بن چکی ہے۔ افسر اب کھلے عام وزارتوں اور کانکنی کے ٹھیکوں پر بات چیت کرتے ہیں۔ فرانس کا فوج پر اثر قائم ہے کہ اب چین بھی میدان میں اچکا ہے اور اس نے پورے افریقہ کو تبادل راستہ دکھا دیا ہے۔ خوشحالی اور باہمی ترقی کی راستہ، عزت اور عدم مداخلت کا راستہ۔ یہ مغربی سامراج کیلئے پھلے چار سو سال میں کمیونزم کے بعد دوسرا بڑا چیلنج ہے۔

ڈغاسکر کا کیس مغربی مداخلت کا ایک کلاسیکل نمونہ ہے۔ پہلے کسی حکومت کو سفارتی طور پر تنہا کرو، پھر ایک ہلکے کردار کے کرپٹ شخص کی سیاست میں جگہ بناؤ۔ اسے پرموٹ کرو، فوج میں اپنی مرضی کی قیادت پیدا کرو اور انہیں خوب کھلاو پلاو، انکی ترقی میں انوسمٹ کرو، اور آخر میں اپنے تیار کئے ہوئے ججز پر مشتمل آئینی عدالت سے سب کچھ جائز قرار دلوادو۔ یہی فارمولہ آپ کو افریقہ سے لے کر ساوتھ امریکہ اور یورپ سے ایشیاء تک کامیابی سے استعمال ہوتا نظر آتا ہے۔

-----فائل 27-AF کا اختتام-----

ملک: ناٹھر

سال: 2010

فائل: AF-28

---

اٹھارہ فروری 2010 کی دوپہر ایک بجے نیامے کی گلیوں میں تین بکتر بند گاڑیاں صدارتی محل کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ دوپہر تین بجے تک صدر مامادو تانجا کو ہٹا دیا گیا تھا، فوج نے اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا اور اگلے ہی دن یورپیس کے اسٹاک ایلیچنچ میں فرانسیسی کمپنی آریوا کے شیئرز چار فیصد بڑھ چکے تھے۔ یہ کوئی عام فوجی بغاوت نہیں تھی، یہ بغاوت فرانس کی برسوں کی تیاری کا نتیجہ تھی جس کا مقصد ناٹھر کی یورپی نیم پر کنٹرول برقرار رکھنا تھا۔

ناٹھر افریقہ کے اُن چند مالک میں سے ہے جن کی زمین دنیا کے ایمنی ایندھن سے بھری پڑی ہے۔ فرانس نے 1957 میں ارت معاہدے، کرنی کنٹرول، فوجی تربیت، اور خفیہ تعلقات کے ذریعے اس نے ناٹھر کو اپنے اثر میں رکھا۔ چار دہائیوں تک ہر صدر نے وہی فارمولہ اپنایا۔ فرانس کی کمپنی آریوا کو کان کنی کی آزادی، اور بدالے میں بجٹ کی مدد، سکالر شپ اور سیکورٹی سپورٹ۔ پھر 1999 میں مامادو تانجا اقتدار میں آئے۔ ابتدا میں وہ بھی روایتی طرز پر چلتے رہے، مگر جیسے ہی 2006 میں یورپی نیم کی قیمت چار گنا بڑھ گئی، تانجا نے سوچا کہ اب وقت آگیا ہے کہ ناٹھر کو اس کی اپنی دولت کا زیادہ حصہ ملے۔ انہوں نے نیا ماننگ کوڈ منظور کرایا جس میں فرانسیسی کمپنی کی ٹیکس چھوٹ ختم کر دی گئی اور ریاست کا حصہ بڑھا دیا گیا۔ آریوا کی سی ای او این لوروجون خود نیامے آئیں، کبھی وعدے کیے، کبھی دھمکیاں دیں، مگر تانجا کا جواب ایک ہی تھا کہ ناٹھر کی دولت ناٹھری عوام کی ہے۔ دسمبر 2007 میں انہوں نے آریوا کے ملکی ڈائریکٹر کو ملک بدر کر دیا۔

پیرس میں الارم بج گیا۔ فرانس نے ناتجہر کا مالی محاصرہ کر دیا، فوجی پرزوں کی فراہمی میں رکاوٹیں ڈالیں، اور تانجا کو افریقہ فرانس سربراہی اجلاس میں مدعو نہیں کیا گیا۔ لیکن تانجا پچھے نہیں ہٹے۔ انہوں نے چین سے تین سو ملین ڈالر کا قرض لیا اور چینی کمپنی کے ساتھ ایک نیا کان کرنی معہدہ کیا۔ اس گستاخی نے فرانس کو پاگل بنادیا۔

اسی دوران تانجا تیسری مدت کے لیے صدر بننے کیلئے فیورٹ قرار دئے جا رہے تھے۔ اگست 2009 میں ایک نئے آئین کے تحت انہیں مزید تین سال کے لیے اقتدار مل گیا۔ مغربی افریقی تنظیم ایکوواس نے ناتجہر کی رکنیت معطل کر دی، امریکا نے امدادِ مسجد کر دی، اور فرانس تو ایسے موقع کی تلاش میں تھا۔ فوج میں سازشوں کے جال بننے جانے لگے۔ تانجا نے اپنے قریبی کرzn کو فوج کا سربراہ بنا کر سازش کو دبانے کی کوشش کی مگر افسران کو تیار کیا جا چکا تھا۔

اس دوران فرانسیسی اور امریکی فوجی مشیر ناتجہر کے کمپ ٹونڈیبی میں تربیت دے رہے تھے۔ ظاہر مقصد امن مشن کی تیاری تھا، مگر اصل کام حالات کا اندازہ لگانا تھا۔ کئی افسروں نے بعد میں بتایا کہ غیر ملکی مشیروں نے انہیں بار بار یاد دلایا کہ فوج کو ادارے کی ساکھ بچانی چاہیے۔ یہی بات بعد میں بغاوت کے نعرے میں بدل گئی۔

اٹھارہ فروری 2010 کو سب کچھ بہت منظم انداز میں ہوا۔ دوپہر ایک بجے پیر اٹروپریونٹ کے کمانڈر کرنل سالو دیجبو نے اپنے ساتھی افسروں کے ساتھ بغاوت شروع کی۔ صدارتی محل کا گھیراؤ کیا گیا۔ تھوڑی دیر فائزگ ہوئی، پھر محافظوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ دوپہر اڑھائی بجے سرکاری ریڈیو پر فوجی ترانے بجھنے لگے اور تین بجے کرنل دیجبو نے ٹوی پر آکر اعلان کیا کہ عوام کے مفاد میں اقتدار فوج کے ہاتھ میں چلا گیا ہے۔ چند گھنٹوں بعد آریوا کے شیئر زبڑھ گئے اور نئے فوجی رہنماء نے فرانسیسی سفیر کو یقین دہانی کرائی کہ تمام بین الاقوامی معہدے برقرار رہیں گے۔

اس بغاوت کے تین بڑے اثرات سامنے آئے۔ پہلا سفارتی اثر یہ تھا کہ ایکوواس اور افریقی یونین نے ناتجہر کی رکنیت معطل کر دی، ورلڈیونک نے امداد روک دی، مگر اس ڈکٹیٹر شپ کو فرانس نے مکمل حمایت فراہم کی اور امداد کا بہاؤ جاری رکھا۔ دوسرا اثر معاشی تھا۔ چند میہنوں میں آریوا نے دوبارہ وہی شرائط حاصل کر لیں جو تانجا نے ختم کی تھیں۔ ناتجہر کا حصہ کم ہو گیا اور فرانس کو ایک نیا دس سالہ معہدہ مل گیا۔ تیسرا اثر ادارہ جاتی تھا۔ فوج نے آئین میں ایسی شقیں شامل کر دیں جن سے آئندہ کسی صدر کو

ہٹانے کے لیے ٹینکوں کی ضرورت نہ رہے۔ فوج کا اثر آئین کے ذریعے قائم ہو جائے۔ کچھ یاد آیا آپ کو؟ اپنے اردوگرد ایسی آئینی دار درازیاں یاد کیجئے؟

سنہ 2012 میں نئے انتخابات ہوئے اور ماہماڈو ایسو فو صدر بنے، وہی شخص جسے فرانس سب سے قبل اعتماد سمجھتا تھا۔ یورینیم کی برآمدات بڑھ گئیں، مگر ناجائزی کے لحاظ سے دنیا کے آخری درجے پر پہنچ گیا۔ ارلت کے علاقے کے لوگ اب بھی بجلی کے بغیر ہیں جبکہ فرانس کے جوہری ری ایکٹر انہی کے یورینیم سے چل رہے ہیں۔

وہی فارمولہ ہے۔ ہر ملک پر آزمائی ہے یہ مگر مجال ہے لوگوں کو سمجھتی ہو۔ لوگ آج بھی مغربی جمہوریت پسندی، انسانی حقوق کی پاسداری اور آزادی اظہار، کا منtrapڑھ رہے ہیں۔ کونسی جمہوریت؟ کونسے انسانی حقوق؟ کونسا سیکولرزم؟ کہ ہر ہے آزادی اظہار؟ جس نے فرانسیسی کمپنیوں کے مفاد کو چیلنج کیا، وہ یا تو بطرف ہوا یا فوجی اصلاح کے نام پر ہٹا دیا گیا۔ سنہ 2023 میں جب صدر محمد بازوم نے کہا کہ وہ یورینیم معاهدے پر نظر ثانی کرنا چاہتے ہیں، تو محض چند ہفتوں بعد ان کے اپنے ہی صدارتی گارڈز نے انہیں گرفتار کر لیا۔ فوجی رہنمائی وہی جملہ دہرا یا جو 2010 میں دیکھو نے کہا تھا کہ ہم عوام کے مفاد میں قدم اٹھا رہے ہیں۔

باقی افریقی ممالک کی طرح ناجائز کی آزادی بھی صرف دکھوا ہے۔ آج بھی مغربی کارپوریشنز ایک پیچیدہ نظام بنانے کرنے کا ناجائز پر حکومت کر رہی ہیں۔ جو صدریہ حقیقت بھول جاتے، اسے جلدیا بدر بکتر بند گاڑیوں کی گرگڑاہٹ یادداشتی ہے کہ ناجائزین اصل طاقت اب بھی فرانس کے ہاتھ میں ہے، آج بھی پرانے مالکان کے وفادار عوام کو کنٹرول کرنے کیلئے ریاست کے اہم ترین عہدوں پر براجمن بیں۔

-----فائل 28-AF کا اختتام-----

# الشیعیا



كوریا	1
فیلپائن	2
انڈونیشیا	3
ایران	4
ویتنام	5
انڈونیشیا	6
لاوس	7
کوریا	8
ویتنام	9
انڈونیشیا	10
لاوس	11
کمبوڈیا	12
مشرقی تیمور	13
افغانستان	14
فیلپائن	15

# الشیعیا



---

افغانستان	16
عراق	17
پاکستان	18
فلسطین	19
شام	20
یمن	21
مالدیپ	22

---



ملک: کوریا

سال: 1945

فائل: AS-01

نو اگست 1945 کی رات تھی جب سرخ فوج کے ٹینکوں نے کوریا کے دریا ٹومن کو عبور کیا اور ایک ہفتے کے اندر ہیونگ یانگ کی سڑکوں پر جاپانی افسروں کی فانلیں جلا رہے تھے۔ تین ہزار کلو میٹر دور واشنگٹن میں دو امریکی افسروں ایک نیشنل جیو گراف کے نقشے پر لائیں کھینچ رہے تھے تاکہ سیول سوویت اثر سے بچ جائے۔ وہ دونوں کوریا کے بارے میں کچھ نہیں جانتے تھے، بس اندازے سے ایک لکھر کھینچی گئی ہے بعد میں 38 parallel کہا گیا۔ یہ وہ بے معنی سی لکھر تھی جو اگلے پچھتر بر سوں میں دنیا کی سب سے خطرناک سرحد بن گئی۔

یہ کہانی دراصل جاپانی تسلط کے خاتمے سے شروع ہوتی ہے۔ چالیس برس تک جاپان نے کوریا کو اپنی کالونی بنا رکھا تھا۔ کوریا جاپان کے لیے چاول اور مزدوروں کا ذریعہ تھا۔ جب جاپان ہارا تو پورے کوریا میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔ مقامی سطح پر عوامی کمیٹیاں بننے لگیں جنہوں نے جاپانی حکام کو ہٹایا، خوراک تقسیم کی اور ملک کا نظام سنہchal لیا۔ پندرہ اگست 1945 کو لیو وون ہیونگ نامی رہنمہ نے سیول میں آزادی کی تیاری کے لیے ایک مرکزی کمیٹی بنائی۔ چند ہفتوں میں یہ تحریک پورے ملک میں پھیل گئی۔

مگر نہ امریکہ نے ان کمیٹیوں کو تسلیم کیا نہ سوویت یونین نے۔ امریکہ کے جنرل ہاج انچون میں اترے تو ان کے پاس ایک حکم نامہ تھا کہ 38 parallel کے جنوب میں اب جاپانی حکومت کی جگہ امریکی فوجی انتظامیہ ہو گی۔ جنرل ہاج نے آتے ہی مقامی عوامی کمیٹیوں پر پابندی لگا دی، جاپانی پولیس افسران کو دوبارہ تعینات کیا اور واشنگٹن سے ایک پرانے جلاوطن سیاستدان سنگمن ری کو بلا یا تاکہ امریکی قبضے کو مقامی رنگ دیا جاسکے۔

جب روس نے امریکہ کو یہ سازش کرتے دیکھا تو انہوں نے شمال میں جاپانی حکام کو برطرف کر کے مقامی گوریلوں کو اسلحہ دیا جنہوں نے جاپان کے خلاف لڑائی میں حصہ لیا تھا۔ ان میں ایک نوجوان کمانڈر کم ال سنگ بھی تھا جو ایک قوم پرست کمیونسٹ لیڈر تھا اور کمیونسٹ حلقوں میں بہت عزت رکھتا تھا۔ چند مہینوں میں رو سیوں نے شمالی کوریا میں کمیونسٹ نظام قائم کر دیا، زمینیں ضبط کر کے کسانوں میں بانٹ دیں۔ کم ال سنگ کو عارضی حکومت کا سربراہ بنادیا گیا۔

سنہ 1946 تک دونوں خطوں میں مزاحمت شروع ہو گئی۔ جنوبی کوریا میں کسانوں اور مزدوروں نے امریکی قبضے کے خلاف بغاوت کر دی۔ اکتوبر میں تائگو کے علاقے میں مظاہرے پھوٹ پڑے جنہیں امریکی فوج نے سختی سے کچل دیا۔ سینکڑوں لوگ مارے گئے اور ہزاروں گرفتار ہوئے۔ یہ وہ لمحہ تھا جب جنوبی کوریا کی بائیں بازو کی تحریک کو شدید تشدد اور ظلم و جبر سے بچنے کیلئے زیر زین جانا پڑا۔ یوں جنوبی کوریا میں صرف وہی قیادت بچی جسے امریکیوں کی حمایت حاصل تھی۔

سنہ 1948 میں دونوں سائیڈز نے اپنا اپنا الیکشن کروایا جس سے کوریا انتظامی طور پر تقسیم ہو گیا۔ امریکہ نے جنوبی حصے میں انتخابات کرائے جن میں اپنی کٹھپتی سنگمن ری کو صدر بنوادیا۔ شمال میں عوام نے کم ال سنگ کو وزیر اعظم چنان۔ شمال نے پورے کوریا پر دعویٰ قائم رکھا اور پھر دونوں طرف فوجیں تیار ہونے لگیں۔ اگلے دو برسوں میں ہزاروں فوجی اور گوریلے 38 parallel پر ایک دوسرے سے لڑتے رہے۔

مغربی پروپیگنڈہ نے نفرت کی ایسی دیوار قائم کر دی جو آج بھی مضبوطی سے کھڑی ہے۔ جنوبی کوریا میں بائیں بازو کے خلاف بدترین کریک ڈاؤن ہوا، جزیرہ جیجو پر ہزاروں شہری مارے گئے۔ ایک طرف سرباہ دارانہ نظام اور امریکی امداد پر کھڑا جنوبی کوریا تھا، دوسری طرف سوویت ماذل پر بنی شمالی کوریا۔

وقت گزرتا گیا مگر اس تقسیم نے پورے خط کی سیاست کو بدل دیا۔ شمال نے بھاری صنعت اور فوجی طاقت پر زور دیا جکہ جنوب نے امریکی امداد اور برآمدی میشیت پر۔ سنہ 1960 کی بھائی میں شمال کی فی کسی بیدار جنوبی کوریا سے زیادہ تھی مگر جلد ہی جنوبی میشیت نے رفتار پکڑ لی۔ شمال میں کم ال سنگ کی بے لوث خدمت اور عوامی کردار نے عوام کے دل میں اس طرح جگہ بنائی کہ لوگ انہیں خدا کا درجہ دینے لگے۔ یہاں تک کہ عوام انکی نسلوں سے بھی محبت اور عقیدت کے رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔ جنوب میں سنگمن ری کی آمریت کے بعد فوجی حکومتوں کا سلسلہ چل نکلا جو 1980 کی بھائی تک قائم رہا۔

-----**فائل AS-01 کا اختتام**-----

ملک: فلپائن

سال: 1946

فائل: AS-02

چار جولائی 1946 کی رات، جب نیلا کی بندرگاہ پر آتش بازی ہو رہی تھی اور فلپائنی لوگ آزادی کا جشن منا رہے تھے، اسی وقت قریب ہی کے دلیلی علاقے کندا با سے تین سو کسان بندوقیں اٹھائے خاموشی سے نکلے۔ ان کا رخ چاول کے شہر سانتا ریتا کی طرف تھا۔ یہ لوگ اپنے آپ کو بکبلاہاپ کہتے تھے یعنی جاپانی قبضے کے خلاف عوامی فوج۔ مگر اس رات ان کا دشمن جاپان نہیں تھا بلکہ وہی جاگیر دار حکومت تھی جو آزادی کے بعد بھی امریکی نظام کی غلام بنی ہوئی تھی۔

یہ بغاوت اچانک نہیں ہوئی تھی۔ اس کی جڑیں ان زینوں میں بہت پرانی تھیں۔ سنہ 1940 تک فلپائن کے چاول کا آدھا حصہ صرف چار صبوں سے آتا تھا لیکن ان زینوں کا 62 فیصد صرف دو فیصد خاندانوں کے پاس تھا۔ جاگیر دار زیادہ تر نیلا میں رہتے اور ان کے کارندے کسانوں سے 70 فیصد تک فصل بطور کرایہ لے لیتے۔ جاپانی قبضے کے دوران یہ نظام بکھر گیا۔ جاگیر دار بھاگ گئے یا قابضوں کے ساتھ مل گئے، اور کسانوں نے اپنی خود مختار حکومتیں قائم کر لیں۔ ان کی عدالتیں، گودام اور ٹیکس نظام سب اپنے ہاتھ میں تھا۔ جب میک آر تھرا اپس آیا تو اسے ایک مکمل عوامی حکومت ملی۔ اس نے فوراً حکم دیا کہ ان باغیوں کو ختم کیا جائے۔

آزادی کے بعد بھی کچھ نہیں بدلا۔ جھنڈا ضرور بدل گیا مگر طاقت کے مراکزو ہی رہے۔ امریکہ نے نیا قانون منوایا جس کے تحت فلپائن کا پیسہ ڈال رہے بندھ گیا، امریکی کمپنیوں کو مقامی وسائل میں برابر کے حقوق مل گئے، اور آٹھ سال تک کسی امریکی مال پر ٹیکس نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ اس طرح میشت بر اہ راست واشنگٹن کے کنٹرول میں آگئی۔ صدرینوں روہاں، جو جاپانی قبضے کے وقت ان کا ساتھی تھا، اب امریکیوں کا قریبی ساتھی بن گیا۔ وہ امداد کے محتاج تھا، اور امریکہ کو اپنے اڈے رکھنے کے لیے ایک وفادار حکومت چاہیے تھی۔

تنازعہ اگست 1946 میں کنٹرول سے باہر نکل گیا۔ کسان رہنمای خوان فیلیو اور چار ساتھی حکومت سے شکایت کرنے جا رہے تھے کہ جاگیرداروں کی نجی فوجیں ان کے گاؤں جلا رہی ہیں۔ راستے میں انہیں روکا گیا، انہیں باندھ کر گئے کے کھینتوں میں گولیاں مار دی گئیں۔ اگلی صبح ان کی لاشیں ملیں۔ صدر رہباں نے کہا یہ ڈاکوؤں کا کام ہے مگر کسان جانتے تھے کہ یہ جاگیرداروں کے گن میں تھے۔ اسی دن لوتس تاروک نے حکومت کو خبردار کیا کہ اگر انصاف نہ ملا تو وہ دوبارہ جنگ شروع کریں گے۔ اور پھر وہی ہوا۔ چند میہنوں بعد حکومت نے ہک تحریک کو غیر قانونی قرار دے دیا۔

امریکہ نے فوراً مداخلت کی۔ ایک نیا مشاورتی فوجی گروپ میلائیں قائم ہوا جس کے سو سے زیادہ افسران تازہ تربیت لے کر آئے تھے۔ ہزاروں بندوقیں، مارٹر، گاڑیاں اور طیارے فلپائن کو ملے۔ مگر اصل ہتھیار جو میلائو کو دی گیا وہ خفیہ معلومات تھیں۔ امریکی خفیہ ادارے سی آئی اے نے دو لاکھ افراد کے ناموں کا ایک کارڈ انڈیکس تیار کیا جن پر مذاہمی تحریک کے ساتھ ہمدردی کا شک تھا۔ ریڈیو سمنزل سے باغیوں کے ٹھکانے پکڑے جاتے۔ ایک خفیہ ریڈیو چینل ہر رات دیہاتوں میں دھمکیاں نشر کرتا کہ جو ہک کو پناہ دے گا، مارا جائے گا۔

سنہ 1950 میں قسمت نے پلٹا کھایا۔ ایک امریکی ٹیم نے ماونٹ ارایت پر چھاپے مار کر تحریک کی مرکزی قیادت گرفتار کر لی۔ اس کامیابی کے بعد صدر نے رامون مکسیسائز کو وزیر دفاع بنایا، جو خود کبھی گوریلا رہ چکا تھا۔ مکسیسائز نے واشنگٹن سے مزید امداد مانگی، اور امریکہ نے ٹینک، بمبار طیارے اور تربیت یافتہ رجمنٹ بھیج دی۔ ساتھ ہی ایک نئی حکمت عملی شروع ہوئی۔ کسانوں کو ہتھیار ڈالنے پر چاول دیے جاتے، اور تاروک کو روس کا ایجنت کہا جانے لگا، حالانکہ امریکہ کی اپنی رپورٹس میں لکھا تھا کہ ہک کو نہ چین سے مدد مل رہی ہے نہ سوویت یونین سے۔ یہ مکمل طور پر فلپائن کے اندر اٹھنے والی تحریک تھی اور ایک ظالمانہ جاگیرداری نظام کی وجہ سے اٹھی تھی۔

جنگ آئسٹہ آئسٹہ بھنے لگی۔ مکسیسائز نے زین کی اصلاح کا ایک قانون جاری کیا جس سے ہک کا سیاسی اثر کم ہو گیا، اس قانون کا اثر بڑے جاگیرداروں پر نہ ہوا۔ امریکی امداد سے کنوئیں کھو دے گئے، اسکوں بنے، اور دیہاتوں میں ڈاکٹر بھیجے گئے۔ آخر کار سترہ مئی 1954 کو لوتس تاروک نے خود ہتھیار ڈال دیے۔ وہ میلائی کی عدالت میں پیش ہوا، جس کے ارد گرد امریکی ٹینک کھڑے تھے۔ یہ منظر پوری تحریک کی شکست کا نشان بن گیا۔

لیکن کہانی یہیں ختم نہیں ہوئی۔ ہک بغاوت نے ایک ایسا فوجی ڈھانچہ پیدا کیا جو مکمل طور پر امریکی تربیت اور ذہنیت میں ڈھلا ہوا تھا۔ سنہ 1972 تک 80 فیصد فوجی کمانڈر امریکہ کے اسکولوں سے تربیت یافتہ تھے۔ بعد میں مارکوس نے اسی نظام کو استعمال کر کے کامیابی سے مارشل لاء لگایا۔ جاگیرداری نظام بھی زندہ رہا۔ سنہ 1960 تک صرف 4 فیصد کسان ہی زمین کے مالک بن سکے۔ یہی نا انصافی آج بھی نئے کسانوں کی تحریکوں کو جنم دیتی ہے۔ فلپائن میں آج بھی NPA نامی تحریک موجود ہے۔ فلپائن کی یونیورسٹیوں میں دو قسم کی سوچ موجود ہے۔ ایک مغرب نواز لبرل سوچ جسے فلپائن کی اشرافیہ کی حمایت ہے اور دوسری انقلابی سوچ جسے فلپائن کے غرباء کی حمایت حاصل ہے۔ فلپائن کی اکانومی پاکستان سے بڑی ہے۔ مگر امیر اور غریب کے فرق کی وجہ فلپائن کا غریب پاکستان کے غریب سے زیادہ غریب ہے۔ آج بھی فلپائن کے لوگوں میں مذاہمت کا جذبہ موجود ہے۔

دینا کے لیے فلپائن ایک تجربہ گاہ بن گیا۔ امریکہ نے یہاں سے سیکھا کہ فوجی طاقت، محدود اصلاحات اور پر ایگنڈڈھڈڑ کو ملا کر عوامی مذاہمت کو کیسے دبایا جاتا ہے۔ یہی نسخہ بعد میں ویتنام، عراق اور افغانستان میں آزمایا گیا۔ آج جب موسمیاتی تبدیلی اور زمین کی لوٹ مار پھر کسانوں کو دیوار سے لگا رہی ہے تو وہی مسائل سر اٹھا رہے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یونیفارم بدلتے ہیں۔ فلپائن کی سٹیٹ یونیورسٹیز میں ان باغیوں کو فکری اور نظریاتی حمایت بھی میسر ہے۔ یہی وہ ڈر ہے جو فلپائن کی اشرافیہ کو واشنگٹن کا اتحادی بنائے رکھتی ہے۔

-----فالل AS-02 کا اختتام-----

ملک: انڈونیشیا

سال: 1947

فائل: AS-03

اکیس جولائی 1947 کی صبح ہالینڈ کے لٹاکا طیارے یوگیا کارتا پر بم بر سار ہے تھے اور ڈچ فوجی مشرقی سوماترا کے باغات پر قبضہ کر رہے تھے۔ اسی وقت نیویارک میں اقوام متحده کی سکیورٹی کو نسل میں امریکہ نے ایک قرارداد پیش کی جو گولیوں سے زیادہ خطرناک تھی۔ اس قرارداد نے انڈونیشیا کو یہ انتخاب دیا کہ یا تو جنگ جاری رکھو اور دنیا سے کٹ جاؤ، یا پھر اپنی زمین اور معیشت کے کچھ حصے چھوڑ کر عالمی قبولیت کا شرف حاصل کرو۔ وہ لمحہ دراصل آزادی کی قیمت طے کر رہا تھا۔

یہ کہانی صدیوں پر اనے استھصال سے شروع ہوتی ہے۔ چار سو سال تک ڈچ تاجروں نے انڈونیشیا کے وسائل کو نچوڑا۔ چالیس کی دہائی تک یہ جز اتر دنیا کی قدرتی ربر کا اٹھائیس فیصد، ٹن کا بارہ فیصد اور تقریباً سو فیصد کو نینیں بیدا کرتے تھے۔ آئیں کمپنی رائل ڈچ شیل کالیمانیان سے تیل نکالتی تھی اور جاواینک، اگرچہ مقامی شکل میں چلتا تھا، مگر لائنس نیدر لینڈز سے لیتا تھا۔ جاپانیوں نے جب 1942 میں یہ علاقہ فتح کیا تو بس ڈچ افسروں کی جگہ جاپانی بٹھا دیے۔ فرق صرف اتنا آیا کہ جاپانی نعروہ لے کر آئے تھے "ایشیا ایشیز کے لیے"۔ اسی دوران سوئیکارنو اور محمد حنہ جیسے رہنماسانے آئے جنہوں نے سترہ اگست 1945 کو آزادی کا اعلان کیا۔ جب جاپان ہارا تو نوجوانوں نے ہتھیار اٹھائے اور خود کو رپبلکن فوج کا نام دیا۔ چند ہی ہفتوں میں وہ جاوہ اور سوماترا کے بیشتر حصے پر قابض ہو گئے جبکہ ڈچ فوج ابھی آسٹریلیا اور یورپ سے واپس آ رہی تھی۔ برطانیہ نے جاپانی ہتھیار جمع کرنے کے بہانے اپنی فوج بھیجی لیکن جلد ہی وہ بھی ڈچ قیدیوں کے ساتھ رپبلکن جنگجوؤں سے لڑنے لگے۔ سورابایا کی لڑائی میں ایک برطانوی جنرل مارا گیا اور اس واقعے نے لندن کو پچھے ہٹنے پر مجبور کیا۔ مگر امریکہ کے لیے یہ اشارہ تھا کہ اگر جنگ لمبی چلی تو کمیونٹ تحریکیں مضبوط ہوں گی اور جاپان کے بعد ایک اور اہم منڈی ہاتھ سے نکل جائے گی۔

امریکہ نے نیدر لینڈز کو صاف کہا کہ اگر فوجی کارروائیاں جاری رہیں تو مارشل پلان کی امداد روک دی جائے گی۔ دباؤ کے نتیجے میں لنگا جاتھی معابدہ ہوا جس میں ریپبلک کو جاؤا، مادورا اور سوماترا پر اختیار دیا گیا مگر تیل، ربر اور مشرقی سوماترا کی معيشت بدستور ڈچ کنٹرول میں رہی۔ یہ معابدہ جلد ہی ٹوٹ گیا۔ سنہ 1947 میں ڈچ فوج نے ایک بڑی کارروائی کی جسے انہوں نے "پولیس ایکشن" کہا۔ چالیس ہزار فوجیوں نے حملہ کر دیا، بندرگاہیں اور ریڈیو اسٹیشن قبضے میں لے لئے، ہزاروں لوگ مار دئے اور لاکھوں کو بے گھر کر دیا۔

امریکہ نے سب فوج کو امداد کے وعدے کیسا تھوڑی فوری جنگ بندی کا مطالبہ کیا۔ آخر کار ہالینڈ نے اقوام متحده کی ثالثی قبول کی۔ اس کے بعد امریکہ کی سربراہی میں ایک کمیٹی بنی جس نے جاؤا کے ساحل پر کھڑے امریکی بحری جہاز آرائیں ول پر مذاکرات کرائے۔ ان مذاکرات میں انڈونیشیا کو وہ سب کچھ ماننا پڑا جو اس نے پہلے مسترد کیا تھا۔ ڈچ حکومت کو فی الحال اقتدار برقرار رکھنے کی اجازت ملی اور انڈونیشیا کو ایک وفاقی ریاست کی شکل دی گئی جس میں اصل طاقت نیدر لینڈز کے پاس رہی۔ ان معابدوں نے زمین اور وسائل کی لکیر کھینچ دی۔ جس حصے میں تیل، ربر اور برآمدی فصلیں تھیں وہ سب ڈچ قبضے میں چلا گیا۔ امریکہ نے دباؤ بڑھایا کہ مارشل پلان کی اگلی قسط اسی وقت ملے گی جب ڈچ حکومت اقوام متحده کے فصیلے پر عمل کرے گی۔ ریپبلک کے پاس اس وقت کچھ نہیں تھا۔ خزانہ خالی، چاول کے ذخیرے ختم اور بحری ناکہ بندی کے باعث ہتھیار خریدنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ سوئیکارنو نے معابدہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ فیصلہ انقلاب کو بچانے کے لیے ہے۔ مگر اس کے نتیجے میں پیشیں ہزار منع کلویٹر علاقہ اور پیمنٹھ ہزار فوجی قربان ہو گئے۔

اگلے سال ڈچ حکومت نے سولہ مصنوعی ریاستیں بنائیں، جن میں سلاطین اور جاگیر دار حکمران بنائے گئے تاکہ ریپبلک کمزور ہو۔ ان میں مشرقی سوماترا، پاسوندان اور بورنیو فیڈریشن شامل تھیں۔ انہی علاقوں میں امریکی کمپنیوں نے طویل مدت لیز کے معابدے کیے۔ یو ایس ریپبلک نے پچھتر ہزار ایکڑ زمین تیس سال کے لیے حاصل کی اور اسٹینڈرڈ ویکیوم نے تیل کی مارکیٹ کے حقوق لیے۔ ریپبلک نے احتجاج کیا مگر اقوام متحده نے اسے قبل از وقت قرار دیا۔

سنہ 1949 میں جب ڈچ فوج نے ایک اور حملہ کیا اور یوگیکارتا پر قبضہ کر لیا تو عالمی رد عمل شدید تھا۔ بھارت نے تجارتی پابندی لگائی، عرب لیگ نے تیل روکنے کی دھمکی دی اور امریکی کانگریس نے امداد بند کرنے کی قرارداد پیش کی۔ ہالینڈ کے لیے جنگ

جاری رکھنا ممکن نہ ہے۔ مذکورات شروع ہوئے جن کے نتیجے میں انڈونیشیا نے ایک ارب تیرہ کروڑ ڈالر کے برابر ڈچ قرض قبول کیا۔ اس قرض میں وہ رقم بھی شامل تھی جو نو آبادیاتی فوجی کارروائیوں پر خرچ ہوئی تھی۔ بدلتے میں نیدر لینڈز نے اقتدار کی منتقلی کا وعدہ کیا مگر اپنی کمپنیوں کو سات برس کے لیے ٹیکس فری منافع، بحری بیڑے کا کنٹرول اور جاوا بینک کے سونے کے ذخائر رکھنے کی اجازت حاصل کی۔

اقتدار تو منتقل ہوا مگر معیشت وہیں رہی۔ انڈونیشیا کی نوے فیصد یورپی تجارت، ستر فیصد زرعی زین و اور ساتھ فیصد بینک اب بھی ڈچ کمپنیوں کے ہاتھ میں تھی۔ جب حکومت نے رہبر ٹیکس لگانے کی کوشش کی تو جاوا بینک نے قرض دینے سے انکار کر دیا۔ اس تجربے نے انڈونیشیا کے فوجی طبقے کو یہ یقین دلایا کہ سیاسی آزادی کے بغیر معاشی آزادی ممکن نہیں۔ یہی سوچ آگے چل کر 1957 میں ڈچ کمپنیوں کی نیشنلائزیشن کا سبب بنتی۔

آزادی کے بعد کے برسوں میں اس قرض کی ادائیگی نے بجٹ کا چالیس فیصد کھایا۔ اسکول، اسپتال، دیہی ترقی سب متاثر ہوئے۔ کسان جنہوں نے آزادی کی جنگ لڑی تھی اب بھی ڈچ گوداموں میں اپنی فصلیں کم قیمت پر بچنے پر مجبور تھے۔ اس نا انصافی نے کمیونسٹ پارٹی کو مضبوط کیا جو زینوں کی تقسیم اور قرضوں کے خاتمے کا نعرہ لے کر ابھری تھی۔

لمبے عرصے تک یہی امر میکی فارمولہ دوسرے ملکوں میں بھی دہرا�ا جاتا رہا ہے۔ جنگ بندی، وفاقی ڈھانچہ، غیر ملکی سرمائی کا تحفظ۔ یہی ماڈل ویت نام، کانگلو اور انگولا میں بھی دکھائی دیا۔ انڈونیشیا کی مثال نے دنیا کو دکھایا کہ آزادی کے کاغذی وعدے بھی معاشی غلامی کے جال بن سکتے ہیں۔

آج پچھتر برس بعد بھی اس کہانی کے اثرات باقی ہیں۔ سنہ 1966 میں جب انڈونیشیا نے آخر کار وہ قرض چکایا تو اس کے بدلتے آئی ایف کے ساتھ ایسا معاهدہ کیا جس نے کان کنی، بینک اور تجارت غیر ملکی سرمایہ کاروں کے لیے کھول دی۔ اور آج بھی انڈونیشیا کے وسائل انٹرنسنل کارپوریشن کے قبضے میں ہیں۔ پہلے صرف ڈچ خون پیتے تھے بعد میں دوسرے ممالک کی کارپوریشنز بھی یہ کام کرنے لگیں۔ یہی وجہ ہے کہ انڈونیشیا آج تک پر اعتماد نظر نہیں آتا۔ نوے کی دہائی میں لگنے لگا تھا کہ شاید آسیان اپنی مشکلات پر قابو پا چکا ہے اور انڈونیشیا کی ترقی کا دور آچکا ہے مگر جارج سوروز جیسے ڈکیتوں نے آسیان کو نچوڑ کر کھ

دیا۔ انڈونیشیا کی اکانومی چین کیساتھ تجارت بڑھا کر چکلے میں سا لوں میں کافی بہتر ہوئی ہے مگر حال ہی میں ایک بار پھر انڈونیشیا مغربی سازشوں کا مرکز بن چکا ہے۔

ہالینڈ نے کچھ عرصہ پہلے سرکاری طور پر اپنے ماضی کے مظالم اور جرائم پر انڈونیشیا کے عوام اور ریاست سے معافی مانگی ہے مگر اس سے چار سو سالہ استھصال کے زخم نہیں بھر سکتے۔ سینکڑوں نسلیں اور کروڑوں لوگ ڈچ کے مظالم سے متاثر ہوئے تھے۔

-----فائل AS-03 کا اختتام-----

ملک: چین

سال: 1949

فائل: AS-04

سنہ 1949 میں جب چینیں ماؤزے تنگ نے بیجنگ میں کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ اب چین، عوامی جمہوریہ بن چکا ہے تو دنیا بھر کے مزدوروں اور کسانوں نے خوشحالی اور انصاف کی امید باندھ لی تھی۔ صرف چار سال پہلے تک امریکہ نے چیناگ کائی شیک کی قیادت میں نیشنل پارٹی کو دو ارب ڈالر سے زیادہ کی فوجی اور مالی امداد دی تھی۔ امریکی طیارے، اسلحہ، اور فوجی تربیت سب کچھ دستیاب تھا۔ اس کے باوجود کیونسٹوں نے پورے چین پر قبضہ کر لیا اور چیناگ کو اپنی حکومت سمیت تائیوان بھاگنا پڑا۔ دنیا کی سب سے بڑی طاقت کا بنایا ہوا اتحادی صرف چند سال میں زین بوس ہو گیا۔

یہ جنگ کئی دہائیوں پرانی تھی۔ چین ان دونوں اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا۔ مختلف سردار اپنے علاقوں پر قابض تھے۔ ایک طرف قوم پرست تحریکیں تھیں جو ملک کو ایک کرنے کی کوشش کر رہی تھیں، دوسری طرف کسانوں میں مقبول کیونسٹ تحریک تھی جو طبقاتی نظام کے خلاف بغاوت کر رہی تھی۔ ابتداء میں چیناگ کائی شیک کی نیشنل پارٹی اور ماؤزے تنگ کی کیونسٹ پارٹی نے مل کر ملک کو یکجا کرنے کی کوشش کی، مگر ان کا اتحاد زیادہ دیر نہ چل سکا۔ انیس سو سنتائیس میں دونوں ایک دوسرے کے خلاف میدان میں آگئے۔

پھر آیا جاپانی حملہ کا دور۔ سنہ 1931 سے 1945 تک چین جاپان کے خلاف لڑتا رہا۔ اس عرصے میں دونوں پارٹیوں نے وقتی طور پر اتحاد کیا مگر چیناگ کائی شیک کے لوگوں کی کرپشن اور موقع پرستی نے اختلافات کو بڑھا دیا۔ جب جاپان نے ہتھیار ڈالے تو چیناگ کائی شیک نے فوراً پورے چین پر کنٹرول کی کوشش شروع کر دی۔

امریکہ اس وقت دوسری جنگ عظیم کے بعد ایک نئی عالمی طاقت بن چکا تھا۔ واشنگٹن نے پہلے ہی چیناگ کائی شیک کے ساتھ تعلقات استوار کر لئے تھے کہ چین میں کیونسٹ کامیاب نہ ہو پائیں۔ مغرب کو ایشیا میں روس کا اثر بڑھانا قبول نہیں تھا۔ اسی

لیے امریکہ نے چیناگ کائی شیک کی نیشنل پارٹی کو اپنی مکمل حمایت دی۔ صرف چار سال میں امریکہ نے دو ارب ڈالر سے زیادہ کی امداد دی۔ امریکی ہتھیار، توپیں، ٹرک، طیارے، سب کچھ چین بھیجا گیا۔ پچاس ہزار امریکی فوجی چین کے شمالی علاقوں میں تعینات کیے گئے تاکہ جاپانی فوجوں کے ہتھیار محفوظ طریقے سے نیشنل پارٹی کے حوالے کیے جاسکیں۔

لیکن مستسلیہ یہ تھا کہ یہ امداد غلط ہاتھوں میں جا رہی تھی۔ نیشنل پارٹی کے وزراء اور جرنیل کرپشن میں ڈوبے ہوئے تھے۔ امریکی امداد کا بڑا حصہ بلیک مارکیٹ میں بک جاتا تھا۔ فوجی سپاہیوں تک کھانے اور وردیاں تک نہیں پہنچتی تھیں۔ ان کے حوصلے ٹوٹ گئے۔ ہزاروں سپاہی بھاگ گئے۔ عام لوگ بھی نیشنل پارٹی سے متفر ہو گئے کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ حکمران طبقہ امیر سے امیر تر ہوتا جا رہا ہے اور ملک کی حالت بدتر۔

اس کے بر عکس ماوزے تنگ کی قیادت میں کمیونسٹ پارٹی نے ایک منظم اور سخت جان فورس کھڑی کر لی تھی۔ ان کے سپاہی دیہاتوں میں جا کر کسانوں کے ساتھ کھاتے پیتے، ان کے حقوق کی بات کرتے۔ یوں دیہی علاقوں میں ان کو عوامی حمایت مل گئی تھی۔ سنہ 1948 تک وہ شمالی چین کے یونیورسٹیوں پر قبضہ کر چکے تھے۔ پھر تین بڑی لڑائیاں ہوئیں جنہوں نے جنگ کا نقشہ بدل دیا۔ ہوائی ہائی کی جنگ میں کمیونسٹ فوج نے لاکھوں سپاہیوں کو شکست دی۔ پھر پنگ جن کی لڑائی میں بیجگ اور تیانجنج ہیسے بڑے شہر ان کے ہاتھ آگئے۔ نیشنل پارٹی کا ڈھانچہ بکھر گیا۔

چیناگ کائی شیک کے پاس کوئی راستہ نہ بچا۔ سنہ 1949 کے آغاز میں وہ اپنے خاندان اور چند ہزار فوجیوں کے ساتھ تائیوان چلا گیا۔ اس نے وہیں جلاوطن حکومت قائم کی جسے آج بھی ”رمی پبلک آف چاننا“ کہا جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ اب پورے چین پر ماوزے تنگ کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ ایک نیا دور شروع ہو گیا تھا جس نے صرف چین بلکہ پورے ایشیا کی سیاست بدل دی اور اسوقت چیزیں ماڈل کمیونسٹ پارٹی صدر شی جن پنگ کی قیادت میں پوری دنیا کی تقدیر بدلنے نکلی ہے۔

اس جنگ کے نتیجے میں لاکھوں لوگ مارے گئے۔ چینی میں میشہ تباہ ہو گئی۔ ہنگائی نے عام لوگوں کی زندگی اجیرن کر دی۔ مگر سیاسی لحاظ سے سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ دنیا دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک طرف امریکہ اور اس کے اتحادی، دوسری طرف

روس اور چین۔ امریکہ نے چین کے کمیونسٹ نظام کو کھلے عام دشمن قرار دیا اور پورے ایشیا میں اپنے اتحادی اکٹھے کرنا شروع کیے۔ اسی پالیسی نے آگے چل کر کوریا کی جنگ اور ویتنام کی جنگ کو جنم دیا۔ چین میں کمیونسٹ حکومت کے قیام نے ایشیا کے توازن کو ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔ مغرب کو اندازہ ہوا کہ فوجی امداد جس قدر بھی ہو، اس وقت بے کار ہو جاتی ہے جب عوام کی حمایت ساتھ نہ ہو۔ ماؤزے تنگ کا نظریہ صرف چین تک محدود نہیں رہا بلکہ پوری تیسرا دنیا کے انقلابیوں کے لیے ایک مثال بن گیا۔

آج پچھتر سال گزرنے کے بعد چین ایک کمزور ریاست سے دنیا کی سب سے بڑی اکانومی بننے جا رہا ہے۔ امریکہ سمیت پوری دنیا تائیوان کو چین کا حصہ مانتی ہے۔ ماؤ کا نام پوری دنیا میں عزت سے کیا جاتا ہے اور چینگ کائی شیک کو اسکے اپنے ہموطن بھی غیر اہم سمجھتے ہیں۔

-----فائل AS-04 کا اختتام-----

ملک: ایران

سال: 1953

فائل: AS-05

انس اگست 1953 کی صبح تہران کی گلیوں میں شور تھا، ٹینکوں کی آوازیں، فائرنگ، اور ایک مقبول وزیر اعظم محمد مصدق کے گھر کے باہر لوگوں کا ہجوم۔ چند گھنٹوں میں ایران کی منتخب حکومت گرفتی، اور اس کے ساتھ ہی دنیا نے پہلی بار ایک نیا طریقہ دیکھا جسے آج ہم "امریکی ریجیم چینچ آپریشن" کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ وہ لمحہ تھا جب امریکہ اور برطانیہ نے مل کر ایک آزاد قوم کی خود مختاری کو پیسوں، سازشوں اور جھوٹ کے جال میں لپیٹ کر ختم کر دیا۔

اصل کہانی کچھ ہائیوں پہلے شروع ہوتی ہے۔ سنہ 1901 میں ایک برطانوی سرمایہ دار ولیم ناکس ڈارسی نے ایران کے بادشاہ سے صرف میں ہزار پاؤنڈ کے عوض پورے جنوبی ایران میں تیل نکالنے کا حق حاصل کر لیا۔ سنہ 1908 میں تیل کے چھپھوٹے، اور برطانیہ نے فوراً اپنی نیوی کو ایرانی تیل پر چلانا شروع کر دیا۔ ایران کے مزدور زین پر تپتی دھوپ میں کام کرتے رہے، جبکہ انگریز افسر الگ بنگلوں میں وہ سکی پیتے، کرکٹ کھیلتے اور مقامی لوگوں سے میل جوں سے پہبیز کرتے۔ جب دوسری جنگ عظیم کے دوران برطانیہ اور سوویت یونین نے ایران پر قبضہ کیا تو پرانے بادشاہ رضا شاہ کو ہٹا کر ان کے بیٹے محمد رضا شاہ کو تخت پر بٹھا دیا گیا۔ ایران اپنی زمین پر خود حکمران نہیں رہا۔

پھر آیا 1951 جب تہران کی پارلیمنٹ نے ایک تاریخی فیصلہ کیا۔ تمام ارکین نے ہاتھ اٹھا کر برطانوی کمپنی "Anglo-Iranian Oil Company" کو قومی ملکیت میں لینے کا قانون منظور کیا۔ اس لمحے وزیر اعظم محمد مصدق نے دستخط کیے، اور اعلان کیا کہ اب ایران کا تیل صرف ایران کا ہے۔ لندن والے اس جرأت پر غصے سے پاگل ہو گئے۔ وہ تیل جو برطانیہ کی معیشت کی رگوں میں بہتا تھا، اب ایک آزاد قوم نے واپس لے لیا تھا۔

مصدق کی وطن پرستی کے جواب میں اسے اقتصادی پابندیاں ملیں۔ ب्रطانوی جہاز ایرانی تبل لے جانے والے ٹینکروں کو روکنے لگے۔ ب्रطانیہ نے ایران کے ٹینکوں کے پیسے منجد کر دیے، خوراک اور اسٹیل پر پابندیاں لگائیں، اور یہ تک منصوبہ بنایا کہ آبادان کی ریفائزی پر حملہ کر دیا جائے۔ لیکن اس وقت کے امریکی صدر ژرژوین نے فوجی کارروائی سے انکار کر دیا۔

سنہ 1952 میں جب آئزن ہاور صدر بنا تو کہانی بدل گئی۔ اب امریکہ میں وہ لوگ اقتدار میں تھے جو ہر قومی تحریک کو کمیونزم کے خطرے کے طور پر دیکھتے تھے۔ سی آئی اے کے سربراہ ایلن ڈلس اور اسکے بھائی جان فوسر ڈلس نے مصدق کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ لندن نے سازش کا خاکہ تیار کیا، واشنگٹن نے پیسے اور پرویگنڈا مہیا کیا۔ یوں "آپریشن ایجیکس" کا آغاز ہوا۔

جون 1953 میں ایک امریکی ایجنت، کرمٹ روزویلٹ، تہران پہنچا۔ اس کے پاس ایک سفارتی پاسپورٹ، ڈالرز سے بھرا بریف کیس اور حکومت گرانے کا منصوبہ تھا۔ اس نے سیاستدانوں، جرنیلوں، ملاویوں اور غنڈوں کو خریدا۔ چند ہزار ڈالر میں ایران کے بازاروں، اخباروں اور مسجدوں کے یا نئے بدل گئے۔

پہلا حملہ 15 اگست کو ناکام ہوا۔ مصدق کو خبر مل گئی، شاہ ملک سے بھاگ کر اٹلی پہنچ گیا۔ لیکن سی آئی اے نے ہار نہیں مانی۔ دو دن بعد مظاہرے کروائے گئے، جھوٹے فتوے جاری ہوئے کہ مصدق قرآن جلانے والا ہے۔ 19 اگست کو شاہی فوج کے ٹینکوں نے وزیر اعظم کے گھر کا گھیراؤ کیا۔ چھ گھنٹے میں سب ختم ہو گیا۔ مصدق گرفتار ہوا، شاہ واپس آیا، اور ایران ایک بار پھر غلام بنادیا گیا۔

سنہ 1954 میں تبل کی نئی تقسیم ہوئی۔ امریکی کمپنیوں نے 40 فیصد تبل لے لیا، ب्रطانوی کمپنی کو بھی اتنا ہی حصہ ملا، باقی یورپی کمپنیوں نے بانٹ لیا۔ ایران کے حصے میں مغرب کی غلامی آئی۔ اصل اختیار غیر ملکی ہاتھوں میں چلا گیا۔ سی آئی اے نے صرف ستہ لاکھ ڈالر خرچ کیے، اور ایک آزاد ملک پر قبضہ کر لیا۔

یہی "امریکی رجیم چینچ" فارمولہ پھر کتنی ملکوں میں استعمال ہوا۔ سنہ 1954 میں گواٹے مala، 1958 میں انڈونیشیا، 1960 میں کانگو۔ سنہ 1977 میں پاکستان میں، جہاں بھی کسی ملک نے اپنا تبل یا معدنیات واپس لینے کی کوشش کی یا پھر خود مختاری کی خواہش کی، وہاں "جمهوریت کے تحفظ" کے نام پر حکومتیں گرائی گئیں۔

ایران میں اس سازش کے زہر نے سیاست کو تباہ کر دیا۔ شاہ نے "ساواک" نامی خفیہ ادارہ بنایا جس نے ہر یونیورسٹی، اخبار اور مسجد میں جاسوس بٹھا دیے۔ ہر مخالف آواز کو دبایا گیا۔ مذہبی رہنماؤں پر پابندیاں لگیں۔ انہی حالات میں آیت اللہ خمینی نے 1963 میں شاہ کے خلاف بولنا شروع کیا۔ یہ سال بعد اسی اسلامی تحریک نے ایران کا کنسروول سنبھال لیا۔

تاریخی لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ سب کچھ ایک بڑی حقیقت دکھاتا ہے کہ مغرب کے اس قسم کے تمام تراقدامات کا رپوریشنز کے مفادات کے تحت کئے گئے تھے۔ یہ رجیم چینچ آپریشنز اصل میں وسائل پر قبضہ کرنے کیلئے کئے جاتے تھے۔

آج ایران اور امریکہ کے تعلقات میں جو کشیدگی ہے، اس کی جڑ اسی 1953 کے واقعے میں ہے۔ ہر سال ایران میں لوگ آج بھی اس دن کی یاد میں جلوس نکالتے ہیں، جب ان کی جمہوریت کو چند لاکھ ڈالر خرچ کر کے نیلام کر دیا گیا تھا۔ امریکہ آج بھی دنیا بھر میں اسی سستے طریقے سے اپنی مرضی کی حکومتیں بنوata ہے۔

-----فال AS-05 کا اختتام-----

ملک: ویتنام

سال: 1954

فائل: AS-06

یہ 20 جولائی 1954 کی دوپہر تھی جب جنیوا میں معاهدے پر دستخط ہو رہے تھے اور ویتنام میں توپوں کی گنجاب بھی سنائی دے رہی تھی۔ معاهدے میں وعدہ کیا گیا کہ دو سال بعد یعنی 1956 میں پورے ویتنام میں عام انتخابات ہوں گے اور ملک پر امن طریقے سے دوبارہ متحد ہو جائے گا۔ لیکن صرف چھتیس گھنٹے بعد، سائکون کے نورودوم پیلس میں ایک بلاپتلا ویتنامی افسر نگو دین ڈیم نے وزیر اعظم کے طور پر حلف اٹھایا۔ اگلے بارہ میہنوں میں امریکہ نے اس کے اقتدار کو پیسوں، فوجی انداد اور سیاسی چالوں کے ذریعے مضبوط کیا، انتخابات کو سبوتاش کیا اور ملک کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ امریکہ نے کوریا کی طرح ویتنام کو بھی کی خانہ جنگی کی آگ میں جھونک دیا۔

یہ کہانی دوسری جنگ عظیم کے بعد شروع ہوئی تھی۔ فرانس کی سالوں سے ویتنام پر قابض تھا لیکن 1954 میں جب دین بیان فو کی لڑائی میں فرانسیسی فوج ہار گئی تو نوآبادیاتی دور کا خاتمہ نظر آنے لگا۔ امریکہ کو ڈر تھا کہ اگر فرانس پسپا ہو گیا تو یہ پورا خطہ ہی ہاتھ سے نکل جائے گا۔ بالادستی کی خواہش اور طاقت کے نتے نے امریکہ سے ویتنام میں مداخلت کروائی۔ صدر آزن ہاوار کے دور میں نیشنل سیکیورٹی کونسل نے ایک خفیہ منصوبہ بنایا کہ جنوب مشرقی ایشیا میں اپنا اثر و رسوخ قائم رکھنے کے لیے فوجی طاقت استعمال کی جا سکتی ہے۔ اس وقت امریکہ کو نگو دین ڈیم نام کا ایک کیتوں لوک سیاستدان مل گیا جو خود کو قوم پرست کہتا تھا لیکن دراصل مغرب کا امجنٹ بننے کے لیے تیار تھا۔

جنیوا معاهدے کے مطابق ویتنام کو وقتی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ شمال میں ہوچی منہ کی حکومت تھی اور جنوب میں شاہ باو دلی کا انتظام۔ معاهدے میں صاف لکھا تھا کہ 1956 میں عام انتخابات ہوں گے تاکہ عوام فیصلہ کریں کہ ملک کو کون چلا جائے گا۔ لیکن ڈیم نے اس معاهدے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ میں ان شقوں کا پابند نہیں جن پر میرے

و سخت نہیں۔ واشنگٹن کی شہر پر ہی یہ معابدہ شکنی کی گئی تھی۔ امریکی وزارت خارجہ نے ڈیم کو ہدایت دی کہ وہ یہ موقوف اپناۓ کہ شمال میں آزادی نہیں ہنزا وہاں انتخابات ممکن نہیں۔

پسے اور طاقت کے ذریعے امریکہ نے ڈیم کے لیے ایک نئی ریاست کھڑی کی۔ صرف ایک سال میں امریکہ نے تین سوابائیں ملیں ڈالر کی امداد دی۔ کرنل ایڈورڈ لینسڈیل، جو فلپائن میں بغاوت دبانے کا تجربہ رکھتا تھا، ویتنام پہنچا۔ اس نے جھوٹے پھلٹ چھپوائے، پروپیگنڈا چلایا، اور شمالی ویتنام کے آٹھ لاکھ پناہ گزینوں کو جنوبی علاقے میں لا کر آباد کیا تاکہ ڈیم کے ووٹ بینک کو مضبوط کیا جاسکے۔ مذہب کے نام پر ایک سیاسی قلعہ تعمیر کیا گیا جسے بعد میں امریکہ نے اپنی فرنٹ لائن ریاست بنایا۔

ڈیم کے اقتدار کے لیے سب سے بڑا خطرہ جنوبی ویتنام کے اندر موجود مختلف مسلح گروہ تھے۔ بعض جرائم پیشہ گروہ، بعض مذہبی فرقے اور کچھ اب بھی فرانسیسی اثر میں تھے۔ ڈیم نے امریکی توپ خانے اور خفیہ مدد سے ان سب کو کچل دیا۔ صرف تین دن میں سانگون کی سڑکیں لاشوں سے بھر گئیں اور ڈیم فاتح بن کر نکلا۔ واشنگٹن نے اس قتل عام پر جشن منایا۔ اگلے قدم میں ڈیم نے شاہ باو دائی کو ہٹا کر خود کو صدر بنایا۔ اکتوبر 1955 کے ریفرنڈم میں اس نے 98 فیصد ووٹ حاصل کیے، اس الیکشن میں ووٹوں کی تعداد ووٹرز سے بھی زیادہ نکلی۔

جب 1956 آیا تو انتخابات کا وعدہ توڑ دیا گیا۔ ڈیم نے امریکہ کے حکم کے مطابق اعلان کیا کہ چونکہ جنوبی ویتنام نے جنیوا معابدے پر سخت نہیں کیے اس لیے وہ ان انتخابات کا پابند نہیں۔ وزیر خارجہ جان فوستر ڈلیس نے کہا کہ ایسے انتخابات ایک مذاق ہوں گے۔ شمال نے احتجاج کیا مگر اقوام متحده خاموش رہی۔ اس طرح ایک عارضی لکیر مستقل سرحد بن گئی۔ یہ وہی لکیر تھی جو بعد میں خون کی لکیر بن گئی۔

امریکی مداخلت کے نتائج تباہ کن ثابت ہوئے۔ ویہی علاقوں کے کسان جہنوں نے ملک کے اتحاد کی امید لگا رکھی تھی مایوس ہو گئے۔ کمیونسٹ پارٹی نے دوبارہ تنظیم کی اور چند سالوں میں مزاحمتی جنگ شروع کر دی۔ امریکی امداد سے بنی فوج جدید ہتھیاروں سے لیس تھی مگر اپنی ہی آبادی کے خلاف لڑنے کے لیے بنائی گئی تھی۔ اندرونی بغاوتیں بڑھتی گئیں، دیہات میں نفرت پھیل گئی، اور 1960 کے بعد یہی بغاوت ویتنام کی جنگ میں بدل گئی جس نے لاکھوں جانیں لے لیں۔

امریکہ نے یہ فارمولہ کرنی اور ملکوں میں دہرایا۔ جب کہیں انتخابات میں ان کے مفادات کو خطرہ ہوا، انہوں نے ووٹ ہی ختم کر دیے یا حکومت المٹ دی۔ یہی طریقہ 1970 میں چلی، 1984 میں نکاراگوا اور بعد میں فلسطین میں بھی دیکھا گیا۔ ویتنام میں جس دن الیکشن روکا گیا، اسی دن یہ سبق طے ہوا کہ جمہوریت عالمی طاقتوں کے لیے صرف اس وقت قابلِ قبول ہے جب نتائج ان کے حق میں ہوں گے۔

آج بھی اس واقعے کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ ہنوئی کے نوجوان جب بلدیاتی انتخابات میں شفافیت کا مطالبہ کرتے ہیں تو وہ 1956 کے منسوخ شدہ الیکشن کی مثال دیتے ہیں۔

-----فائل AS-06 کا اختتام-----

ملک: انڈونیشیا

سال: 1958

فائل: AS-07

ستہ مئی 1958 کی دوپہر کو انڈونیشیا کے شہر ایمبوون کے آسمان پر ایک امریکی پائلٹ کا طیارہ مار گرا گیا۔ پائلٹ زندہ پکڑ لیا گیا۔ اس کے یگ سے امریکی سی آئی اے کے کاغذات، کوڈ شدہ نقشے اور ہتھیاروں کے ہدایت نامے برآمد ہوئے۔ اگلے دن پوری دنیا کو پتہ چل گیا کہ امریکہ براہ راست انڈونیشیا کی حکومت گرانے کی سازش میں ملوث تھا۔ اس واقعے نے امریکہ اور انڈونیشیا کے تعلقات کا رخ بدل دیا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد جب ایشیا یورپی نوآبادیات سے آزاد ہو رہا تھا، انڈونیشیا نے بھی ہالینڈ کے خلاف آزادی کی جنگ لڑی۔ چار سال کی قربانیوں کے بعد سوئیکارنو نے ایک متحد اور خود مختار ملک کی بنیاد رکھی۔ لیکن ملک آسان نہ تھا۔ ہزاروں جزاں، درجنوں نسلیں، سینکڑوں زبانیں۔ جاوا جزیرے پر بیٹھا مرکزوی حکومت کا نظام باقی علاقوں پر حکم چلاتا تھا، لیکن وسائل زیادہ تر سماترا اور سولاویسی سے آتے تھے۔ جن لوگوں کے علاقے سے تیل، لکڑی اور ریڑ برآمد ہوتا تھا، ان کے حصے میں کچھ نہیں آتا تھا۔ یہ احساس محرومی بڑھتا گیا۔

سنہ 1955 کے انتخابات نے معاملہ اور الجھا دیا۔ کوئی واضح اکثریت نہ ملی، پارلیمنٹ مفلوج ہو گئی، اور سوئیکارنو کو فوج، کمیونسٹ پارٹی اور اپنی جماعت کے درمیان توازن قائم رکھنے میں دشواری ہونے لگی۔ اسی دوران امریکہ کو ڈسپیدا ہوا کہ اگر سوئیکارنو کمیونسٹوں کے قریب ہو گیا تو انڈونیشیا بھی چین کی طرح کمیونسٹ بلاک میں چلا جائے گا۔ امریکی صدر آئزن ہاؤر اور سی آئی اے کے سربراہ ایلن ڈلس نے سوئیکارنو کے خلاف رجیم چینج آپریشن کا فیصلہ کیا جیسے ایران کے محمد مصدق کے خلاف کامیابی سے کیا گیا تھا۔

فروری 1958 میں وہ موقع آگیا۔ سولاویسی اور سماترا کے ناراض فوجی افسروں نے حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور ”انقلابی حکومت جمہوریہ انڈونیشیا“ کا اعلان کر دیا۔ بظاہر ان کا مطالبہ صرف علاقائی خود مختاری تھا، لیکن امریکہ نے اسے کمیونزم کے خلاف جنگ بنانا ڈالا۔ سی آئی اے نے ایک خفیہ آپریشن شروع کیا جس کا نام رکھا گیا ”آپریشن ہائک“۔ منصوبہ یہ تھا کہ باغیوں کو خفیہ طور پر اسلحہ، رقم اور فضائی مددی جانتے تاکہ سوئیکارنو کو کمزور کیا جاسکے۔

سی آئی اے نے ملائیشیا میں خفیہ اڈہ قائم کیا۔ امریکی اور تائیوانی ”کنٹریکٹ پائلٹ“ بغیر نشان والے طیارے اڑانے لگے۔ ان طیاروں سے باغیوں کے لیے بندوقیں، مشین گز اور ریڈیو آلات گراۓ جاتے۔ کچھ طیارے انڈونیشی فوجی ٹھکانوں پر بمباری بھی کرتے۔ ایک حملے میں ایمبوون کی مارکیٹ تباہ ہوئی، درجنوں یگناہ شہری مارے گئے۔ دوسرا حملہ میں انڈونیشی بھری جہاز پر بم گرا کر نقصان پہنچایا گیا۔ ان سب کارروائیوں کا مقصد یہ تاثر دینا تھا کہ بغاوت اندر ورنی ہے، لیکن حقیقت میں ساری کارروائی واشنگٹن کی منصوبہ بندی کے تحت ہو رہی تھی۔

شروع میں باغیوں نے کچھ کامیابیاں حاصل کیں لیکن جلد ہی انڈونیشی فوج متحد ہو گئی۔ جنرل ناصوتن کی قیادت میں فوج نے فیصلہ کیا کہ ملک کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے نہیں دیا جائے گا۔ یہاں سی آئی اے غلطی کر گئی۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ فوج بڑ جائے گی، مگر اسلا فوج اور سوئیکارنو متحد ہو گئے۔

پھر وہ دن آیا جب امریکی پائلٹ ایلن لارنس پوپ کا طیارہ مار گرایا گیا۔ جب اسے گرفتار کیا گیا تو سب کچھ کھل کر سامنے آگیا۔ سی آئی اے کا خفیہ منصوبہ دنیا بھر میں رسولی بن گیا۔ امریکہ کے پاس کوئی جواز نہ رہا۔ امداد بند ہوئی، طیارے رک گئے، اور باغیوں کی طاقت ختم ہو گئی۔ چند مہینوں میں حکومت نے تمام علاقے دوبارہ اپنے قبضے میں لے لیے۔ بغاوت ناکام ہو گئی، اور سوئیکارنو پہلے سے زیادہ مضبوط ہو کر ابھرا۔

اس ناکام مداخلت کے اثرات گھرے تھے۔ سوئیکارنو نے اس کامیابی کی بنیاد پر بہت مقبول اور مضبوط ہو گیا۔ فوج کو سیاسی طاقت دی گئی اور کمیونسٹ پارٹی کو مزید جگہ ملی۔ امریکہ جس چیز سے ڈر رہا تھا، وہی ہوا۔ سوئیکارنو کھل کر سوویت یونین اور چین کے قریب چلا گیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مغرب اس کے خلاف سازش کر رہا ہے، اس لیے وہ اپنے دفاع کے لیے کمیونسٹوں پر انحصار کرنے لگا۔

کمیونسٹوں کیلئے بڑھتے ہوئے اثر و سوخ کو دیکھتے ہوئے امریکہ نے اپنی سازشیں مزید بڑھا دیں۔ فوج، سوتیکارنو اور کمیونسٹ پارٹی تین سوون بن گئے جن کے درمیان کشمکش بڑھنے لگی۔ سنہ 1965 میں فوجی بغاوت اور خوزینہ بدامنی نے لاکھوں جانیں لیں اور انڈونیشیا ایک نئی فوجی آمریت کے دور میں داخل ہو گیا۔ یہ سب امریکی مداخلت کی بدولت ہو رہا تھا۔ اس واقعے نے انڈونیشیا کے ذہن میں ایک مستقل سبق چھوڑ دیا کہ امریکہ ایک ناقابل اعتبار طاقت ہے۔

-----فائل AS-07 کا اختتام-----

ملک: لاوس

سال: 1958

فائل: AS-08

سنہ 1958 میں جب امریکہ نے لاوس میں پہلی بار خفیہ مداخلت شروع کی، تو کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ دنیا کی سب سے طویل خفیہ جنگ بننے جا رہی ہے۔ لاوس آسیان کا ایک چھوٹا سا ممبر ملک ہے، وہ دو دہائیوں تک امریکہ کے خفیہ آپریشنز کا میدان جنگ بننا رہا۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ اس وقت شروع ہوا جب بظاہر لاوس ایک غیر جانب دار ملک تھا، جس کا اعلان تھا کہ وہ نہ کیونست بلاک کے ساتھ ہے نہ مغربی طاقتوں کے ساتھ۔ لیکن امریکہ نے لاوس کو غیر جانبداری برقرار رکھنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

پس منظر سمجھ لیجیے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جنوب مشرقی ایشیا میں آزادی کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ انڈوچھاتنا میں فرانسیسی تسلط ختم ہوا تو تین ملک وجود میں آئے۔ ویتنام، کمبودیا اور لاوس۔ ویتنام میں کیونسوں نے تیزی سے طاقت حاصل کی، اور واشنگٹن کو ڈر تھا کہ اگر ایک ملک کمیونزم میں گیا تو باقی سب بھی مغرب کے اثر سے آزاد ہو جائیں گے۔ اسی نظریے کو "ڈوینو تھیوری" کہا گیا۔ اس وقت امریکہ کے لیے سب سے بڑی فکری جنگ یہ تھی کہ کسی بھی طریقے سے ماضی کی کالونیز پر اجارہ داری قائم رکھی جائے۔ اور یوں لاوس جیسے غیر جانبدار ملک کی بد قسمتی کا طویل دور شروع ہوا۔

لاوس میں بادشاہت تھی، جسے رائل لاو گورنمنٹ کہا جاتا تھا۔ لاوس کی اندرونی سیاست میں تین طاقتیں سرگرم تھیں۔ ایک طرف کیونست تحریک پا تھیت لاو تھی، دوسری طرف شاہی فوج، اور تیسرا طرف وہ سیاستدان جو غیر جانب داری چاہتے تھے۔ امریکہ نے اعلانًا غیر جانب داری کی حمایت کی، لیکن درپرده رائل لاو آرمی کو اسلحہ، رقم اور تربیت فراہم کرنا شروع کر دی۔ مقصد یہ تھا کہ فوج کی ڈکٹیٹر شپ قائم کر کے کیونسوں کو ختم کیا جائے جیسے بعد میں انڈونیشیا میں کیا گیا تھا۔ کمیونزم کے اثر کو ہر قیمت پر جڑ سے ختم کرنے کا منصوبہ تھا، جس کے لیے لاوس کی خود محتراری کو داؤ پر لگا دیا گیا۔

شروع میں مدد صرف مالی نوعیت کی تھی۔ سی آئی اے نے اپنے خفیہ نیٹ ورک کے ذریعے پیسہ، خوراک، اور اسلحہ پہنچانا شروع کیا۔ لیکن جلد ہی یہ امداد براہ راست فوجی کارروائیوں میں بدل گئی۔ امریکہ نے تھامی لینڈ اور ویتنام میں اڈے قائم کیے اور وہاں سے لاوس کی زمین پر کارروائیاں شروع کیں۔ شاہی فوج کے سپاہیوں کو امریکی مشیروں نے تربیت دی، ان کو جدید ہتھیار دیے گئے، اور سی آئی اے نے ایک تبادل فوج تیار کر لی جو ظاہری طور پر لاوس کی تھی مگر اصل میں واشنگٹن کے احکامات پر چلتی تھی۔

پا تھیت لاو، جو ایک منظم کمیونسٹ تنظیم تھی، شمالی ویتنام کی مدد سے لڑ رہی تھی۔ اس وقت دنیا کی نظریں ویتنام پر تھیں، لیکن لاوس میں ایک خاموش جنگ جاری تھی جس کا ذکر اخباروں میں بہت کم ہوتا تھا۔ امریکی طیارے روزانہ درجنوں مشن اڑاتے، لاوس کے جنگلات میں بمباری کرتے، اور کمیونسٹ ٹھکانوں کو نشانہ بناتے۔ عام لوگوں کو معلوم بھی نہیں تھا کہ ان کے ملک پر تاریخ کی سب سے بڑی خفیہ فضائی جنگ لڑی جا رہی ہے۔ بعد میں اندازہ ہوا کہ امریکہ نے لاوس پر ویتنام سے بھی زیادہ بم گرانے تھے۔

یہ سب کچھ ایک ایسے ملک میں ہوا تھا جس کی آبادی صرف تیس لاکھ تھی۔ امریکہ کے لیے یہ ایک "چھوٹی جنگ" تھی، لیکن لاوس کے لیے یہ وجود کی جنگ بن گئی۔ واشنگٹن کی حکمت عملی یہ تھی کہ اگر لاوس کمیونسٹوں کے قبضے میں چلا گیا تو ویتنام میں بھی شکست یقینی ہے۔ اس لیے وہاں ہر قیمت پر کمیونزم کو روکا جائے۔ لیکن مستلزم یہ تھا کہ امریکہ نے لاوس کی سیاست، ثقاافت اور سماجی ساخت کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ ان کے لیے سب ایشیئن ایک جیسے تھے، اور یہی ان کی سب سے بڑی غلطی ثابت ہوئی۔

نتیجہ یہ نکلا کہ ملک دو حصوں میں بٹ گیا۔ شمالی علاقوں میں پا تھیت لاو کا قبضہ بڑھتا گیا، اور جنوبی علاقوں میں شاہی حکومت امریکی سہارے پر قائم رہی۔ جنگ لمبی ہوتی گئی، لوگ بھاگنے لگے، اور لاکھوں عام شہری مہاجر بن گئے۔ ہر گاؤں میں بم گرتے، ہر دریا میں لاشیں بہتی نظر آتیں۔

بالآخر سنہ 1973 میں امن معاهدہ ہوا، لیکن وہ بھی زیادہ دیر نہ چل سکا۔ کمیونسٹوں نے طاقت حاصل کر لی، اور دو سال بعد باڈشاہت کا خاتمہ کر کے عوامی جمہوریہ لاوس قائم کر لیا۔ امریکہ کی وحشتناک بمباری، طاقت کا بے دریغ استعمال اور انسانیت کے خلاف جنگی جرائم کسی کام نہ آئے۔ جس ملک کو وہ کمیونزم سے بچانا چاہتے تھے، وہی ملک مکمل طور پر کمیونسٹ بن گیا۔ یہ شکست صرف لاوس کی نہیں تھی، بلکہ امریکہ کے غرور کی بھی تھی۔ ان کا بنایا ہوا نظام، ان کی تربیت یافتہ فوج، اور ان کے اربوں ڈالر سب ضائع ہو گئے۔ اس کے بعد امریکہ نے طویل عرصے تک لاوس کا نام لینے سے بھی گریز کیا۔ لاکھوں لوگ مارے گئے، لاکھوں معذور ہوئے، اور زمین پر بہوں کا ایسا زہریلا جال بچھا کر آج بھی وہاں بارودی سرنگوں سے اموات ہوتی ہیں۔

-----فائل AS-08 کا اختتام-----

ملک: کوریا

سال: 1961

فائل: AS-09

ستہ مئی 1961 کی صبح سیوں میں لوگ جا گے تو سڑکوں پر فوجی ٹینک گھوم رہے تھے۔ ریڈیو پر ایک اعلان ہوا کہ ملک کا نظام بدل دیا گیا ہے۔ جنرل پارک چونگ ہی نے اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا۔ جنوبی کوریا میں جمہوریت ختم ہو گئی اور اس کے پچھے امریکہ تھا جس نے خاموشی سے اس نئے فوجی حکمران کو قبول کر لیا۔

کوریائی جنگ کے بعد جنوبی کوریا ایک غریب، کمزور اور سیاسی طور پر غیر مسٹحکم ملک تھا۔ پہلے صدر سنگمن ری اپنی کرپشن اور آمربیت کے باعث عوامی بغاوت کا شکار ہوئے۔ سنہ 1960 میں طلبہ نے سڑکوں پر نکل کر ان کی حکومت گردادی۔ لیکن ان کے جانے کے بعد جو نئی جمہوری حکومت بنی وہ بھی کمزور تھی۔ امریکہ نے کوریا کو تقسیم کر کے جنوبی حصے پر قبضہ تو جما لیا تھا مگر امریکی حکام کو ڈر تھا کہ اگر جنوبی کوریا میں استحکام نہ آیا تو کیونزم شمال سے جنوب کی طرف پھیل جائے گا اور پورا خطہ ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اسی خوف نے امریکہ کو ایک ایسے فصیلے پر مجبور کیا جو آنے والے کئی دنیا یوں تک تاریخ کو متاثر کرتا ہے۔

جنرل پارک چونگ ہی ایک تنابعہ شخص تھا۔ وہ کبھی جاپانی فوج میں افسر رہ چکا تھا اور اپنے ہی ہموطنوں کے خلاف کام کر چکا تھا۔ وہ ایک موقع پرست ڈبل ایجنت تھا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب اس پر بائیں بازو سے ہمدردی کا الزام لگا کر تقریباً پھانسی دی جانے والی تھی۔ لیکن قسمت نے پلتا کھایا۔ سنہ 1961 میں اس نے نوجوان فوجی افسروں کے ساتھ مل کر حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ چند گھنٹوں میں پورا ملک اس کے کنٹرول میں تھا۔ امریکی سفیر اور فوجی کمانڈ نے اس اچانک بغاوت پر حیرانی ظاہر کی۔ واشنگٹن نے تاثر دیا کہ وہ مداخلت کرنے کا سوچ رہا ہے، لیکن جلد ہی حقیقت کھلنے لگی اور امریکہ نے مضبوط آمر کو کمزور جمہوری حکومت کے تبادل کے طور پر قبول کر لیا۔ چند دنوں ہی میں امریکہ نے نئی فوجی حکومت کو تسلیم کر لیا۔

پارک نے فوراً امریکہ کے ایجنڈے پر کام شروع کر دیا۔ اس نے کمیونسٹوں کے خلاف بڑے ہمایوں پر کارروائیاں کیں، امریکہ کے ساتھ اتحاد کا عہد دہرا�ا اور یہ یقین دہانی کرائی کہ وہ جلد ہی اقتدار عوام کو واپس کر دے گا جیسے ہر امریکہ کا حمایت یافتہ ڈلٹیئر کہتا ہے جیسے جزل ضیاء الحق نے کہا تھا، جیسے مارکوس نے کہا تھا۔ مگر یہ وعدہ محض دھکاوا تھا۔ سنہ 1963 میں اس نے صدارتی انتخاب کے ذریعے خود کو صدر بنوایا، جیسے جزل ایوب خان نے، جزل ضیاء الحق نے، مارکوس نے، سہارتو نے اور درجنوں دوسرے امریکی حمایت یافتہ ڈلٹیئر نے اس سے پہلے اور بعد میں کیا تھا۔ طاقت امریکہ کے ہی ہاتھ میں رہی۔ اس کی حکومت نے ملک کو آہستہ آہستہ ایک پولیس سٹیٹ میں بدل دیا۔

امریکی مفاد کے لیے وہ ایک مثالی اتحادی تھا ایک حقیقی کٹھپتی۔ واشنگٹن نے اسے مالی مدد، قرضے اور تجارتی سہولتیں فراہم کیں۔ انہی وسائل سے پارک نے جنوبی کوریا کی میشیت کو ازسرنو تعمیر کیا۔ اس نے جاپان کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے، جو امریکہ کی پالیسی کا حصہ تھا تاکہ پورے مشرقی ایشیا میں مغرب کی اجارہ داری قائم رہ سکے۔ مغرب کی مدد نے صنعتوں کو فروغ دیا اور جنوبی کوریا میں خوب ترقی ہوئی۔ اس کو رین مجزے کی خوب تشبیہ کی جاتی ہے۔

لیکن اس ترقی کی بھاری قیمت کوئی نہیں دیکھتا۔ انسانی حقوق کی بدترین خلاف ورزیاں کی گئیں، ہزاروں مخالف سیاسی کارکنوں کو قتل کیا گیا، اخبارات پر پابندیاں لگادی گئیں اور سی آئی اے کے تحت کورین عوام پر خفیہ نگرانی کا نظام قائم کیا گیا۔ سنہ 1972 میں جب امریکہ چین کے قریب جانے لگا اور وینام میں اپنی پالیسی بدل رہا تھا تو پارک نے ایک نیا آئین نافذ کیا جس نے اسے تاہیات صدر بنادیا۔ اس کے بعد جنوبی کوریا ایک کھلی آمریت میں بدل گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ سب واشنگٹن کی مرضی سے ہو رہا تھا۔ امریکہ کو جنوبی کوریا میں اپنے مفادات سے مطلب تھا۔

مجال ہے کہ امریکیوں کو ان باتوں کا پتہ ہو وہ آج بھی یہی سمجھتے ہیں کہ انکا ملک جمہوریت کا علمبردار ہے۔ دنیا بھر کے مغرب نواز لوگ بھی دنیا کو جمہوریت پر لیکھ رہے ہوئے ان واقعات کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں۔ امریکہ نے کوریا میں جمہوریت قربان کر دی، ابھی حال ہی میں یہ عمل پھر دہرانے کی کوشش کی گئی تھی جسے کورین عوام نے ناکام بنا دیا تھا۔ جنوبی کوریا نے بلاشبہ معاشی ترقی کی، لیکن اپنی آزادی اور خود مختاری کی قیمت پر۔ عوام دو حصوں میں بٹ گئے۔ ایک طبقہ پارک چونگ جیسے ڈلٹیئر کو

ایک عظیم رہنمایا مانتا ہے جسے پاکستان میں جنرل ایوب خان کے بارے میں تاثر قائم کیا گیا ہے۔ لیکن دوسرا طبقہ اسے ایک ڈلٹیئر ہی سمجھتا ہے جو وہ اصل میں تھا۔ جس نے اپنے ہموطنوں کا اپنے آقاوں کی خوشنودی کیلئے قتل عام کیا۔ یہی تقسیم بعد میں اس کی بیٹی پارک گن ہی کے دور تک پہنچی۔ 2016 میں جب عوام نے کرپشن کے خلاف تاریخی مہم چالائی اور لاکھوں لوگ موم تیتوں کے ساتھ سڑکوں پر نکلے تو انہوں نے صرف ایک صدر کو نہیں بلکہ اس پورے آمرانہ ورثے کو مسترد کر دیا۔ یہ انقلاب اس بات کا اعلان تھا کہ جنوبی کوریا اب وہ ملک نہیں رہا جو کسی جنرل کے رحم و کرم پر رہے۔

-----فائل AS-09 کا اختتام-----

ملک: ویتنام

سال: 1963

فائل: AS-10

دو نومبر 1963 کی صبح ساگون میں ایک بکتر بند گاڑی کے اندر دو بھائیوں کو گولی مار دی گئی۔ ایک کا نام نگودن دیم تھا، دوسرا نگودن نیو۔ اس واقعے نے ویتنام کی تقدیر ہمیشہ کے لیے بدل دی۔ دونوں وہی لوگ تھے جنہیں چند سال پہلے امریکہ نے جنوب مشرقی ایشیا میں کمیونزم کے خلاف امید کی علامت بنا کر پیش کیا تھا۔ لیکن اسی امریکہ نے چند سال بعد انہی کو ہٹانے کی منظوری دی اور آخر کار وہ اپنے ہی فوجیوں کے ہاتھوں مارے گئے۔

اس کہانی کا پس منظر سمجھنا ضروری ہے۔ سنہ 1954 میں جنیوا معہدے کے بعد ویتنام دو حصوں میں بٹ گیا۔ شمال میں ہوچی مہنہ کی کمیونسٹ حکومت تھی اور جنوب میں امریکہ کے حمایت یافتہ دیم۔ امریکہ نے اسے سرد جنگ کا مورچہ سمجھ کر ہر ممکن مد دی۔ دیم کو اربوں ڈالر کی امداد، جدید اسلحہ اور تربیت دی گئی۔ مقصدیہ تھا کہ وہ کمیونزم کے پھیلاوہ کو روکے۔ مگر دیم واشنگٹن کی امیدوں پر پورا نہ اتر سکا۔ وہ ایک سخت گیر، خود پسند اور حد سے زیادہ مذہبی حکمران بن گیا۔ جنوبی ویتنام کی اکثریت بدھ مت کی پیروکار تھی، لیکن دیم ایک متعصب کیتھولک تھا۔ اس نے اپنے بھائی نیو اور اسکی با اشہریوی میڈم نیو کو حکومتی طاقت کے مرکزوں میں بٹھا دیا۔ عوام بدظن ہو گئے، بدعنومنی بڑھ گئی، اور کمیونسٹ با غیبی یعنی ویت کانگ دن بدن طاقتور ہونے لگے۔

سنہ 1963 کے موسم بہار میں عوامی مخالفت کا لاواپھٹ پڑا۔ دیم نے بدھ راہبوں کے مظاہروں کو طاقت سے کچلنے کا حکم دیا۔ ساگون کی سڑکوں پر جلتے ہوئے راہبوں کی تصاویر دنیا بھر میں پھیل گئیں۔ ایک راہب ٹھک کو انگ ڈک نے خود کو سرعام آگ لگا کر جلا یا۔ یہ منظر دنیا کے ضمیر کو جھنجھوڑ گیا۔ امریکہ کیلئے دیم ایک بوجھ بن چکا تھا۔

اگست میں نیا موڑ آیا۔ دیم کے بھائی نیو نے فوجی دستوں کو بدھ مندر ز پر چڑھائی کا حکم دیا۔ سینکڑوں راہب مارے گئے، ہزاروں گرفتار ہوئے۔ امریکی سفیر ہنری کیبوٹ لاج جو نیٹ نے صدر کینیڈی کو اطلاع دی کہ دیم اور نیو بیجہ غیر مقبول ہو چکے ہیں اور

ہمارے کسی کام کے نہیں رہے۔ چوپیس اگست کو واشنگٹن سے ساگون ایک خفیہ ہدایت بھیجی گئی جسے تاریخ میں کیبل 247 کہا جاتا ہے۔ اس میں حکم دیا گیا کہ دیم سے کہا جائے نیو کوہٹانے ورنہ فوج کو واضح پیغام دیا جائے کہ امریکہ حکومت کی تبدیلی کی حمایت کرے گا۔ یہی وہ اشارہ تھا جس کا جنوبی ویتنام کے ناراض جرنیلوں کو انتظار تھا۔

اگلے چند ہفتوں میں سی آئی اے کے افسروشن کوئی نے ان جرنیلوں سے خفیہ ملاقاتیں کیں۔ امریکہ نے بغاوت کے لئے گرین سگنل دیا اور حمایت کا یقین دلایا۔ یکم نومبر کو بغاوت شروع ہوئی۔ ساگون کی فوجی چھاؤنیاں، ریڈیو اسٹیشن اور موصلاتی مرکز باغیوں نے سنبحال لیے۔ دیم اور نیو نے محل کے چھلے حصے میں بنے ایک خفیہ سرنگ کے ذریعے فرار کی کوشش کی۔ رات بھروسہ چھپے رہے مگر صبح ان کا پتہ چل گیا۔ فوج نے انہیں کہا کہ ہم آپ کو بحفاظت ملک سے باہر لے جائیں گے۔ لیکن جب وہ بکتر بند گاڑی میں بیٹھے تو اندر ہی انہیں گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔

امریکہ نے ایک مسئلہ ضرور حل کیا مگر ساتھ ہی ایک بہت بڑا بحران بھی پیدا کر دیا۔ ان کے بعد جنرل ڈونگ وین منہ کی سربراہی میں فوجی حکومت بنی لیکن صرف دو ماہ بعد اسے بھی ہٹا دیا گیا۔ پھر ایک کے بعد ایک فوجی قبضے، سازشیں اور تخت اللٹن کے واقعات شروع ہو گئے۔ جنوبی ویتنام کا نظام حکومت ٹوٹ کر بکھر گیا۔ ہر نئی حکومت امریکہ پر پہلے سے زیادہ انحصار کرنے لگی۔ اس دوران ویت کانگ کی پیشقدمی بڑھتی چلی گئی۔ دیہاتوں پر قبضے ہونے لگے۔ جنگ پھیل گئی اور امریکہ اس دلدل میں پوری طرح پھنس گیا۔

صدر کینڈی کے قتل کے بعد جب لنڈن جانسن اقتدار میں آئے تو ان کے پاس کوئی مضبوط ویتنامی اتحادی نہ بجا۔ اسی کمزوری نے انہیں مجبور کیا کہ وہ امریکی فوجی دستے برہ راست میدان جنگ میں اتاریں۔ یہی وہ فیصلہ تھا جس نے ویتنام کی جنگ کو امریکہ کیلئے ایک عذاب بنادیا۔ اگلے دس سال میں اٹھاون ہزار امریکی فوجی مارے گئے، لاکھوں ویتنامی شہری بر باد ہوئے، اور آخر کار امریکہ کو شکست تسلیم کرنی پڑی۔

دیم کی حکومت کا خاتمہ ناگزیر تھا۔ وہ ایک کرپٹکٹھ پتلی حکومت تھی جو امریکہ کے مفادات کیلئے لڑی رہی تھی۔ اور اس کے مقابلے میں ایک متحد عوامی طاقت تھی جو اپنے ملک و قوم اور عوامی مفادات کی خاطر لڑتھ تھے اور جو جان سے لڑ رہے تھے۔

کوئی مقابلہ ہی نہیں بنتا تھا۔ جنوبی وینام کبھی ایک مصبوط ریاست نہ بن سکا کیونکہ اس کی بنیاد خود مختاری پر نہیں بلکہ امریکی سرپرستی پر تھی۔ جب حکمرانوں کو عوام نہیں بلکہ باہر کے ملک سے طاقت ملتی ہے تو ان کی جڑیں جلد یا بدیر کٹ جاتی ہیں۔

-----فائل 10-AS کا اختتام-----

ملک: لاوس

سال: 1965

فائل: AS-11

چھ جنوری 1965 کی صبح تھی۔ لاوس کے ایک پہاڑی علاقے میں دھند چھائی ہوئی تھی جب ایک چھوٹا سا طیارہ ایک چھوٹی سے عارضی پٹی سے اڑا۔ اس میں سی آئی اے کے پائلٹ اور چند لوگ سوار تھے۔ نیچے زمین پر تین سو ہمونگ قبانی سپاہی امریکی بندوقیں پکڑے کھڑے تھے، اور ایک کوڈ و رڈ کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ ویتنامی قافلے پر حملہ کی سازش تھی اور اسکو شروع کرنے کیلئے کوڈ و رڈ تھا "سائیکل"۔

یہ وقت تھا جب امریکہ لاوس میں ایک ایسی خفیہ جنگ لڑ رہا تھا جس کو وہ سرکاری طور پر تسلیم نہیں کرتا تھا۔ لاوس دنیا کا وہ ملک ہے جس پر سب سے زیادہ بم بر سائے گئے۔ آٹھ برسوں میں امریکی جہازوں نے اس چھوٹی سے ملک پر اکیس لاکھ ٹن سے زیادہ بارود گراہا۔ ہر آٹھ منٹ بعد ایک بم گراہا تھا۔ اس کے باوجود امریکہ نے کبھی اعلانِ جنگ نہیں کیا۔ سب کچھ خفیہ رکھا گیا۔ ایک ایسی جنگ جونہ کانگریس نے منظور کی، نہ دنیا کو پتا چلا، مگر لاکھوں جانیں لے گئیں۔

یہ کہانی دوسری عالمی جنگ کے بعد شروع ہوتی ہے۔ فرانس نے جب انڈو چائنہ کو تین حصوں میں بانٹا تو لاوس کو ایک بفرزون کے طور پر رکھا۔ فرانس نے اس ملک کی معيشت کو مکمل طور پر نچوڑ دیا تھا۔ بیج دیسمندہ ملک جس میں تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی۔ مگر جیسے ہی ویتنام میں جنگ چھڑی اور کمیونسٹ پارٹی نے مژاہمت شروع کی تو لاوس کے پہاڑوں کا نقشہ بھی بدل گیا۔ ویت نام کے کمیونسٹ جنگجویہاں سے سپلائی لائن چلا رہے تھے۔ امریکہ نے مژاہمت کو پھیلتے دیکھا تو نہایت بیداری سے لاوس پر بمباری شروع کر دی۔ جیسے لاوس کے لوگوں کی زندگی کی کوئی اہمیت نہ ہو اور ایسا ہی تھا، دنیا کو خبر تک نہ تھی کہ لاوس کے لوگوں پر کس قدر ظلم ڈھایا جا رہا ہے۔

یہ آپریشن سی آئی اے کی نگرانی میں چل رہا تھا۔ انہوں نے ہونگ قبیلے کے ایک کمانڈروینگ پاؤ کو چتنا، جو فرانس کا وفادار تھا اور فرانسیسی دور میں بھی لڑکا تھا۔ سی آئی اے نے اسے جدید اسلحہ دیا، پیسے دیے، اور ایک خفیہ فوج کھڑی کر دی۔ اس فوج کو کہا گیا کہ وہ ویتنامیوں کو روکیں۔ طیارے، ہیلی کاپٹر، اور ہزاروں تھائی کمانڈوز لاوس پہنچانے گئے۔ یہ سب کچھ "غیر سرکاری" انداز میں ہوا تاکہ امریکہ براہ راست ملوث نہ لگے۔

ایئر امریکا نام کی ایک جعلی ایئر لائن بنائی گئی جو دراصل سی آئی اے کی ملکیت تھی۔ یہی طیارے فوجی، اسلحہ، اور سامان پہاڑوں میں لے جا رہے تھے۔

یہاں سے انسانی تاریخ کی بدترین بمباری کا دور شروع ہوا۔ سنہ 1965 سے 1973 تک امریکہ نے لاوس پر ساڑھے پانچ لاکھ فضائی حملے کیے۔ تصور کیجیے، ایک چھوٹے سے ملک پر ہر آٹھ منٹ بعد ایک بم گر رہا تھا، دن رات، مسلسل نو سال تک بمباری جاری رہی۔

ان بموں میں لاکھوں کلستر بم بھی شامل تھے جن کے چھوٹے چھوٹے دھماکے خیز ٹکڑے آج تک لاوس کی زمین میں دفن ہیں۔ کلستر بم بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی تھی اور ایک گھنافنا جنگی جرم تھا۔ ایک اندازے کے مطابق اس جنگ میں استعمال ہونے والے اسی فیصد بم پھٹے نہیں تھے۔ آج تک وہاں بچے ان بموں سے مر رہے ہیں۔ امریکہ کی لاوس کے خلاف وہ وحشیانہ بمباری آج بھی لاہو عوام کو اپاہج بنارہی ہے۔

زمین پر ہونگ سپاہی امریکیوں کے حکم پر لڑ رہے تھے۔ وہ پہاڑوں پر چڑھتے، دشمن کی نقل و حرکت بتاتے، اور کبھی خود بھی امریکی بمباری کا شکار ہو جاتے۔ ہر سال ہزاروں مارے جاتے۔ ان کی لاشیں انہی جنگلوں میں دفن ہوتیں جن کے نام دینا نہ کبھی نہیں سنے۔

جب امریکہ نے ویتنام سے نکلنے کا فیصلہ کیا تو ان سپاہیوں کو بھی ویسے ہی پچھے چھوڑ دیا جیسے ویتنام میں اپنے ایکٹنٹوں کو چھوڑا تھا، جیسے افغانستان میں انکے وفادار آخری پروازوں کے ٹاٹرزاں سے لٹک کر مر رہے تھے۔ سی آئی اے نے صرف چند سو لوگوں کو تھائی لینڈ منتقل کیا۔ باقی تیس ہزار سے زیادہ وہیں رہ گئے۔ جنہوں نے برسوں امریکی مفاد کے لیے اپنے ہی لوگوں سے لڑائی لڑی، اپنی قوم کے ان غداروں کو امریکی بے یار و مددگار چھوڑ گئے۔

سنہ 1975 میں جب لاوس کی کمیونسٹ پارٹی پا تھیت لاو کی فوج لانگ تیانگ میں داخل ہوئی تو وہاں کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ صرف خالی بیرکیں، جلے ہوئے توب خانے، اور ایک شستہ حال قبرستان۔ بعد کے برسوں میں لاکھوں لوگ تھامی لینڈ بھاگے۔ ان میں سے کچھ نے امریکہ میں پناہ لی۔ آج بھی ہموگ قبائل کے چند بچ جانے والوں کے بچے امریکی فوج میں خدمات انجام دے رہے ہیں، اسی فوج میں جس نے ان کے قبیلے کو چند ڈالروں کے عوض غداری پر آمادہ کیا اور پھر مرنے کیلئے پچھے چھوڑ دیا۔ جنگ ختم ہو گئی مگر اس کے اثرات آج تک موجود ہیں۔ آج بھی زمین میں لاکھوں بم بکھرے پڑے ہیں جو کسانوں اور بچوں کو مارتے ہیں۔ اب بھی لاوس کی معیشت کمزور ہے کیونکہ جو سڑکیں بنائی گئیں، وہ فوجی سپلائی کے لیے تھیں، تجارت کے لیے نہیں۔ ملک آج بھی غیر ملکی امداد پر چلتا ہے۔

-----فائل 11-AS کا اختتام-----

ملک: انڈونیشیا

سال: 1965

فائل: AS-12

سنہ 1965 کی ایک رات تھی جب جکارتہ میں چھ اعلیٰ فوجی جرنیلوں کو ان کے گھروں سے اٹھا کر قتل کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی انڈونیشیا کا سیاسی راستہ فوراً تبدیل ہو گیا۔ یہ آپریشن اتنا پراسرار اور خونی تھا کہ چند ہی دنوں میں لاکھوں لوگ مارے گئے، ایک پورا سیاسی طبقہ مٹا دیا گیا، اور اس پورے منصوبے کے چھپے امریکہ تھا۔ اس قدر قتل عام ہوا کہ لاشیں ٹھکانے لگانا مشکل ہو گیا۔ اور اس جینو سائیڈ کے بیچوں نجی امریکہ خاموشی سے اس نئی ڈیکٹیٹر شپ کا پارٹنر بن گیا۔

پس منظر سمجھنا ضروری ہے۔ کالونیل ازم کے خاتمے کے بعد نئی آزاد ریاستیں بید غریب اور ندھال تھیں۔ ایسے میں کیونزم کا وعدہ لوگوں کو بہت اچھا لگتا تھا۔ اور یہ مغرب کی اجارہ داری کے خاتمے کا اعلان تھا۔ کیونزم تیزی سے پھیلتا چلا جا رہا تھا، امریکہ کو ویتنام میں شکست کا خوف تھا اور چین کے "کیونست بننے" کا زخم ابھی تازہ تھا۔ اس دور میں انڈونیشیا کی کیونست پارٹی سوویت یونین اور چین کے بعد سب سے مضبوط کیونست پارٹی تھی۔ ایسے میں انڈونیشیا امریکہ کیلئے ایک اہم ٹارگٹ بن چکا تھا۔ دنیا کی سب سے بڑی مسلم آبادی، تیل، رہبر، سونا، اور محلِ وقوع ایسا کہ بحر الکاہل اور بحر ہند کو ملاتا تھا۔ صدر سویکار نو ایک کرشماتی مگر ضدی لیڈر تھے۔ انہوں نے مغرب اور مشرق دونوں کے ساتھ ایک بیلینس قائم کر رکھا تھا۔ ان کی پالیسی "ناسا کوم" کہلاتی تھی، جس میں قوم پرست، مذہبی گروہ اور کیونست تینوں شامل تھے۔ یہی تو ازن امریکہ کو سب سے زیادہ خوفزدہ کر رہا تھا۔ انڈونیشیا کی کیونست پارٹی، پی کے آئی، دنیا کی تیسرا بڑی کیونست تحریک بن چکی تھی۔ اس کے لاکھوں کارکن سرکاری اداروں میں موجود تھے۔ سویکار نو کے ماسکو اور بیجنگ کیساتھ بڑھتے تعلقات واشنگٹن کے لیے ناقابل برداشت تھے۔

پھر وہ رات آئی جس نے سب کچھ بدل دیا۔ تیس ستمبر 1965 کو فوج کے ایک حصے نے اعلان کیا کہ وہ صدر سویکار نو کو بچانے کے لیے کارروائی کر رہے ہیں کیونکہ چند جرنیل سی آئی اے کی مدد سے تختہ اللہ والے تھے۔ ان باغیوں کی قیادت یونیٹ

کرنل انٹونگ کے ہاتھ میں تھی، مگر آپریشن بری طرح ناکام ہوا۔ اگلی صبح جزیر سوہارتو نامی ایک فوجی افسر نے زمام اختیار سنپھال لی۔ اس نے اعلان کیا کہ یہ سب پی کے آئی کی سازش تھی۔ پھر شروع ہوا ایک ایسا خونی انتقام جس کی مثال شاید بیسویں صدی میں نہیں ملتی۔

فوج، اسلامی تنظیمیں، اور عام شہری ایک ساتھ نکلے۔ گاؤں گاؤں، شہر شہر "کیونسٹوں" کی تلاش شروع ہوئی۔ عورتیں، مرد، طالب علم، کسان، جو کوئی بھی بائیں بازو سے ہمدردی رکھتا تھا، اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ سرکاری اندازے کے مطابق ایک ملین لوگ مارے گئے۔ کیونسٹ پارٹی کے مطابق یہ تعداد کتنی گنازیاہ تھی۔ دریا لاشون سے بھر گئے۔ گاؤں کے میدانوں میں اجتماعی قبریں کھودی گئیں۔ اس بھیانک جینوسائیڈ کے پچھے امریکی سی آئی اے کی پلانگ اور حمایت تھی۔

امریکی حکومت کتنی سالوں سے انڈونیشی فوج سے تعلقات بنارہی تھی۔ سی آئی اے اور امریکی سفارت خانے نے فوجی افسروں کو تربیت، اسلحہ، اور پیسہ دیا۔ جب قتل عام شروع ہوا تو امریکی سفارت کار مارشل گرین اور ان کے ساتھیوں نے فوج کو کیونسٹ کارکنوں کی فہرستیں فراہم کیں تاکہ "کام آسان ہو جائے"۔ واشنگٹن میں حکام نے کیبلز بھیجیں کہ یہ "ایشیا میں ایک خوش آئند پیش رفت" ہے۔ دوسرے لفظوں میں، امریکہ نے براہ راست حملہ نہیں کیا، لیکن قاتلوں کو راستہ ضرور دکھایا۔

کچھ ہی مینوں میں سوئیکارنو اقتدار سے الگ کر دیے گئے۔ سوہارتو نے ایک نئی "نیو آرڈر" حکومت قائم کی جو اگلے تیس سال تک ملک پر قابض رہی۔ امریکہ نے اس حکومت کو مالی امداد، اسلحہ، اور سیاسی پشت پناہی فراہم کی۔ انڈونیشیا کیونزم کے خلاف مضبوط قلعہ بن گیا، لیکن اس قلعے کی بنیاد انسانی خون پر رکھی گئی تھی۔ سوہارتو کے دور میں امریکی مدد سے ترقی ہوئی مگر ساتھ ہی کرپشن، فوجی آمیت، اور خوف کا ایسا نظام قائم ہوا کہ اختلاف رائے کو نسلوں تک خاموش کر دیا گیا۔

یہ قتل عام ایک قومی زخم بن گیا۔ انڈونیشیا میں آج بھی لاکھوں خاندان ایسے ہیں جن کے عزیزان دونوں غائب ہوئے یا مارے گئے تھے مگر آج تک ریاست نے اس پر معافی نہیں مانگی۔ سکولوں میں بچوں کو اب بھی یہ پڑھایا جاتا ہے کہ کیونسٹوں نے غداری کی تھی اور فوج نے ملک بچایا تھا۔ حقیقت بتانے والے صحافی، فلم ساز، اور محقق آج بھی دھمکیوں کا سامنا کرتے ہیں۔

سوہارتو کے جانے کے بعد 1998 میں جمہوریت تو آئی، مگر انصاف نہیں آیا اور نہ ہی عوام میں کبھی سیاسی شعور دوبارہ واپس آ سکا۔ جو لوگ قتل عام میں شریک تھے، وہ آج بھی سیاست، فوج، اور کاروبار میں طاقتور ہیں۔ کچھ نوجوان اب سچ جاننے کی کوشش کر رہے ہیں، مگر ریاستی بیانیہ اب بھی غالب ہے۔

-----فائل AS-12 کا اختتام-----

ملک: کمبوڈیا

سال: 1970

فائل: AS-13

ستہرہ مارچ 1970 کی رات جب کمبوڈیا کے شہزادہ نورودم سہانوک پیرس جانے والے طیارے میں بیٹھے شیمپین پی رہے تھے، اسی وقت پھنوم پنځ کے شاہی محل کے صحن میں کمبوڈین فوج کے ٹینک داخل ہو رہے تھے۔ چند منٹوں میں اعلان ہوا کہ باڈشاہت ختم کر دی گئی ہے، کمبوڈیا ایک نیا ملک بن چکا ہے جس کا نام "خمیر ریپبلک" ہے۔ اور اگلے ہی گھنٹے واشنگٹن سے مبارکباد کا پیغام پہنچ گیا۔ ایک خود مختار، غیر جانبدار ملک کو امریکہ نے پلک جھپکتے اپنے خونی کھیل کا حصہ بنا دیا۔

آنے پہلے پس منظر سمجھیں۔ پنس سہانوک نے 1953 میں فرانس سے آزادی کے بعد اپنے ملک کو غیر جانبدار رکھنے کی پالیسی اپنائی۔ انکا نظریہ تھا کہ اگر ویتنام کی جنگ میں کسی فریق کا ساتھ دیا تو کمبوڈیا اپنی خود مختاری کھو دے گا۔ اسی لیے وہ شمالی ویت نامیوں کو سرحدی علاقوں میں موجود رہنے دیتے تھے تاکہ وہ کمبوڈین سر زمین کے اندر گھر ائی میں داخل نہ ہوں۔ یہ خطرناک توازن برسوں تک چلتا رہا۔ مگر امریکہ کو یہ بات ہضم نہ ہوئی۔ واشنگٹن کے لیے سہانوک ایک ایسا رہنمای بن گیا جو ان کے مفادات کی راہ میں رکاوٹ تھا۔

یہاں سے خفیہ آپریشن کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس نے پورے خط کو بر باد کر دیا۔ 18 مارچ 1969 کو صدر نکسن نے "آپریشن مینو" کی منظوری دی۔ یہ کمبوڈیا کے اندر خفیہ بمباری کا آغاز تھا۔ امریکی بمبار طیاروں نے ایک سال کے دوران ایک لاکھ آٹھ ہزار ٹن بم برسائے۔ یہ بمباری اتنی خوفناک تھی کہ کسانوں کے کھیت بخر ہو گئے۔ ہزاروں دیہات تباہ ہوئے، لاکھوں لوگ بے گھر ہو گئے۔ واشنگٹن نے نقشے بدلتے تاکہ دنیا کو دکھایا جاسکے کہ جملے جنوبی ویت نام میں ہو رہے ہیں، کمبوڈیا میں نہیں۔

اسی دوران سہانوک یورپ میں علاج کے لیے گئے۔ ان کی غیر موجودگی میں ان کے اپنے وزیر دفاع جزل لون نول نے امریکی سفارت کاروں سے خفیہ ملاقاتیں شروع کر دیں۔ ایک امریکی کیبل کے مطابق لون نول نے واضح الفاظ میں کہا کہ اگر سہانوک

واپس آئے تو وہ اقتدار نہیں چھوڑیں گے۔ 17 مارچ کو سہانوک کے پیرس روانہ ہوتے ہی کمبودیا کے دار الحکومت پھنوم پنخ میں امریکی حمایت یافتہ ریڈیو اسٹیشن نے ان کے خلاف مہم شروع کر دی۔ اگلے دن اسمبلی نے متفقہ طور پر انہیں برطرف کر کے جزل لون کو سربراہ مملکت بنادیا۔ اسی لمحے امریکہ نے "نتی حکومت" کو مبارکبادی اور فوجی امداد بخشجئے کا اعلان کر دیا۔ بغاوت کمبودیا کے لیے تباہی کا آغاز تھی۔ جزل لون نے اقتدار میں آتے ہی شمالی ویتنامی فوجوں کو ملک سے نکلنے کا حکم دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ویتنامی افواج نے کمبودیا کے اندر پیش قدمی شروع کر دی اور ملک کے دیہی علاقوں میں خانہ جنگی بھڑک اٹھی۔ اسی آگ میں خمیر روج نامی گروہ پیدا ہوا جو بعد میں تاریخ کے بدترین قاتل بنے۔

امریکہ نے فوری طور پر فوجی مداخلت کی۔ 29 اپریل 1970 کو امریکی اور جنوبی ویتنامی افواج نے "کمبودین انکرشن" کے نام سے زینی کارروائی شروع کی۔ بیس ہزار امریکی اور بارہ ہزار ویتنامی فوجی کمبودیا میں داخل ہوتے۔ مقصد یہ بتایا گیا کہ وہ شمالی ویت نام کے عسکری ہیڈ کوارٹرز کو تباہ کریں گے، مگر حقیقت یہ تھی کہ اس حملے نے پورے کمبودیا کو جنگ کی لپیٹ میں لے لیا۔ لاکھوں لوگ بے گھر ہوتے، ہزاروں مارے گئے، اور کمبودین فوج کی نااہلی کھل کر سامنے آگئی۔

ایک سال بعد امریکہ نے لاوس کے راستے ایک اور مہم "آپریشن لام سن 719" شروع کی۔ اس کا نتیجہ پہلے سے زیادہ تباہ کن نکلا۔ ہزاروں فوجی مارے گئے، سینکڑوں امریکی ہیلی کاپٹر گراتے گئے، اور امریکہ کو احساس ہوا کہ اس نے ویت نام کی جنگ کمبودیا تک پھیالی ہے۔

اب ذرا نتائج دیکھتے۔ سنہ 1970 سے 1975 کے درمیان کمبودیا میں تین لاکھ لوگ مارے گئے۔ دو ملین لوگ بے گھر ہوتے۔ معیشت تباہ ہو گئی، چاول کی پیداوار ختم ہو گئی اور مہنگائی آسمان کو چھوٹنے لگی۔ انہی حالات میں خمیر روج نے دیہات میں اپنی جڑیں مضبوط کیں۔ وہی خمیر روج جنہوں نے بعد میں پندرہ لاکھ کمبودین شہریوں کو قتل کیا۔ یہ سب اسی امریکی مداخلت کا براہ راست نتیجہ تھا۔

امریکہ نے اس عرصے میں کمبودیا پر اسی لاکھ بم بر ساتے۔ آج بھی ان بموں کا دسوائ حصہ زین میں دفن ہے۔ ہر ہفتے کوئی نہ کوئی کسان یا بچہ ان پھٹے بغیر بموں کا شکار ہوتا ہے۔ سنہ 1975 میں جب پول پاٹ کی فوجیں پھنوم پنخ میں داخل ہوئیں تو انہوں نے لون نول اور نکسن کی تصویریں ساتھ ساتھ لگا کر انہیں "عظمی مجرم" قرار دیا۔

اگر آپ آج کمبوڈیا جائیں تو آپ کو اس جنگ کے زخم زین پر بھی نظر آئیں گے اور لوگوں کے دلوں میں بھی۔ میں کمبوڈیا گیا ہوں، وہاں پر سیاح پرانے مندروں اور محلوں کو دیکھنے کے فوراً بعد ایک دم ستر کی بیانی میں ہوئے جنگی جرائم کے نشانات کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ جب آپ بدنام زمانہ S21 (Tuol Sleng) جیل ہو کر آتے ہیں تو فضاء ایک دم بدل جاتی ہے۔ وہ جیل آپ کے دل و دماغ پر بہت گہرا اثر چھوڑتی ہے۔ کمبوڈیا کی میں امریکی معاشرت کے بعد کبھی سنبل نہیں پائی۔ چینی انوسمنٹ نے کمبوڈیا کو تیز ترقی دی تھی مگر امریکی پابندیوں نے ایک بار پھر معاشی حالات کو مخدوش کر دیا ہے۔ انفراسٹرکچر قرضوں سے بنتا ہے، اور سیاست فوج کے ہاتھ میں ہے۔ سنہ 1970 کی وہ بغاوت کمبوڈیا کی سیاست کے لیے ایک مثال بن گئی۔ سنہ 1997 اور 2023 کے فوجی اقدامات اسی روایت کا تسلسل ہیں۔

کمبوڈیا کی کہانی بھی وہی پرانی کہانی ہے جسے دنیا بھر میں بار بار دہرایا گیا تھا۔ ہمیں یہی پڑھایا جاتا ہے کہ خمیر روج بہت ظالم گروہ تھا۔ یہ کسی نے نہیں بتایا کہ وہ گروہ 1970 کے امریکی "رجیم چینچ" آپریشن کا منطقی نتیجہ تھا۔

-----فائل 13-AS کا اختتام-----

ملک: ایسٹ تیمور

سال: 1975

فائل: AS-14

سات دسمبر 1975 کی صبح انڈونیشیا کے فوجی جہازوں سے پیر اشوٹ بردار فوجی مشرقی تیمور کے دار الحکومت ڈلی کے اوپر اتر رہے تھے۔ صرف نو دن پہلے تیمور کے منتخب رہنماؤں نے اپنی آزادی کا اعلان کیا تھا۔ لیکن یہ اعلان نہ تو انڈونیشیا کے صدر سوہارتو اور نہ ہی امریکہ کے صدر نکسن کو قبول تھا۔ اگلے چونیس سال تک اس چھوٹے سے جزیرے پر انڈونیشیا کا قبضہ رہا اور ایک لاکھ سے زیادہ بے گناہ شہری مارے گئے۔ یہ حملہ جکارتہ نے کیا لیکن اشارہ واشنگٹن اور کینبرا سے ملا تھا۔ امریکہ اور آسٹریلیا دونوں نے پہلے ہی طے کر لیا تھا کہ وہ ایسٹ تیمور کو آزاد نہیں ہونے دیں گے۔

پس منظر سمجھنے کے لیے تھوڑا پچھے جانا ضروری ہے۔ سنہ 1974 میں پرتگال میں فوجی انقلاب آیا جس نے صدیوں پرانی آمریت ختم کر دی۔ پرتگال نے اپنی کالوینیاں چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور ایسٹ تیمور میں تین سیاسی جماعتیں ابھریں۔ فریلن جو آزادی چاہتی تھی، یوڈی ٹی جو پرتگال سے تعلق رکھنا چاہتی تھی، اور سب سے چھوٹی جماعت اپوڈیٹی جو انڈونیشیا کے ساتھ الحاق کی حامی تھی۔ کچھ میں بعد فریلن اور یوڈی ٹی نے آزادی کے لیے اتحاد کر لیا لیکن امریکہ کو خداشہ ہوا کہ یہ چھوٹا سا ملک کہیں "دوسری کیوبہ" نہ بن جائے۔ ایسٹ تیمور میں سو شلسٹ تحریک کافی مضبوط تھی۔ اس خوف میں انڈونیشیا نے امریکہ اور آسٹریلیا کی مدد اور آشیباد سے ایک خفیہ مہم شروع کی جس میں افواہیں، جعلی یہادات اور سازشیں شامل تھیں تاکہ مشرقی تیمور کے اندر خلفشاپیدا ہو۔

اگست 1975 میں یوڈی ٹی نے بغاوت کی کوشش کی جو ناکام رہی لیکن اس میں ہزاروں لوگ مارے گئے۔ باغیوں کو انڈونیشیا لے جایا گیا جہاں ان سے زبردستی ایک "درخواست" پر مستخط کروائے گئے کہ وہ انڈونیشیا میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ سوہارتو کے لیے اب حملہ کرنے کا بہانہ تیار ہو چکا تھا۔ اکتوبر میں انڈونیشی فوج نے سرحدی قصبے بالی پر حملہ کیا جہاں پانچ آسٹریلیوی صحافی

مارے گئے۔ چند ہفتے بعد ایک جعلی معاہدہ تیار کیا گیا جس میں چند کٹھپتی رہنماؤں نے انڈونیشیا سے "انضمام" کی درخواست کی۔ جب فریٹلن نے 28 نومبر کو آزادی کا باضابطہ اعلان کیا تو انڈونیشیا نے تیاری مکمل کر لی تھی۔

اس دوران ایک اور اہم واقعہ رونما ہوا۔ چھ دسمبر کو امریکی صدر جیرالڈ فورڈ اور وزیر خارجہ ہنری کسنجر جاپان سے واپس آتے ہوئے جکارتہ رکے۔ سوہارتو نے ان سے جلد کارروائی کی اجازت مانگی۔ فورڈ نے کہا کہ ہم صحیح ہیں اور آپ پر دباؤ نہیں ڈالیں گے۔ کسنجر نے صرف اتنا کہا کہ حملہ اس وقت کیجیے جب ہم یہاں سے واپس جا چکے ہوں تاکہ "ملی بھلکت" نہ لگے۔ اگلی صبح انڈونیشیا کے فوجی جزیرے میں اتر چکے تھے۔

انڈونیشی فوج نے "آپریشن لوئس" کے نام سے مشرقی تیمور پر چڑھائی کی۔ ہزاروں فوجی، جنگلی جہاز اور یونک ایک ایسے علاقے میں داخل ہوئے جہاں آزادی پسندوں کے پاس پرانی خستہ حال بندوقوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ چند ہفتوں میں ساحلی علاقے قابو میں آگئے۔ لاکھوں لوگ پہاڑوں کی طرف بھاگے۔ فضائی بمباری، بھوک اور بیماری نے ان کی جانبیں لیں۔ صرف پہلے سال میں ساٹھ ہزار افراد مارے گئے۔

امریکہ اور آسٹریلیا کی حمایت پوری طاقت سے جاری رہی۔ امریکی اسلحہ، طیارے، بم اور امداد مسلسل پہنچتی رہی۔ آسٹریلیا نے انڈونیشیا کے قبضے کو چند سال بعد تسلیم کر لیا کیونکہ اسے سمندر میں تبل کے ذخائر چاہیے تھے۔ دونوں ملکوں نے اقوام متحده میں ہر قرارداد پر خاموشی اختیار کی۔ جب عالمی ادارہ انسانی حقوق کا وفد بھیجننا چاہتا تھا تو آسٹریلیا نے اسے روکنے میں انڈونیشیا کا ساتھ دیا۔

انسانی جانوں کی قیمت ناقابلِ یقین تھی۔ مشرقی تیمور کے کمیشن برائے سچائی و مفاہمت کے مطابق سنہ 1974 سے 1989 کے دوران ایک لاکھ سے زیادہ لوگ مارے گئے۔ ان میں سے ستر فیصد قتل انڈونیشی فوج نے کیے۔ اس کے باوجود مغربی امداد بند نہیں ہوئے۔ امریکہ نے انڈونیشیا کو مزید لڑاکا طیارے دیے۔ آسٹریلیا نے ان کی فوجی تربیت کی۔ عالمی یونک کے قرضے جاری رہے۔

پھر بارہ نومبر 1991 کا دن آیا۔ ڈلی کے ایک قبرستان میں ایک جنازے کے دوران انڈونیشی فوج نے پر امن مظاہرین پر گولیاں چلاتیں۔ دو سو ستر سے زیادہ لوگ مارے گئے۔ یہ منظر غیر ملکی کیروں نے ریکارڈ کر لیا اور دنیا کو پہلی بار معلوم ہوا کہ مشرقی تیمور

میں کیا ہو رہا ہے۔ احتجاج دنیا بھر میں پھیل گیا۔ اس وقت تک کمیونزم دنیا سے پسپا ہو چکا تھا، امریکہ کے مقاصد تبدیل ہو چکے تھے۔ امریکہ کے بنائے ہوئے مسلم ڈکٹیٹریز ایک بوجھ بن چکے تھے۔ امریکی کانگریس نے اسلحہ کی فروخت روک دی۔ لیکن مغرب نے اپنے وفادار سوہارت سے تعلقات مزید کچھ عرصہ تک برقرار رکھے۔

آخر کار 1997 میں سہارت کو اقتدار سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد نئے صدر نے مشرقی تیمور میں ریفرنڈم کا اعلان کیا۔ تیس اگست 1999 کو اٹھر فیصلہ عوام نے آزادی کے حق میں ووٹ دیا۔ انڈونیشی فوج نے بدلتے لیا، شہر جلا دیے اور ہزاروں کو قتل کیا۔ اس بار امریکہ اور آسٹریلیا کا مفاد ایسٹ تیمور میں ایک کرسچن حکومت بنانے میں تھا۔ آسٹریلیا نے امن فوج کی قیادت کی اور چند ماہ بعد اقوام متحدہ نے وہاں عبوری حکومت قائم کر دی۔

سنہ 2002 میں مشرقی تیمور آزاد ہوا لیکن کہانی ختم نہیں ہوئی۔ سنہ 2018 کے نئے معابرے کے تحت سمندر کے بڑے گیس ذخائر کا ستر فیصلہ آسٹریلیا کے حصے میں چلا گیا۔ سچ یہ ہے کہ مغرب نے ایسٹ تیمور کی آزادی کیلئے نہیں بلکہ اپنے مفاد کیلئے اس ملک کو الگ ہونے میں مدد دی تھی۔ آپ نے بھی ایسٹ تیمور کے بارے میں مغرب کی سنائی ہوئی ایک ادھوری کہانی سن رکھی ہو گی۔ مجھے 1996 میں انڈونیشیا جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ مجھے ملاشیا میں کشمیری کمیونٹی نے کشمیر پر آگاہی مہم کے سلسلے میں اندونیشیا بھیجا تھا جہاں میں جکارتہ یونیورسٹی میں طلباء کے ایک گروپ سے اس سلسلے میں ملا تھا تو انہوں نے حق خود ارادی کے حوالے سے مجھے پوچھا کہ آپ ایسٹ تیمور کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ میرے لئے یہ ایک بہت مشکل سچویشن تھی۔ میں کیا کہتا کہ آپ ایسٹ تیمور میں وہی زیادتی کر رہے ہیں جو انڈیا کشمیر میں کر رہا ہے؟

آج بھی ہر سال سات دسمبر کو تیمور کے نوجوان اپنے شہیدوں کی تصویریں لے کر سانتا کروز قبرستان تک مارچ کرتے ہیں۔ آج ان کے اتحادی وہی لوگ ہیں جو کبھی ان کے قاتلوں کے ساتھی تھے بلکہ انہی لوگوں نے ایسٹ تیمور کے لوگوں کے قتل عام کا حکمنامہ جاری کیا تھا۔

مغرب والے آج یہ کہتے ہیں کہ ہم جمہوریت کے ساتھی ہیں، مگر تاریخ کیسے بھولنے دے گی کہ آپ نے جنرل سوہارت کو نامزد کیا تھا اور ایسٹ تیمور سے پہلے آپ کے ساتھی جنرل سوہارت نے کیونٹوں کا جینو سائیڈ کیا تھا اور آپ نے اسے سرکاری طور پر سراہا

بھی تھا۔ مغرب کیلئے صرف مفادات اہم ہیں۔ جمہوریت، ہیومن رائٹس اور آزادی اظہار جیسی چیزیں صرف پروپیگنڈہ کے ٹول ہیں۔

-----فال 14-AS کا اختتام-----

ملک: افغانستان

سال: 1979

فال: AS-15

دسمبر 1979 کی ایک سرد رات تھی جب سوویت یونین کی افواج اچانک کابل میں اتریں۔ چند گھنٹوں کے اندر پورا شہر ان کے کنٹرول میں آگیا۔ اس واقعے نے نہ صرف افغانستان کی تاریخ بدل دی بلکہ پوری دنیا کی سیاست کو ایک نئے موڑ پر لاکھرا کیا۔ اس کے بعد شروع ہونے والی جنگ نے ایک ایسی آگ بھڑکائی جو آج تک جل رہی ہے۔

افغانستان صدیوں سے بڑی طاقتیوں کے بیچ ایک گزرگاہ رہا ہے۔ کبھی برطانیہ اور روس کے درمیان، کبھی مشرق اور مغرب کے درمیان۔ بیسویں صدی کے وسط میں افغانستان نے ایک توازن برقرار رکھا۔ اس نے امریکہ اور سوویت یونین دونوں سے امداد لی، مگر خود کو کسی ایک بلاک کے ساتھ باندھنے سے گریز کیا۔ مگر اپریل 1978 میں یہ توازن ٹوٹ گیا۔ کمیونسٹ پارٹی "ثور" نامی انقلاب کے ذریعے اقتدار میں آگئی۔ نئی حکومت نے اصلاحات نافذ کیں۔ زینوں کی تقسیم کی، عورتوں کو حقوق دئے، اور سیکولر اسلام اختیار کیا۔ یہ روشن خیال، پڑھے لکھے طبقے کا انقلاب تھا، ملک کی دیہی آبادی سماجی پسماندگی اور مذہبی توبہات کا شکار تھی۔ چند ہی ماہ میں پورا ملک خانہ جنگی میں ڈوب گیا۔ کمیونسٹ پارٹی منظم نہیں تھی۔ امریکہ اور اسکے اتحادیوں نے کتنی سال پہلے ہی شدت پسند اسلامی نظریات جیسے کہ وہابیت، سلفیت اور تکفیریت میں انوسمنٹ شروع کر رکھی تھی۔ سوویت یونین کو خطرہ تھا کہ اگر یہ حکومت گری تو سرحد پار و سطی ایشیا میں اسلامی تحریکیں پھیل جائیں گی۔ اسی وجہ سے سوویت یونین نے کمیونسٹ پارٹی کی حکومت کو سہارا دینے کیلئے فوجی مداخلت کی۔

جب سوویت افواج افغانستان میں داخل ہوئیں تو واشنگٹن کو وہ موقع مل گیا جس سے وہ ویتمام جنگ کا بدلہ چکا سکتا تھا۔ صدر جمی کارٹر نے اسے سوویت جاریت قرار دیا اور ساتھ ہی سوویت یونین کا "گرم پانیوں تک رسائی" والا بیانیہ ترتیب دیا۔ جمی کارٹر نے اعلان کیا کہ امریکہ خلیج فارس پر کسی یورپی طاقت کے قبضے کو برداشت نہیں کرے گا۔ ابتداء میں امریکہ نے خفیہ طور پر

مزاحمتی گروہوں یعنی مجاہدین کو مدد دینا شروع کی جنہیں امریکی کتنی سال پہلے ہی تیار کر رہا تھا۔ مگر جب رونڈر ریگن برسر اقتدار آیا تو یہ مدد ایک باقاعدہ جنگی منصوبے میں بدل گئی۔ امریکہ نے فیصلہ کیا کہ افغانستان میں کھل کر سوویت یونین سے ویتنام کا بدله چلا یا جائے۔

یہ منصوبہ پاکستان کے ذریعے عمل میں لایا گیا۔ جزء ضماء الحق کے دور میں پاکستان کی اٹیلی جنس ایجنسی آئی ایس آئی کو مرکزی کروار ملا۔ امریکہ نے اربوں ڈالر کی رقم، اسلحہ اور معلومات فراہم کیں اور پاکستان نے طے کیا کہ کون سے گروہ کتنی امداد حاصل کریں گے۔ ایسے میں آئی ایس آئی نے اعتدال پسند یا قومی مزاج رکھنے والے گروہوں کے بجائے سخت گیر اسلامی تنظیموں کو ترجیح دی۔ انہی میں گل بدین حکمت یار کا حزب اسلامی گروپ بھی شامل تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ مجاہدین کو جدید اسلحہ ملا، خاص طور پر امریکی ساختہ سنگر میزائل، جس نے سوویت ہیلی کاپڑوں کے لیے آسمان کو خطرناک بنادیا۔ اسی دوران ایک اور سلسلہ شروع ہوا۔ عرب دنیا سے ہزاروں نوجوان افغانستان پہنچنے لگے جنہیں ”جہاد“ کی آواز دی جا رہی تھی۔ انہی میں ایک سعودی نژاد نوجوان اسماء بن لادن بھی تھا، جس نے اپنی دولت اور تنظیمی صلاحیت سے ایک مرکز قائم کیا جہاں دنیا بھر سے آنے والے رضاکاروں کو منظم کیا گیا۔ یہی مرکز آگے چل کر القاعدہ کی بنیاد بنا۔ دس سال تک جاری رہنے والی اس جنگ نے سوویت یونین کو اندر سے ہلا دیا۔ پندرہ ہزار سے زائد فوجی مارے گئے، معیشت تباہ ہوئی، اور آخر کار مئی 1988 میں سوویت حکومت نے جنیوا معاهدے پر دستخط کیے۔ فروری 1989 میں ان کی فوج واپس چلی گئی۔ دنیا نے اسے مجاہدین کی فتح کہا، مگر اصل میں یہ افغانستان کی تباہی کا آغاز تھا۔ امریکہ نے جنگ ختم ہوتے ہی رخ موڑ لیا۔ اپنے وفادار مجاہدین کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کیا اور انہیں دہشتگرد قرار دے دیا۔ یہاں تک کہ پاکستان کو ان دہشتگروں کا سہولت کار قرار دے کے پاکستان کو ایک سازشی ریاست (Rougue State) قرار دے دیا۔ اسلحہ سے لیس گروہ آپس میں لڑنے لگے۔ کابل کھنڈ بن گیا، اور انہی حالات میں طالبان نامی نئی قوت ابھری۔ انہوں نے امن اور شریعت کا وعدہ کیا اور دو سال کے اندر کابل پر قبضہ کر لیا۔

طالبان نے اسماء بن لادن کو پناہ دی۔ القاعدہ نے وہی جنگ جو افغانستان میں شروع ہوئی تھی، دنیا بھر میں پھیلا دی۔ ان کا نیا ہدف امریکہ اور اس کے اتحادی بنے۔ 11 ستمبر 2001 کو نیویارک میں ہونے والے میزند حملے اسی داستان کا وہ موڑ تھے جس

کے بعد دہشتگردی کا بہانہ بننا کر امریکہ نے افغانستان سمیت تمام مسلم ممالک پر چڑھائی کر دی، اور یہ جنگ دو ہائیوں تک جاری رہی۔ دہشتگردی کے خلاف نام نہاد جنگ کو امریکہ کو اس لئے روکنا پڑا کیونکہ اسے چین کی شکل میں ایک زیادہ بڑا خطرہ نظر آنے لگا تھا۔

آج جب ہم ماضی پر نظر ڈالتے ہیں تو صاف دکھائی دیتا ہے کہ 1980 کی دہائی میں اپنائی گئی امریکی پالیسی بعد میں عالمی دہشت گردی کا ذریعہ بنی۔ امریکہ نے ایک دشمن کو کمزور کرنے کے لیے دوسرے کو طاقتوں بنایا، اور پھر اسی دشمن نے اسے خود نشانہ بنایا۔ پاکستان اور امریکہ کے تعلقات بھی اسی دور کے بوجھ تھے آج تک دبے ہوئے ہیں۔ شک، بد اعتمادی اور مستضاد مفادات کا یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا۔

آج ایک بار پھر امریکہ اور اسکے اتحادی افغانستان میں دہشتگروں کو جمع کر رہے ہیں۔ افغانستان میں یہ دہشتگرد پاکستان کے خلاف لڑ رہے ہیں۔ اس بار ان دہشتگروں کو خطے میں سے بھارت مدد فراہم کر رہا ہے۔ دہشتگردی اور اسلامی شدت پسندی کو دوبارہ موقع دینے کا وقت آچکا ہے۔ اس بار نشانہ پاکستان، ایران، روس اور چین ہیں۔ دنیا کے لوگ افغان جہاد کے حوالے سے پتہ نہیں کیا تاثر بنائے میٹھے ہیں لیکن پاکستانی اس کہانی کی تباخ حقیقتوں کو سمجھتے ہیں۔ دہشتگردی شدت پسند اسلامی نظریات کی ترویج کے ذریعے پھیلی۔ اس کو پھیلانے والے امریکہ، اسلامی ممالک کے مغرب نواز حکمران اور جرنبیل تھے۔

-----فائل 15-AS کا اختتام-----

**ملک: افغانستان**

**سال: 2021**

**فال: AS-16**

---

پندرہ اگست 2021 کو جب طالبان نے کابل پر دوبارہ قبضہ کیا تو دنیا حیران تھی کہ امریکہ کی بیس سالہ نام نہاد "دہشتگردی کے خلاف جنگ" صرف چند دنوں میں کیسے پیٹ دی گئی۔ وہی طالبان جنہیں 2001 میں امریکہ نے زین بوس کر دیا تھا، ایک بار پھر اقتدار میں واپس آچکے تھے۔ لوگوں کے ذہنوں میں سینکڑوں سوال تھے مگر جوابات کوئی نہیں دے رہا تھا۔ امریکہ نے تو ایسے بات دبائی کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ لیکن یہ کہانی صرف امریکی ناکامی کی نہیں ہے کہ امریکی پرویگنڈہ میں دب کر بھلا دی جاتے۔ یہ چالیس سالہ داستان ہے، مغرب کی منافقاتہ جنگی پالیسی کی، مسلم حکمرانوں، جرنیلوں اور مذہبی رہنماؤں کی موقع پرستی کی اور کروڑوں مسلمانوں کی جنہیں انکی مرضی کے خلاف جنگ کی آگ میں جھونک دیا گیا۔ وقتی فائدہ دیکھنے والوں نے مذہب عقائد اور سماجی روایات کو شدت پسندی اور دہشتگردی میں بدل دیا اور عام مسلمانوں کی نسلوں کو تباہی کی راہ پر ڈال دیا۔

سنہ 1970 کی دبائی کے آخر میں افغانستان ایک پر سکون مگر غریب ملک تھا۔ سوویت یونین اور امریکہ دونوں اس کے ساتھ ترقیاتی منصوبے چلا رہے تھے۔ لیکن اپریل 1978 میں سب کچھ بدل گیا۔ افغانستان کی کمیونسٹ جماعت پی ڈی پی اے نے انقلاب ثور کے نتیجے میں اقدار سنبحاں لیا۔ اس نئی حکومت نے اصلاحات متعارف کروائیں، زینوں کی تقسیم کی، خواتین کو حقوق دئے، سیکولر ازم کو اپنایا اور ظالمانہ و غیر منصفانہ قبائلی نظام کو توڑنے کی کوشش کی۔ یہ سب کچھ افغانستان کے روایتی معاشرے کے لیے نیا تجربہ تھا۔ امریکہ نے پہلے ہی اسلامی شدت پسندی کے بیچ بور کھے تھے۔ امریکہ کی شہر پر مزاحمت شروع ہوئی، بغاوتیں پھیل گئیں اور چند ہی ماہ میں پورا ملک خانہ جنگی میں ڈوب گیا۔ دسمبر 1979 میں سوویت یونین نے اپنی فوجیں کابل بھیجیں تاکہ اپنی حمایت یافتہ حکومت کو بچایا جاسکے۔ اس وقت کسی نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ قدم سوویت سلطنت کے زوال کا آغاز بن جائے گا۔

جب روسي فوجیں کابل میں داخل ہوئیں تو واشنگٹن کو وہ موقع مل گیا جس کا اسے انتظار تھا۔ صدر جمی کا رڑنے اسے دوسرا عالمی جنگ کے بعد سوویت یونین کی سب سے بڑی جاریت قرار دے دیا۔ امریکہ نے فوراً فیصلہ کیا کہ وہ افغان مجاهدین کو مدد دے گا حالانکہ یہ کام کتنی سال پہلے سے شروع ہو چکا تھا۔ اس خفیہ منصوبے کو "آپریشن سائیکلوں" کا نام دیا گیا۔ شروع میں یہ مدد محدود تھی لیکن جب رونالڈ ریگن صدر بنے تو اسے ایک مقدس جنگ کے طور پر پیش کیا گیا۔ مقصد تھا سوویت یونین کو افغانستان میں الجھا کر مارنا۔ سی آئی اے نے پاکستان کی آئی ایس آئی کے ذریعے کروڑوں ڈالر کے ہتھیار اور پیسے مجاهدین کو پہنچایا۔ سعودی عرب نے برابر کی رقم دی۔ سعودی عرب سے ایک نوجوان انجینئر اسماء بن لادن کو پشاور پہنچایا گیا۔ اس نے اپنے استاد عبدالله عزام کے ساتھ مل کر مکتب الخدمات قائم کیا۔ یہ تنظیم دنیا بھر سے نوجوانوں کو افغانستان لاتی تھی تاکہ وہ جہاد میں شامل ہوں۔ ان میں سے ہزاروں نے جنگ کا تجربہ حاصل کیا اور ایک عالمی اسلامی نیٹ ورک وجود میں آگیا جسے بعد میں دنیا القاعدہ کے نام سے جانتے لگی۔

یہ جنگ سوویت یونین کے لیے ایک نہ ختم ہونے والا زخم بن گئی۔ پندرہ ہزار روسي فوجی مارے گئے، لاکھوں افغان جان سے گئے، اور بالآخر 1988 میں جنیوا معہدے کے بعد سوویت فوجیں واپس چلی گئیں۔ امریکہ نے اپنا مقصد حاصل کر لیا تھا۔ لیکن جیسے ہی روسي فوجیں نکلیں، واشنگٹن نے افغانستان سے نظریں پھیر لیں۔ امداد بند کر دی گئی، ملک تباہ ہو چکا تھا اور مجاهدین آپس میں لڑنے لگے۔ کابل کھنڈ بن گیا۔ لاکھوں لوگ مارے گئے۔ انہی حالات میں 1994ء میں ایک نیا گروہ سامنے آیا۔ وہ خود کو طالبان کہتے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ بد امنی ختم کریں گے، اسلامی نظام نافذ کریں گے اور ملک کو ایک بنائیں گے۔ ان کی قیادت ملا عمر کے ہاتھ میں تھی۔ پاکستان نے انہیں مددی کیونکہ وہ انہیں افغانستان میں اپنا اثر قائم رکھنے کا ذریعہ سمجھتا تھا۔ طالبان نے دو سال کے اندر اندر کابل فتح کر لیا اور 1996ء میں اپنی حکومت قائم کر لی۔

طالبان کے دور میں افغانستان میں امن قائم ہوا۔ امریکہ نے اپنے ہیر و مجہدین کے ساتھ ساتھ طالبان کو بھی دہشتگرد قرار دے دیا، پاکستان کو دہشتگردی کی حامی سرکش ریاست (Rogue State) کا ٹائیتل دیا گیا۔ اور پھر پوری مسلم دنیا ہی کو شدت پسند قرار دے دیا گیا۔ مغرب نے نئے اور پرانے مجہدین کے خلاف دنیا بھر میں آپریشن شروع کیا۔ اسی دوران اسماء بن لادن افریقہ سے افغانستان واپس آگیا اور طالبان کے تحفظ میں اپنی تنظیم القاعدہ کو مضبوط کرنے لگا۔ امریکہ کو موقع گیارہ ستمبر 2001ء

کو ملا۔ ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور بینٹا گون پر حملوں میں تین ہزار سے زائد امریکی مارے گئے۔ دنیا کی سر بدل گئی۔ امریکہ نے ورلڈ ٹریڈ سینٹر پر حملوں کا الزام فوری طور پر القاعدہ کے سر ڈال کر دنیا بھر کے مسلمانوں کو نشانے پر رکھ لیا۔ امریکہ نے طالبان سے اسامہ کو حوالے کرنے کا مطالبہ کیا۔ جب انہوں نے انکار کیا تو امریکہ نے حملہ کر دیا۔

سنہ 2001 کے آخر تک طالبان حکومت گر چکی تھی۔ حامد کرزی کو صدر بنایا گیا۔ نیٹو افواج تعینات ہوئیں اور امریکہ نے نیشن بلڈنگ کے نام پر یہ سالہ جنگ کا آغاز کیا۔ دو ٹریلین ڈالر سے زیادہ خرچ ہوئے، لاکھوں افغان فوجیوں کو تربیت دی گئی، مگر اصل مسئلہ حل نہ ہوا۔ کرپشن، ناالی، اور قبائلی تقسیم نے حکومت کو کمزور رکھا۔ طالبان پاکستان کے قبائلی علاقوں میں پناہ لیتے رہے۔ امریکی فوج کے اخلاقاء کے ہر منصوبے کے باوجود جنگ ختم نہیں ہو رہی تھی۔ صدر اوباما نے 2010 میں ایک لاکھ فوجیوں کی تعیناتی کا حکم دیا مگر یہ بھی عارضی حل نکلا۔ بالآخر 2020 میں صدر ٹرمپ نے طالبان سے براہ راست معاهدہ کیا۔ افغان حکومت کو مذکورات میں شامل ہی نہیں کیا گیا۔ اس معاهدے کے مطابق امریکہ نے وعدہ کیا کہ وہ 2021 تک اپنی تمام فوجیں نکال لے گا۔ صدر باتیڈن نے یہی پالیسی جاری رکھی۔ اگست 2021 میں جیسے ہی امریکی فوج نکلی، افغان حکومت چند ہی دنوں میں بکھر گئی۔ اربوں ڈالر کی تربیت یافتہ فوج بغیر لڑے ہتھیار ڈال گئی۔ طالبان واپس اقتدار میں آگئے۔

امریکہ کی افغانستان اور پاکستان میں اسلامی بنیاد پرستی پھیلانے کی پالیسی اسقدر طاقتور تھی کہ مذہبی شدت پسندی کا رنگ ان معاشروں پر گہرا ہوتا چلا گیا۔ افغانستان ایک بار پھر ایک مذہبی آمیت میں تبدیل ہو چکا ہے۔ جسے دنیا کا کوئی ملک تسلیم نہیں کرتا۔ امریکہ کی ساکھ بڑی طرح متاثر ہوئی، لیکن کسے پرواہ ہے۔

افغانستان میں ہشتگرد گروہ اکٹھے ہو رہے ہیں جنہیں مغرب اور بھارت کی حمایت حاصل ہے۔ ابھی چند دن پہلے بھارت نے افغان حکومت کی ساتھ دفاعی معاهدہ کیا ہے۔ بھارت افغانستان میں موجود ہشتگرد گروہوں کو مدد فراہم کر رہا ہے۔ افغان عوام ایک بار پھر جنگ و فساد کے نتیجے میں بھوک اور بے روزگاری کا شکار ہونے جا رہے ہیں۔ امریکہ اور اسکے اتحادیوں کو افغانستان میں ایک بار پھر جہاد کی ضرورت پڑ چکی ہے۔ اس بارہ پہ ہشتگرد جتھے پاکستان، ایران، روس اور آخر میں چین کے خلاف جہاد کرنے کیلئے تیار کئے جا رہے ہیں۔

یہ امریکی پالیسی تھی جس نے افغان مجاہدین پیدا کئے۔ یہ امریکی پالیسی ہی تھی جس کے نتیجے میں طالبان، القاعدہ، داعش، الشاباب، بوکوحرام اور ابو سیاف جیسی تنظیمیں پیدا ہوتیں۔ اقوام متحده نے 1990 کے بعد جتنی بھی مسلم تنظیموں پر پابندی لگائی جنہیں دہشتگرد قرار دیا وہ سب اسی پالیسی کا نتیجہ تھیں جو امریکہ اور اسکے اتحادیوں نے کمیونزم کا مقابلہ کرنے کیلئے بنائی تھی۔ آج ایک بار پھر افغانستان دہشتگردی کا مرکز بن چکا ہے۔ اور بیچارے افغان عوام اس بار کہیں ہجرت کرنے کے قابل بھی نہیں رہے جو دوسرے ملکوں میں بس رہے ہیں انہیں بھی افغانستان واپس دھکیلا جا رہا ہے جہاں انکے پاس روزگار کا آسان ترین راستہ کسی نہ کسی دہشتگرد تنظیم کا حصہ بننا ہو گا۔

-----فائل 16-AS کا اختتام-----

ملک: فلپائن

سال: 1983

فال: AS-17

ایکس اگست 1983 کی رات نیلا ائر پورٹ پر چائینہ ائر لائنز کا جہاز اترा۔ جہاز سے باہر قدم رکھنے سے پہلے ہی ایک گولی بنیگنو نینوئی اکینو کے سر میں لگی اور وہ وہیں گرفتار ہے۔ وہ مارکوس کے سب سے طاقتور سیاسی مخالف تھے۔ ان کی موت نے فلپائن کو ہلاکر رکھ دیا۔ اس دن سے ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے اگلے دس سال تک پورے ملک کو ہنگاموں، بغاوتوں اور خونزیزی میں جھونک دیا۔

یہ سب اچانک نہیں ہوا تھا۔ گیارہ سال پہلے 1972 میں جب مارکوس نے مارشل لانا فائز کیا تو اس میں واشنگٹن کی منظوری شامل تھی۔ امریکہ کے لیے فلپائن صرف ایک اتحادی نہیں بلکہ اس کے دو سب سے بڑے فوجی اڈوں کا گھر تھا۔ کلارک ائرپیس اور سوبک بے نیول اسٹیشن سے امریکہ پورے جنوبی چین کے سمندر پر طاقت کا مظاہرہ کرتا تھا۔ مارکوس ان اڈوں سے سالانہ دو سو ملین ڈالر کمata اور اپنے وفادار جرنیلوں میں بانتا تھا۔ بدلتے میں امریکہ ان کرپشن پر آنکھیں بند رکھتا تھا۔ سی آئی اے کے افسران فلپائن کی نیشنل انٹلی جنس ایجنسی کے ساتھ مل کر ایسے لوگوں کی فہرستیں بناتے جنہیں گرفتار یا غائب کرنا ضروری سمجھا جاتا۔ مارشل لا کے پہلے دس برسوں میں ساٹھ ہزار لوگ پکڑے گئے، ہزاروں کو بغیر مقدمے کے قید رکھا گیا۔

مگر 1983 تک مارکوس کی حکومت اندر سے ٹوٹنے لگی تھی۔ معیشت بیٹھ چکی تھی، مارکوس کے منظور نظر سرمایہ دار شوگر اور ناریل کی صنعتیں لوٹ رہے تھے اور نیو پیپلز آرمی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ واشنگٹن کو خبر تھی کہ مارکوس کی مقبولیت ختم ہو چکی ہے، مگر ریگن انتظامیہ خوفزدہ تھی کہ کہیں دباؤ ڈالنے سے کیونسٹ اقتدار میں نہ آ جائیں۔ لہذا ایک طرف وہ جمہوریت کی بات کرتے رہے اور دوسری طرف خفیہ طور پر مارکوس کو ہتھیار اور امداد بھیجتے رہے۔ نینوئی اکینو کا قتل اس تضاد کو مکمل طور پر بے نقاب کر گیا۔

اکینو کی موت کے چند گھنٹے بعد ہی امریکی سفارتخانے نے واشنگٹن کو پیغام بھیجا کہ فوج کو متعدد رکھنا ضروری ہے ورنہ ملک ٹوٹ جائے گا۔ اگلے دو برسوں میں امریکی فوجی امداد میں باسٹھ فیصد اضافہ ہوا۔ امریکہ نے فلپائنی فضایہ کو سیٹلات ہٹ سے حاصل ڈیٹا دیا، ان کے بمباری کے اہداف طے کیے اور سی آئی اے نے روزانہ کی بیاناد پر گوریلا ٹھکانوں کی فہرستیں فراہم کیں۔ امریکی فوجی مشیر بر اہ راست مارکوس کے آپریشن روم میں بیٹھتے تھے۔

پھر آیا 1986 کا ایکشن۔ عوامی دباؤ کے سامنے مارکوس کا جادو ختم ہو گیا۔ جب اس نے مظاہرین پر گولی چلانے کا حکم دیا تو امریکی سفیر نے صدر ریگن کا پیغام پہنچایا کہ اگر اقتدار نہ چھوڑتا تو امریکی حمایت ختم ہو جائے گی۔ مارکوس بھاگ کر ہوائی چلا گیا۔ کورازون اکینو اقتدار میں آئیں مگر ملک برباد ہو چکا تھا۔ معیشت تباہ، فوج تقسیم اور باغی چالیس فیصد علاقے پر قابض ہو چکے تھے۔

امریکہ نے فوراً نئی پالیسی بنائی۔ ڈلٹیر شپ کی حمایت ختم کر کے "جمهوریت کے استحکام" کا نعرہ لگا دیا گیا۔ سی آئی اے نے پرانے نیٹ ورکس بحال کیے اور اکینو کو کمیونسٹوں کے ساتھ ساتھ اپنے ہی فوج کی بغاوتوں سے بچانے کی مہم شروع ہوئی۔ سنہ 1986 سے 1992 کے درمیان امریکہ نے فلپائن کو ایک ارب ڈالر سے زیادہ فوجی امداد دی۔ امریکی سپیشل فورسز نے فلپائن کے ریجنرز کو "انسداد ہشتنگرڈی" کے کورس پڑھاتے، مگر وہ کورس دراصل "عوام کے خلاف جنگ" کے طریقے تھے جن سے عام شہریوں کو بھی نشانہ بنایا جاتا۔

ان برسوں میں ہزاروں لوگ لاپتہ یا قتل ہوتے۔ ایمنسٹی انٹرنسٹیشن نے ڈھائی ہزار ماوراءِ عدالت قتل دستاویزی ثبوت کے ساتھ روپورٹ کیے۔ مگر واشنگٹن کی نظر میں یہ سب "جمهوریت کے دفاع" کا حصہ تھا۔ جب 1989 میں بغاوت کے دوران بغاوتی فوج نے میلا پر حملہ کیا تو امریکی ایف فور طیاروں نے فلپائنی حکومت کا دفاع کیا۔ فیڈل راموس نے بعد میں خود مانا کہ امریکی فضائی مدد کے بغیر دارالحکومت ہاتھ سے نکل جاتا۔

سنہ 1991 میں جب فلپائن کی سینیٹ نے امریکی اڈے بند کرنے کے حق میں ووٹ دیا تو سب کو لگا کہ امریکی اثر ختم ہو گیا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ صرف شکل بدلتی۔ سنہ 1998 کے وزٹنگ فورسز ایگرینمنٹ نے امریکی فوج کو مشترکہ مشقوں کے نام پر واپس آنے کی اجازت دی۔ سنہ 2002 میں نئے معاهدے کے تحت امریکی اسپیشل فورسز پھر مسلم الکثریتی منڈناؤ میں موجود تھیں، وہی

پرانے اڈے، وہی پرانی معلوماتی نیٹ ورک۔ امریکی سیٹلائٹس فلپائن کی توپوں کو نشانہ بتا رہے تھے، صرف جواز بدل چکا تھا،  
اب یہ سب بدنام زمانہ "دہشتگردی کے خلاف" کے نام پر ہو رہا تھا۔

ٹوپیل مدت میں اس شرکت نے فلپائن کے اداروں کو اندر سے بدل دیا۔ پولیس اب بھی وہی "آرڈر آف بیٹل" فائلیں استعمال کرتی ہے جو سی آئی اے نے مارکوس کے زمانے میں بنائی تھیں۔ فوجی نظریہ وہی "ٹوٹل وار" ہے جو اپنے ہی عوام پر جنگ مسلط کرنے کو جواز فراہم کرتا ہے۔ یہ سابق امریکہ نے 80 کی دہائی میں فلپائن کی سیکیورٹی فورسز کو سکھایا تھا۔ معاشی طور پر بھی قیمت بہت بھاری نکلی۔ امریکی قرضوں سے خریدے گئے لڑاکا طیاروں نے ملک کو ایسے قرض میں ڈالا جو بالآخر 1997 کے ایشیائی مالیاتی بحران میں پھٹ پڑا۔ بھلی اور پانی کے نظام نجی ہاتھوں میں گئے اور عوام پر بوجھ بڑھ گیا۔

آج جب فلپائن میں امریکی افواج کے نئے معاملے پر بحث ہوتی ہے تو چند دانشور انہی زخموں کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ "جمهوریت کی حفاظت" کے نام پر جو نظام بنایا گیا اس نے انصاف کو کچل دیا۔ امریکی پالیسیوں کی بدولت امیر نہایت امیر اور غریت اس قدر غریب ہیں کہ ان کے لئے زندگی بوجھ بنی ہوئی ہے۔

-----فائل 17-AS کا اختتام-----

ملک: عراق

سال: 2003

فائل: AS-18

بیس مارچ 2003 کو صبح پانچ بج کر چوتیس منٹ پر امریکی میزائلوں نے صدام حسین کے صدارتی محل کو نشانہ بنایا۔ یہ مناظر پوری دنیا کی ٹی وی سکرینوں پر دکھائے جا رہے تھے۔ اسی وقت صدر جارج بوشن نے اعلان کیا کہ "آپریشن عراق فریڈم" شروع ہو چکا ہے۔ دنیا کو بتایا گیا کہ عراق کے پاس تباہی پھیلانے والے ہتھیار ہیں اور القاعدہ سے اس کے تعلقات ہیں۔ اگلے آٹھ سالوں تک امریکہ اور اس کے اتحادی عراق پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتے رہے، انسانی حقوق کی دھمکیاں اڑاتے رہے، جنگی جرائم کرتے رہے مگر وہ ہتھیار کبھی نہ ملے جن کا بہانہ بنانا کریہ جنگ شروع کی گئی تھی۔

اس جنگ کے نتیجے میں مقامی سورسز کے مطابق دس لاکھ عراقی شہری ہلاک ہوئے، لاکھوں بے گھر ہوئے، لاکھوں تارکین وطن بنے۔ اس تباہی کو جستیفائی کرنے کیلئے کہا گیا کہ ہم نے عراقی عوام کو صدام کی ڈیکٹیٹر شپ سے آزاد کروایا ہے۔ ٹونی بلیئر جس نے خطرناک ہتھیاروں والی جھوٹی انٹلیجنس رپورٹ تیار کی تھی اس نے معافی مانگی۔ اصولاً اسے انٹر نیشنل کریمنٹ کورٹ کے سامنے پیش کیا جانا چاہئے تھا، لیکن اسے یہودی یمنکرز نے ہمیشہ کیلئے اپنی چھتر چھایا میں پناہ دے دی۔ ستم ظریفی دیکھئے کہ حال ہی میں اسے غزہ کے نام نہاد امن پر اس کی نگرانی کا ناسک سونپنے کی تجویز دی گئی۔

عراق پر امریکی حملہ 1991 کی خلیجی جنگ سے جڑا ہوا تھا۔ امریکہ نے کویت کو آزاد توکرا لیا تھا مگر صدام کو اقتدار سے نہیں ہٹایا۔ اسکے بعد جو کچھ مشرق وسطی میں ہوا اس کا ماسٹر پلان نیتن یاہو کی 1995 میں "لکھی کتاب" How Fighting Terrorism: میں درج تھا۔

یہ سلسلہ عراق پر سخت پابندیوں سے شروع ہوا، تیل کی برآمدات محدود ہو گئیں، اور اقوام متحده کے معانہ کارہر میزائل سائٹ کی نگرانی کرتے رہے۔ عراق کو اس قدر تنگ کیا گیا کہ صدام نے سنہ 1998 میں ان معانہ کاروں کو نکال دیا۔ جس کے جواب میں امریکہ نے چار دن تک بمباری کی مگر حکومت نہ گراہی۔ پھر نائن الیون کے بعد ماحول بدل گیا۔ امریکہ نے دہشت گردی اور "روگ سٹیٹس" یعنی سرکش ریاستوں کو ایک ہی کیلگری میں رکھ دیا۔ صدر بش نے عراق، ایران اور شمالی کوریا کو "AXIS OF EVIL" قرار دے دیا اور اعلان کیا کہ امریکہ دنیا کی خطرناک حکومتوں کو برداشت نہیں کرے گا۔ امریکہ نے ایسا ماحول بناداک کسی قسم کی بات چیت کی تو گنجائش ہی نہ تھی۔

امریکی انسٹیل جنس نے صدام کے خلاف الزامات کی ایک پوری کہانی گھڑی۔ کہا گیا کہ اس کے پاس بائیووجیکل ہستھیار ہیں، موبائل لیبارٹریاں ہیں، ایلو مینیم کے پاتپ ایٹھی سینٹری فیوج کے لیے ہیں۔ فروری 2003 میں کولن پاؤل نے اقوام متحده میں ایک شیشی دھکائی اور کہا کہ یہی وہ زہر ہے جو صدام چھپا رہا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ جھوٹ پر مبنی تھا۔ اقوام متحده کے اپنے معانہ کارہنگ بلیک اور محمد البرادی بار بار کہتے رہے کہ عراق میں کوئی ایکٹوپروگرام نہیں ہے۔ لیکن واشنگٹن میں فیصلہ ہو چکا تھا۔

بغداد پر پہلا حملہ 20 مارچ 2003 کو ہوا۔ امریکی فوج اور اس کے اتحادی تیزی سے آگے بڑھے۔ صدام کی فوج، جو برسوں کی پابندیوں سے کمزور ہو چکی تھی، بکھر گئی۔ 9 اپریل کو بغداد پر قبضہ ہو گیا۔ چند ہفتوں بعد صدر بش نے ایک بھری جہاز پر گھرے ہو کر کہا "مشن مکمل ہو گیا"۔ لیکن اس بعد اصل تباہی کا دور شروع ہوا۔ امریکہ نے عراقی فوج کو ختم کر دیا، ہزاروں سرکاری ملازم فارغ کر دیے، اور سارا نظام ہاتھ سے نکل گیا۔ لاکھوں نوجوان بے روزگار ہو گئے اور ملک میں ذلت کا احساس پھیل گیا۔ اسی زمین سے مذاہمت اور دہشت گردی نے جنم لیا۔

پہلا حملہ جولائی 2003 میں ہوا جب ایک امریکی قافلے پر بم پھٹتا۔ اس کے بعد روزانہ درجنوں حملے ہونے لگے۔ ایسے میں شیعہ سنی فساد کروانے کیلئے سنی دہشتگرد گروہوں کو تیار کیا گیا۔ اردن سے ایک شدت پسند ابو مصعب الزرقاوی کو القاعدہ عراق کے نام سے تنظیم بنانے کیلئے لایا گیا۔ اس تنظیم نے شیعہ مساجد پر خودکش حملے شروع کیے۔ سنہ 2006 میں سمارا میں امام عسکری کے مزار پر دھماکے نے خانہ جنگی کو ایک دم بھڑکا دیا۔ بغداد کی گلیاں لاشوں سے بھر گئیں۔ امریکہ نے دکھاوے کے طور پر قابو پانے

کیلئے جنگ پیڑیاں کی قیادت میں اضافی فوج بھیجی، سنی قبائل کی مالی مدد کر کے انہیں مضبوط بنایا۔ کچھ عرصے کے لیے بظاہر حالات بہتر ہوئے مگر اندر سے فرقہ وارانہ تقسیم مزید گھری ہوتی گئی۔

سنہ 2011 میں صدر اوباما نے امریکی فوج واپس بلا لی۔ امریکہ کے نامزد کردہ نوری المالکی کی شیعہ حکومت اور سنی گروہوں کے درمیان خلیج بڑھتی رہی جس کے نتیجے میں مغربی مدد سے داعش کا حجم ہوا اور صرف تین سال بعد داعش نے موصل پر قبضہ کر کے خلاف کا اعلان کر دیا۔ داعش کے مظالم اس قدر انسانیت سوز تھے کہ دنیا کی کتنی قوتوں نے انہیں روکنے کیلئے مداخلت شروع کی، جن میں روس، ترکی اور ایران شامل تھے۔ امریکی فوجیں بھی دوبارہ واپس آگئیں۔ آج بھی دو ہزار سے زیادہ امریکی فوجی عراق میں موجود ہیں۔

اس جنگ کی انسانی قیمت ناقابل تصور ہے۔ امریکی فگرز کے مطابق چار ہزار سے زیادہ امریکی فوجی مارے گئے، تیس ہزار زخمی ہوئے۔ ایک لاکھ اسی ہزار سے زیادہ عراقی شہری ہلاک ہوئے، دو ملین بے گھر ہوئے۔ آزاد ذرائع کہتے ہیں کہ دس لاکھ عراقی مارے گئے تھے۔ کہتے ہیں کہ امریکہ نے دو ٹریلیون ڈالر خرچ کیے لیکن عراق کے ہسپتال، اسکول اور بجلی گھر آج بھی تباہ حالت میں ہیں۔ ایسے ہی فگرز افغانستان کے حوالے سے بھی بتائے جاتے ہیں۔ وہاں بھی عراق جیسی تباہ حالت ہے۔

سب سے بڑا فائدہ صیہونیوں کی کارپوریشنز کو ہوا جہنوں نے یہ جنگ کروانے میں اہم ترین کردار ادا کیا تھا۔ ڈک چینی کی سابقہ کمپنی ہیلی برٹن نے خوب ڈالر زکمائے۔ ایک مثال یہ ہے کہ بغداد میں کویت سے فیول لانے کا ایک ٹھیکہ تھا جس کی مارکیٹ کے حساب سے لگت 80,000 ڈالر ز تھی۔ اگر عراقی حکومت روایتی طریقے سے یہ ٹھیکہ دستی تو اس میں 240,000 ڈالر خرچ ہوتے۔ اسی کام کیلئے ہیلی برٹن نے 27 ملین ڈالر کا وصول کئے تھے۔

عراق کی جنگ مغربی ضمیر پر ایسا وہبہ ہے جسے مٹانا آسان نہیں۔ آج جب امریکہ اور اسکے اتحادی چین کے اویفر مسلمانوں کے مسلسلہ کو زیر بحث لانے کی کوشش کرتے ہیں تو لوگ ان کی بات کو سنتے تک نہیں۔ جب امریکہ اور یورپین انسانی حقوق کی بات کرتے ہیں تو ناقد عراق اور افغانستان جنگ میں کی گئی انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں گنوائے گئتے ہیں۔

جب بھی کسی ملک کے خلاف جنگ کا جھوٹا جواز پیش کیا جاتا ہے، لوگ کولن پاؤں کی شیشی کا حوالہ دیتے ہیں، ٹونی بلنیر کی جھوٹی نیلی جنس رپورٹ یاد کرواتے ہیں۔ جب مغرب کسی ملک میں انقلاب کی حمایت کرتا ہے، مشرق وسطیٰ کے لوگ پوچھتے ہیں کہ

کیا تیجہ عراق جیسا ہوگا۔ اور جب کسی ملک کو آزاد کروانے کا نعرہ لگاتے ہیں تو لوگ پوچھتے ہیں جیسے عراقی آزاد ہیں یا پھر جیسے پیاسا کے لوگ آزاد ہوتے ہیں؟

عراق کی جنگ نے امریکہ کی ساکھ کو ہمیشہ کیلنے برباد کر دیا۔ عراقی لوگوں کی مزاحمت نے امریکی پلانگ کو اس بڑی طرح سے خراب کیا کہ اس کے لئے ہمارا مشکل ہو چکا ہے۔ عراق وارنے امریکہ کو 2008 کی کساد بازاری میں دھکیل دیا۔ اب نوبت یہ آچکی ہے کہ نام نہاد دہشتگردی کے خلاف جنگ کو بند کر کے، امریکہ کو انہی کیساتھ ابراہیمی معاهدہ کرنا پڑا جن کے خلاف جنگ لڑ رہے تھے۔

-----فائل AS-18 کا اختتام-----

ملک: پاکستان

سال: 2004

فائل: AS-19

سنہ 2004 کا ایک گرم دن تھا جب اچانک جنوبی وزیرستان کے ایک کچھ گھر پر آسمان سے آگ بر سی۔ ایک میزائل آیا، اور چند سیکنڈ میں سب کچھ ختم ہو گیا۔ مرنے والا کوئی عام شخص نہیں تھا، بلکہ نیک محمد نام کا وہ نوجوان قبائلی کمانڈر تھا جسے کبھی پاکستان کا دوست سمجھا جاتا تھا اور پھر امریکہ کی افغان جنگ کے بعد شمن قرار دے دیا گیا۔ اس حملے کی ذمہ داری پاکستان نے اپنے سر لی، مگر کچھ عرصے بعد پتہ چلا کہ دراصل میزائل امریکی سی آئی اے کے ڈرون نے فائر کیا تھا۔

یہ واقعہ تھا جب پاکستان کی سر زمین پر پہلی بار امریکی ڈرون نے کسی کو مارا تھا، اور ایک ایسا خفیہ سلسلہ شروع ہوا جو آنے والے کتنی برسوں تک چلتا رہا۔

یہ کہانی صرف ایک حملے کی نہیں، بلکہ اس پورے دور کی ہے جب فاتا کا قبائلی علاقہ دنیا کا سب سے خطرناک خط بن چکا تھا۔ یہ وہی خط تھا جسے برطانوی دور میں فرنٹیئر کر انگریزو لیشن کے تحت الگ قانون دیا گیا تھا۔ عدالتیں معطل تھیں، سیاسی امجدٹ بادشاہ کی طرح فصیلے کرتا تھا، اور پشتون قبائل کو روس کے خلاف بفرزون کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد بھی یہی نظام چلتا رہا، اور فاتا کبھی مکمل طور پر ملک کا حصہ نہ بن سکا۔ یہی خلا بعد میں امریکا کے لیے آسان راستہ بن گیا، جہاں بنیر اجازت داخل ہوا جا سکتا تھا، جہاں کوئی عدالت سوال نہیں کرتی تھی۔

سنہ 2007 تک امریکا افغانستان میں پھنس چکا تھا۔ طالبان دوبارہ منظم ہو گئے تھے اور واشنگٹن پر دباؤ تھا کہ کچھ کیا جائے۔ سی آئی اے نے ایک نیا اصول بنایا کہ اب صرف مشہور دہشت گروں کو ہی نہیں بلکہ ان کے جیسے کسی بھی گروہ کو مارنا ہے۔ بس اتنا کافی تھا کہ ان کے حرکات و سکنات دہشت گروں سے ملتے جلتے ہوں۔ اس کے بعد ہر ہفتے فاتا میں ایک دھماکہ ہوتا۔ بچے اپنے گھروں سے نکلنے سے ڈرتے، مردمجعے کی نماز میں جانے سے گھبراتے، اور ہر شخص کے دل میں یہ خوف بیٹھ گیا کہ پتہ نہیں کہ

آسمان سے موت نازل ہو جائے۔ پاکستانی فوج امریکی طاقت کے سامنے بے بس تھی۔ انہوں نے اپنا بھرم رکھنے کیلئے یہ تاثر دیا کہ وہ اس آپریشن کا حصہ ہیں۔

جب باراک اوباما برسر اقتدار آئے تو انہوں نے بڑی فوجی جنگلوں کے بجائے ڈرونز کو ہتھیار بنا لیا۔ سنہ 2009 سے 2010 کے درمیان سو سے زیادہ حملے ہوئے۔ سی آئی اے نے بلوچستان کے شمسی ایئر میس سے اپنی کارروائیاں شروع کیں، اور ڈرونز کے سائز اور طاقت میں اضافہ کرتے چلے گئے۔ ان حملوں میں ایک نیا ہتھکنڈا سامنے آیا، جسے ڈبل ٹیپ کہا گیا۔ پہلا میزائل ہدف پر گرتا، اور جب لوگ زخمیوں کی مدد کے لیے پہنچتے، دوسرا میزائل انہیں بھی ختم کر دیتا۔ انسانی حقوق کے ماہرین نے اسے جنگی جرم کہا، مگر اسوقت امریکہ اور اسکے اتحادی طاقت کے نشی میں چور تھے۔ ان کے لیے یہ بس ایک کامیاب مشن تھا۔

ان حملوں نے القاعدہ کو واقعی کمزور کیا، مگر ساتھ ہی پاکستان کے اندر دہشت گردی کو کتنی گناہ ہدا دیا۔ ایک تحقیق کے مطابق ہر نئے ڈرون حملے کے بعد پاکستان کے شہروں میں خودکش دھماکوں میں چھ فیصد اضافہ ہوتا تھا۔ قبائلی علاقوں سے نکلنے والے جنگجو کراچی، پنجاب اور کوئٹہ پہنچ گئے۔ وہی دہشت گرد گروہ جو فالا میں چھپے تھے، شہروں میں آکر مجرم اور دہشت گروں کا نیا گٹھ جوڑ بن گئے۔

اس دوران پاکستان اور امریکا کے تعلقات تیزی سے خراب ہوئے۔ ریمنڈ ڈیوس جیسے واقعات نے پاکستانی عوام کے غصے کو بھڑکا دیا۔ سلالہ چیک پوسٹ پر امریکی حملے میں پاکستانی فوجیوں کی شہادت کے بعد تو پاکستان نے شمسی ایئر میس بند کر دیا اور نیٹو سپلائی لائن روک دی۔ پارلیمنٹ نے متفقہ قرارداد پاس کی کہ پاکستان کی خود مختاری پامال ہو رہی ہے۔ لیکن سی آئی اے نے اپنی مہم جاری رکھی اور پاکستان پر الزام لگایا کہ وہ دہشتگردوں کے خلاف اتحادیوں کی مدد نہیں کر رہا۔

سنہ 2014 میں پاکستانی فوج نے شمالی وزیرستان میں آپریشن ضرب عصب شروع کیا، اور دعویٰ کیا کہ دہشت گردی کے مرکز ختم کر دیے گئے ہیں۔ اس دوران امریکا کے ڈرون حملوں میں نمایاں کمی آئی۔ سی آئی اے کے پاس اب زیادہ ہدف باقی نہیں تھے۔ البتہ امریکا نے ایک خفیہ نظام قائم رکھا جسے "ڈسپوزیشن میٹر کس" کہا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا ڈیٹا میس تھا جس میں دنیا بھر کے مشتبہ افراد کے نام، مقام اور ممکنہ خطرے کی درجہ بندی درج تھی۔

پھر جب ٹرمپ نے اقتدار سنبھالا تو اس نے پاکستان پر کھل کر الراہم لگایا کہ وہ دو غلا کروار ادا کر رہا ہے۔ امریکا نے فوجی امداد بند کر دی، اور دباؤ بڑھایا کہ طالبان کو مذاکرات کے لئے راضی کیا جائے۔ پاکستان نے جواب میں سرحد پر باڑ لگائی اور چین کے ساتھ اپنے تعلقات مزید مضبوط کیے۔ جب بائیڈن نے افغانستان سے فوجیں واپس بلائیں، تو ڈرون حملوں کا سلسلہ تقریباً ختم ہو گیا۔ سنہ 2018 کے بعد پاکستان پر کوئی تصدیق شدہ امریکی حملہ نہیں ہوا۔

لیکن کہانی یہیں ختم نہیں ہوتی۔ فٹا کے وہ علاقے آج بھی زخموں سے بھرے ہیں۔ لاکھوں لوگ بے گھر ہو چکے ہیں، سینکڑوں مدارس میں جنگ کے اثرات نظر آتے ہیں، اور ٹیٹی پی کے نام سے نتی شکل میں وہی شدت پسندی واپس آگئی ہے۔ پشاور کی مسجد پر 2022 کا حملہ اسی تسلسل کا حصہ تھا۔

سی آئی اے کا وہ خفیہ نظام جو فٹا میں تیار اور ٹیسٹ کیا گیا تھا، بعد میں میں، صومالیہ اور شام میں استعمال ہوا۔

امریکہ کے ڈرون آپریشنز اور افغان پالیسی نے پاکستان کیلئے شدت پسندی اور دہشتگردی کے مستقل عذاب کا بندوبست کر دیا ہے۔ افغانستان سے بھاگتے وقت امریکہ نے لاتعداد ہتھیار اپنے پیچھے چھوڑے تھے جن میں سے ایک بڑی تعداد دہشتگرد گروہوں کے پاس پہنچ چکے ہیں۔

آج پاکستان انہی دہشتگروں سے لڑ رہا ہے۔ فٹا کے لوگ بھی پاکستان پر اعتبار نہیں کرتے۔ سچ یہ ہے کہ پاکستان کے پاس بہت محدود آپریشنز تھیں۔ امریکہ کی بات ماننا پاکستان کی مجبوری تھی۔ پاکستان نے اپنے محدود کارڈر بہت اچھی طرح کھیلے تھے۔ مغربی دفاعی تجهیز نگار افغانستان میں امریکی مقاصد ادھورے رہ جانے کی ذمہ داری پاکستان کے عدم تعاون پر ڈالتے ہیں۔ لیکن اسوقت امریکہ کے مقاصد بدل چکے ہیں اور جو مقاصد پورے نہیں ہو سکے ان کا امریکہ کو فایدہ ہوا ہے اور جو دہشتگردی کرنے تھے آج امریکہ ان کو افغانستان میں فٹ بھی کر رہا ہے اور انکی دفاعی مدد بھی کر رہا ہے۔ ایک اور جہاد کی تیاری شروع ہے۔ اس باریہ جہاد پاکستان، ایران اور چین کے خلاف لڑنے کا منصوبہ ہے۔



ملک: فلسطین

سال: 2006

فائل: SA-20

پھیس جنوری 2006 کو ہونے والے الیکشن میں فلسطینی جدوجہد کا راستہ یکسر تبدیل ہو گیا۔ سرد اور نم صبح میں لوگ قطاروں میں لگے اپنے ووٹ ڈال رہے تھے۔ شام تک اعلان ہوا کہ حماس جیت گئی ہے۔ ایک ایسی تنظیم جسے اسرائیل نے فلسطین کی سیکولر جماعتوں کے مقابلے میں تیار کیا تھا تاکہ فلسطینی جدوجہد پر دہشتگردی کا ٹھپہ لکایا جاسکے۔ حماس اتنی مقبول ہوئی کہ الیکشن ہی جیت گئی۔ ایک سو تیس میں سے چوہتر نشستیں۔ فلسطینی عوام نے اپنی مایوسی، بھوک اور کرپشن کے خلاف ووٹ دیا۔ لیکن حماس کی جیت کا جشن زیادہ دیر نہیں چلا۔ امریکہ اور یورپی یونین نے فوری طور پر امداد روک دی، فلسطینی اتحاری کے اکاؤنٹس مخدود کر دیے اور بینکوں کو حکم دیا کہ غزہ اور مغربی کنارے کو کسی قسم کی مالی سہولت نہ دی جائے۔ جمہوریت کے نام پر مغعدہ الیکشن کے نتیجے میں منتخب ہونے والی حکومت کا "مہذب مغربی دنیا" نے محاصرہ کر لیا۔

ویسے تو یہ کہانی سوا سوال پر انی ہے، ہم اوسلو معاملے سے شروع کرتے ہیں۔ سنہ 1993 میں جب فلسطینی اتحاری بنی تو وہ اسرائیل اور مغربی عطیات پر مالی طور پر اختصار کرنے لگی۔ ان کے بحث کا آدھا سے زیادہ حصہ یورپ اور امریکہ سے آتا تھا۔ کچھ حصہ اسرائیل کی جمع کی گئی کشمکشم ڈیوٹی سے۔ جب تک فتح پارٹی بر سر اقتدار تھی، سب کچھ ٹھیک چلتا رہا۔ مگر پھر بد عنوانی کا دور شروع ہوا جس نے عوام کا اعتماد ختم کر دیا۔ اربوں یورو کا حساب غالب تھا اور عوام کے سامنے صرف غربت اور مایوسی تھی۔ حماس نے اسی خلائیں قدم رکھا۔ وہ لوگ جو اسکول، اسپتال اور امدادی مرکز چلا رہے تھے، عوام کی نظر میں قابل اعتماد بن گئے۔

ایکشن کے دن حماس کے لیڈر خود حیران تھے۔ کسی نے نہیں سوچا تھا کہ وہ اکثریت حاصل کر لیں گے۔ مگر جیسے ہی نتائج آئے، اسرائیل نے ماہانہ پچھن ملین ڈالر کی کسٹم آمنی روک لی۔ امریکہ اور یورپی یونین نے بھی اگلے چوبیس گھنٹوں میں براہ راست امداد بند کر دی۔ یہ فیصلہ صرف امداد روکنے کا نہیں تھا بلکہ پورے ایک مالیاتی محاصرے کا آغاز تھا۔

غزہ میں سرکاری ملازمین کو تنخواہیں ملنا بند ہو گئیں۔ وہ ملازمین جو حماس کے ماتحت ملکوں میں کام کرتے تھے انہیں دس دس مہینے تک تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ بینکوں کو دھمکیاں دی گئیں کہ اگر انہوں نے کسی بھی حماس کے اکاؤنٹ سے لین دین کیا تو ان پر بھی پابندی لگ جائے گی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حماس کو نقدر قوم سوٹ کیسیوں میں بھر کر فتح کر اسنگ سے لانی پڑتی تھی۔ اسرائیل اکثر وہ رقم ضبط کر لیتا تھا۔

سن 2006 کے آخر تک فلسطینی اتحاری کا خسارہ آٹھ سو ملین ڈالر تک پہنچ گیا۔ اسپتا لوں میں ادویات ختم ہو گئیں۔ پینے کا پانی آؤدہ ہو گیا۔ ستر فیصد سے زیادہ کار خانے بند ہو گئے۔ عوام بھوک، بیماری اور بے روزگاری کے شکنجه میں پھنس گئے۔ جب معیشت تباہ ہوئی تو سیاست بھی بکھر گئی۔ حماس نے اپنی علیحدہ فورس بنائی جبکہ فتح نے مغربی مدد سے اپنی ملیشیا کو مسلح کیا۔ دونوں کے درمیان جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ سعودی عرب نے مصالحت کرانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوا۔ جون 2007 میں حماس نے غزہ کا مکمل کنٹرول حاصل کر لیا اور فتح نے مغربی کنارے پر حکومت قائم رکھی۔ ایک سرزین، دو حکومتیں، ایک دوسرے کی دشمن۔

غزہ پر اب مکمل محاصرہ تھا۔ اسرائیل نے اسے دشمن علاقہ قرار دے دیا اور ہر چیز پر پابندی لگا دی۔ یہاں تک کہ اسکوں کے بچوں کے لیے قلم اور کاپیاں تک روک لی گئیں۔ اقوام متحدہ نے خبردار کیا کہ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو 2020 تک غزہ رہنے کے قابل نہیں رہے گا۔ بجلی کے بغیر، گندے پانی میں اور تباہ حال گھروں میں زندگی گزارنے والے لوگ اب عالمی ضمیر کا امتحان بن گئے۔

یہ صرف فلسطین کی کہانی نہیں تھی بلکہ ایک نیا فارمولہ بنا۔ اگر کسی حکومت کا نظریہ مغرب کو پسند نہ آئے تو اسے جنگ کے بجائے بینکوں کے ذریعے سزا دی جائے۔ یہی حکمت عملی وینزویلا، شام اور افغانستان میں دہرانی گئی۔ اسے مالیاتی جنگ کہا جاتا ہے، جس میں بندوق کی جگہ اکاؤنٹِ محمد کر دیے جاتے ہیں۔

اسرائیل نے غزہ کے مالی اور زمینی راستے کاٹ کر اسے ایک جیل بنادیا۔ یہ صورتحال تقریباً دو دہائیوں تک جاری رہی اور پھر اسلامی دنیا پر ابراہیمی معابدہ تھوپ دیا گیا۔ اسکے بعد 7 اکتوبر 2023 کا واقعہ ہوا۔ نیتن یاہو تو چیزیں اسی موقعے کے انتظار میں تھا۔ اس نے دو سال تک غزہ پر ایسی جنگ مسلط کی جس میں ساٹھ ہزار سے زیادہ لوگ مارے گئے، جن میں معصوم بچوں اور عورتوں کی ایک بڑی تعداد شامل ہے۔ غزہ کو مکمل طور پر مسمار کر دیا گیا۔ لوگوں پر ایک منصوبے کے تحت بھوک اور بیماری مسلط کی گئی۔ انٹرنسنل کورٹ آف جسٹس نے نیتن یاہو اور اس کے قریبی ساتھیوں کے وارنٹ گرفتاری جاری کئے۔ دنیا بھر کی انسانی حقوق کی تنظیموں نے اسرائیل کے جنگی جرائم کی مذمت کی۔ غزہ میں ہونے والے ظلم کو جینو سائیڈ کہا گیا۔

ابھی حال ہی میں امن معابدہ ہوا ہے جس میں فلسطین کے مسئلے کا مستقل حل دور دور تک نظر نہیں آتا۔ مغرب کی منافقت اس نام نہاد "امن معابدے" کی ہرشق میں صاف نظر آتی ہے۔

سنہ 2006 کے ایکشن کی کہانی اس بات کا ثبوت ہے کہ جب مغرب والے جمہوریت کا نعرہ لگاتے ہیں تو اس کا مطلب صرف وہ جمہوریت ہوتا ہے جو ان کے مفاد میں ہو۔ جیسے ہی عوام اپنی مرضی کا فیصلہ کریں، تو امداد بند، اکاؤنٹ محمد اور پابندیاں شروع ہو جاتی ہیں۔

فلسطین پر بات سوا سو سال پہلے سے شروع کیا کریں جب صیہونی تحریک نے فلسطین میں یورپی کالونی بنانے کا منصوبہ تیار کیا تھا۔ یہ کہانی نہ تو 7 اکتوبر کو شروع ہوئی تھی اور نہ اس امن معابدے کے ساتھ ختم ہو گی۔

سنہ 2006 کا ایکشن یہ بھی بتاتا ہے کہ ووٹ کے بعد اگر آپ کو نظام میں چلنے ہی نہ دیا جائے تو آپ کی کامیابی یا ناکامی کا حساب کیسے لگایا جا سکتا ہے؟ فلسطینیوں نے ووٹ سے جو تبدیلی مانگی، اسے مغربی سامراج نے مالی اور سرحدی ناکہ بندی سے کچل دیا۔ جمہوریت کے وعدے پرینکنگ پابندیوں کا تالا لگا دیا۔ فلسطینی بچارے ایک بار پھر کہپوں میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

-----فال 20-AS کا اختتام-----



ملک: یمن

سال: 2011

فائل: SA-21

پانچ مئی 2011، یمن کے ایک چھوٹے سے صوبے الجوف میں ایک ڈرون نے گاڑی کو نشانہ بنایا۔ اس میں دو افراد مارے گئے۔ دونوں امریکی نژاد یمنی تھے، ایک مذہبی رہنما انور العولقی اور دوسرا ایک صحافی سمیر خان۔ یہاں سے یمن کی مزاحمتی تحریک مکمل طور پر بدل گئی۔ وہ دن دراصل اس جنگ کا آغاز تھا جس نے چودہ سال میں ایک پوری قوم کو ملے کا ڈھیر بنادیا۔ یہ سب "عرب سپرگ" کے دوران شروع ہوا۔ سنہ 2011 میں جب صنعت کے چینج اسکوائر میں ہزاروں یمنی عوام جمع ہوئے تو ان کے مطالبات بہت بنیادی نوعیت کے تھے۔ بجلی چاہیے، روزگار چاہیے، اور وہ حاکم علی عبداللہ صالح کا استعفی چاہتے تھے جو 1978 سے اقتدار پر قابض تھا۔ مگر احتجاج کی یہ آگ چند مہینوں میں عالمی سیاست کے کھیل کا میدان بن گئی۔ سعودی عرب نے صالح کو سہارا دیا، امریکہ نے دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر ماختہ شروع کی، اور یمن ایک ایسے تجربہ کا ہے میں بدلتا گیا جہاں واشنگٹن نے ڈرون جنگ کی وہ حکمت عملی آزمائی جس کا تجربہ اس نے پاکستان کے قبائلی علاقوں میں 2006 میں شروع کیا تھا۔

سنہ 2011 اور 2012 کے درمیان امریکی ڈرون حملے تیزی سے بڑھے۔ سی آئی اے نے سعودی عرب کے کنگ خالد ایرنس میں خفیہ آپریشن بیس بنایا، جہاں سے یمن پر ڈرون بھیجے جاتے۔ صالح نے امریکیوں کو فضائی اجازت دی تاکہ اس کے خلاف مظاہروں کے دوران وہ اپنی کرسی بچا سکے۔ صرف اٹھارہ مہینوں میں اکتا لیس حملے ہوئے جن میں دو سو چالیس افراد مارے گئے۔ واشنگٹن میں اسے کامیابی کہا گیا، مگر یمن میں لوگوں کو پتہ چل گیا کہ انکے حکمران بیرونی طاقتوں کے نمائیندے ہیں اور وہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ بنیادی سہولتوں کے مطالبے پر انہیں اصل مالکان مارنے کیلئے آسمان سے آگ برسانے لگے ہیں۔

پھر 2015 آیا۔ حوثی باغیوں نے صنعا پر قبضہ کر لیا اور صدرہادی کو نظر بند کر دیا۔ وہ فرار ہو کر ریاض ہبھا اور سعودی عرب سے فوجی مدد مانگی۔ اگلی ہی رات سعودی اتحاد نے "آپریشن ڈیسائیسو اسٹورم" شروع کر دیا۔ دس عرب ملکوں کے جہازوں نے یمن پر بمباری شروع کی اور امریکہ نے کہا کہ وہ صرف "لو جسٹک مدد" دے رہا ہے، مگر حقیقت یہ تھی کہ امریکی طیارے سعودی جنگی جہازوں کو فضا میں ایندھن سپلائی کر رہے تھے، امریکی افسران ریاض کے جوانٹ پلانگ سیل میں یتھ کر ٹارگٹ چن رہے تھے اور امریکی ہتھیار ان بمباریوں میں استعمال ہو رہے تھے۔ صرف سودنوں میں دس ہزار بم گرے۔ ان میں سے ایک امریکی ساختہ بم مارچ 2015 میں ایک پناہ گزین کیمپ پر گرا اور چالیس عام شہری مارے گئے۔

پھر یہ جنگ ایک مکمل انسانی المیہ بن گئی۔ سنہ 2016 سے 2018 کے دوران سعودی اتحاد نے ناکہ بندی کر دی۔ خوراک، دوا، اور ایندھن بند ہو گیا۔ اقوام متحده کے مطابق روزانہ ایک سوتیس بچے بھوک یا بیماری سے مرنے لگے۔ ہمیشے کی وباقی جس نے بارہ لاکھ افراد کو متاثر کیا۔ یہ وقت تھا جب دنیا خاموش تماشائی بھی رہی اور واشنگٹن نے صرف بیانات دیے۔

اسی دوران امریکی ڈرون حملے کتنی گناہ بڑھ گئے۔ صدر ڈرمپ نے حملوں کی منظوری کے طریقے زم کیے۔ سنہ 2017 میں ایک سو اکیس حملے کیے گئے، جن میں درجنوں عام شہری مارے گئے۔ امریکی پالیسی تضاد کا شکار تھی۔ ایک طرف وہ القاعدہ پر بمباری کر رہے تھے، دوسری طرف انہی علاقوں میں متحده عرب امارات کے حامی قبائلی گروہوں کو اسلحہ اور پیسہ دے رہے تھے، جن میں القاعدہ کے لوگ بھی شامل تھے۔

سنہ 2019 میں جنگ نے نیا موڑ لیا جب حوثیوں نے سعودی عرب کے آٹل پلانٹس پر ڈرون حملہ کیا۔ عارضی طور پر دنیا کی پانچ فیصد تیل سپلائی رک گئی۔ امریکہ نے ایران کو مورد الزام ٹھہرانے کی کوشش کی، مگر ان کے اپنے انٹیلی جنس ادارے جانتے تھے کہ حملے یمن سے ہوئے تھے۔ یہ وہ لمحہ تھا جب امریکہ کو احساس ہوا کہ جس ڈرون ٹیکنا لو جی کو اس نے یمن کے خلاف استعمال کیا، اب وہی ہتھیار اس کے اتحادیوں کے خلاف استعمال ہو رہا ہے۔

سنہ 2022 کے بعد سعودی اتحادی جنگ سے تھک چکے تھے۔ سعودی عرب اور متحده عرب امارات دونوں سمجھ گئے کہ وہ حوثیوں کو نہیں ہرا سکتے۔ اقوام متحده کی ثالثی سے وقتی جنگ بندی ہوئی مگر مکمل امن نہیں آیا۔ حوثی اب یمن کے ستر فیصد علاقے پر قابض تھے، ان کے پاس میزائل اور ڈرون تھے، اور وہ خود کو قومی مزاحمتی تحریک کہتے تھے۔

نتیجہ کیا نکلا؟ تقریباً تین لاکھ ستر ہزار لوگ مارے گئے۔ ایکس ملین لوگ امداد کے محتاج ہیں۔ یمن کی معیشت آہی رہ گئی۔ کرنسی تین گناہ کر گئی۔ بچے اسکوں سے باہر ہیں، شہر کھنڈر بن چکے ہیں، اور بماریاں پھیل چکی ہیں۔ امریکی بم آج بھی زین پر بکھرے ہوئے ہیں، جوہر سال کسانوں اور بچوں کو مارتے ہیں۔

سوویت یونین کے بکھرنے کے بعد ویسٹ ایشیاء میں لڑی جانے والی تمام جنگیں اسرائیل کے ایجادے کے تحت لڑی گئی ہیں اور ان تمام جنگوں میں عرب بادشاہتیں، امریکہ اور یورپ اسرائیل کے اتحادی تھے۔

لیکن صومالیہ، عراق، یمن شام، لبنان اور غزہ میں کی جانے والی بے مثال مزاحمت نے وہ نتائج نہیں دئے جن کی امید اسرائیل کر رہا تھا۔ اسرائیل کے اتحادیوں کو سب سے ہڑا چکا سنہ 2008 کی کساد بازاری میں لگا تھا جس کے بعد مزاحمت بڑھتی چلی گئی تھی۔ اب حوثی صرف باغی نہیں رہے، وہ ایک سیاسی حقیقت بن چکے ہیں۔ ان کے ڈرون ریڈسی میں غزہ کے جینوسائیڈ کے دوران اتحادیوں کے جہازوں پر مسلسل حملے کرتے رہے ہیں۔ امریکہ ایک بار پھر پوری تیاری سے وہاں بھری بیٹھے تعینات کر رہا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اب نشانہ کوئی تنظیم نہیں بلکہ ایران ہے۔ آخری بدقسمیں ہے۔

-----فائل 21-AS کا اختتام-----

ملک: مالدیپ

سال: 2012

فائل: AS-22

سات فروری 2012 کی دوپہر مالدیپ کی تاریخ بدل گئی۔ ٹی وی پر ملک کے پہلے جمہوری طور پر منتخب صدر محمد نشید نمودار ہوئے۔ ان کے چہرے پر تھکن تھی، اور الفاظ میں ایک عجیب بے بسی۔ انہوں نے کہا کہ وہ استعفی دے رہے ہیں کیونکہ وہ "آہنی ہاتھ سے حکومت نہیں کرنا چاہتے"۔ چند منٹ بعد نائب صدر محمد وجد حلف اٹھا رہے تھے، اور ملک کی سڑکوں پر آنسو گیس کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ بعد میں نشید کے اپنے بادی گارڈ نے بتایا کہ صدر کو کہا گیا تھا اگر استعفی نہ دیا تو گولی مار دی جائے گی۔ دنیا نے اسے ایک "آئینی تبدیلی" کہا، مگر حقیقت میں یہ ایک مکمل فوجی بغاوت تھی، جو بیرونی طاقتوں کی مرضی سے ہوئی تھی۔ پس منظر سمجھنا ضروری ہے۔ سنہ 2008 میں تیس سالہ آمر ماعون عبدالقیوم کے خلاف ایک عوامی لہر اٹھی اور محمد نشید برسر اقتدار آئے۔ وہ ایک لبرل اور روشن خیال سیاستدان تھے اور وہ جلد ہی دنیا کے سامنے جمہوریت کی علامت بن گئے۔ انہوں نے دنیا کی توجہ اپنے ملک کے خطرناک مستقبل پر مبندوں کرائی کیونکہ مالدیپ کے جزائر سمندر کی سطح سے بمشکل ایک میٹر اور ہیں۔ انہوں نے دنیا کی پہلی "زیر آب کائینڈ مینگ" کی تاکہ دنیا کو بتایا جا سکے کہ اگر موسمیاتی تبدیلی کو نہ روکا گیا تو مالدیپ ڈوب جائے گا۔ مغربی ممالک ان سے متاثر ہوئے، اقوام متحده میں ان کی تقریریں بہت مقبول ہوئیں۔ لیکن ان کا سب سے اہم فیصلہ یہ تھا کہ انہوں نے بھارت اور مغرب کے ساتھ قریبی تعلقات قائم کیے۔

پھر ان کی حکومت نے چین سے سرمایہ کاری کی بات چھیڑ دی۔ یہی وہ موڑ تھا جہاں کھیل بلٹ گیا۔ دو ہزار دس میں نشید شنگھائی گئے، وہاں چینی حکومت سے نرم قرضوں کے کتنی معاهدے ہوئے۔ یجنگ نے کم سود پر ہاؤسنگ، میوزیم، اور ہوائی اڈے کی توسعی کی پیشکش کی۔ ہوائی اڈہ اُس وقت ایک بھارتی کمپنی جی ایم آر کے پاس تھا، لیکن نشید نے کہا کہ بولی کھلی ہوگی۔ بھارت کا مالدیپ پر بہت اثر تھا اسے یہ چیز ہرگز قبول نہ تھی۔ ہلی میں خطرے کی گھنٹیاں بج گئیں۔ بھارتی میڈیا اور سفارت کار سمجھ گئے

کہ چین مالدیپ کے اندر آ رہا ہے۔ ادھر نشید کی اپوزیشن، جو زیادہ تر سابق آمر کے حامیوں پر مشتمل تھی، اسے "ملکی خود مختاری کی فروخت" قرار دینے لگی۔

اسی دوران ایک اور محاڑ کھل گیا۔ عدیہ اب بھی پرانے آمر کے جھوٹ سے بھری ہوئی تھی۔ جنوری 2012 میں نشید نے ایک نجع عبد اللہ محمد کو گرفتار کرنے کا حکم دیا کیونکہ وہ پرانے وزیروں کے مقدمے روک رہا تھا۔ اس گرفتاری پر اپوزیشن اور مذہبی گروہ سڑکوں پر آ گئے۔ پولیس کے کچھ دستے بھی مظاہرین میں شامل ہو گئے۔ مالے کے رپپلک اسکواٹر میں وہی پولیس والے جنہیں حکومت نے ہنگامہ روکنے کا حکم دیا تھا، الٹا حکومت کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔

چھ فروری کی رات صورتحال قابو سے باہر ہو گئی۔ پولیس نے سرکاری ٹی وی اسٹیشن پر قبضہ کر لیا اور وہاں سے بیانامہ نشر ہونے لگا کہ "اسلام کو بچاؤ"۔ اگلی صبح فوج کے کچھ افسران نے صدر کو کہا کہ وہ ان کی حفاظت کی ضمانت نہیں دے سکتے۔ چند گھنٹوں بعد انہیں کہا گیا کہ اگر استغفار نہ دیا تو خون بھے گا۔ نشید نے دوپہر ایک بجے استغفار پر دستخط کر دئے۔ تین بجے نئے صدر نے حلف اٹھایا۔ وہی پولیس جو ایک دن پہلے بغاوت پر آمادہ تھی، اب نئے صدر کے ہاتھ چوم رہی تھی۔

یہاں سے اصل کہانی شروع ہوتی ہے۔ اگلے چویں گھنٹوں میں بھارت کے ہائی کمشنر نے اعلان کیا کہ یہ تبدیلی "آئینی" ہے۔ امریکہ کے نمائندے رابرٹ بلیک نے کہا کہ "ہمارے پاس بغاوت کے ثبوت نہیں ہیں"۔ ان بیانات کے ساتھ ہی سب کچھ واضح ہو گیا کہ ایک طشدہ کھیل تھا۔ مغرب اور انکا اتحادی بھارت دونوں اس بغاوت کے پچھے تھے۔ انہوں نے اس رجیم چینچ آپریشن کو فوراً تسلیم کر لیا کیونکہ انہیں نشید کی آزادانہ پالیسی، خاص طور پر چین کے ساتھ تعلقات، پسند نہیں تھے۔

لیکن اس تبدیلی کا بھارت کو ہرگز کوئی چیدہ نہیں ہوا۔ حالات نے تیزی سے پلاٹا کھایا اور نئی حکومت نے بھارتی کمپنی جی ایم آر کا ہوائی اڈہ کانٹریکٹ سنوخ کر دیا۔ چینی کمپنیاں فوراً آگے آئیں اور وہی پرو جیکٹ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اگلے چند سالوں میں چین نے وہی ائی پورٹ، پل اور ہاؤسنگ اسکیمیں مکمل کیں۔ نشید کا خواب اسکے بغیر ہی پورا ہو گیا۔

اس واقعے نے مالدیپ کی سیاست کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو سمجھتے تھے کہ یہ بھارت اور مغرب کی مداخلت تھی۔ دوسری طرف وہ جو سمجھتے تھے کہ نشید نے اسلام دشمن قوتوں کو ملک میں لانے کی کوشش کی۔ مالدیپ کے لوگ

کافی مذہبی ہیں، وہ آسانی سے تکفیریت کے پروپیگنڈہ کا شکار ہو گئے، لیکن بھارت نے یہ نہیں سوچا تھا کہ ان کے ملک میں جاری مسلم دشمن پالیسیاں اور ہندو تواء کا پروپیگنڈہ اسے چین سے زیادہ نقصان پہنچا دے گا۔

مذہب کی بنیاد پر معاشرے کی تقسیم نے آنے والے انتخابات کو نہر آلو دیا۔ سن 2013 میں نشید جیت کے قریب پہنچ گئے مگر عدالت نے نتائج بدل دیے۔ اگلے صدر عبد اللہ یامین نے نشید کو "دہشت گردی" کے الزام میں جیل میں ڈال دیا۔ جمہوریت ختم ہو گئی، انتہا پسندی بڑھی، اور کئی نوجوان شام و عراق میں داعش میں شامل ہو گئے۔

علاقائی سطح پر یہ ایک فارمولہ بن گیا۔ بھارت اور مغرب نے دکھایا کہ اگر کسی ملک میں چین اثر بڑھائے گا تو وہ وباں جمہوریت کی قیمت پر بھی مداخلت کریں گے۔ سنہ 2012 میں بغاوت کو "آئینی تبدیلی" کہا گیا، لیکن جب 2018 میں یامین نے چین کے ساتھ فوجی تعاون بڑھایا تو مغرب اور اسکے علاقائی اتحادی بھارت نے اسے "امر" قرار دے دیا۔ مطلب صاف تھا، جمہوریت تب تک اچھی ہے جب تک وہ مغرب کے مفاد میں ہو۔

مالدیپ میں بھارتی مداخلت کی خبر مالدیپ کے لوگوں کو ہو چکی ہے۔ سیاستدان بھارت کی ناراضگی مول لینا نہیں چاہتے اور بھارت کو دوستی کا یقین دلاتے ہیں مگر ان کے عوامی جلسوں میں "انڈیا آؤٹ" کے نعرے لگتے ہیں۔ چین کے قرضے ڈیڑھ ارب ڈالر سے بڑھ چکے ہیں۔ وہی پل جو چین نے بنایا، اب مالدیپ کی پہچان ہے۔ نئی حکومت چین کے اور بھی قریب ہو چکی ہے۔

-----فال 22-AS کا اختتام-----

ملک: شام

سال: 2024

فائل: AS-23

اٹھ دسمبر 2024 کی صبح دمشق میں ایک عجیب خاموشی تھی۔ زیموں کی آواز، ز فائرنگ، ز ٹینکوں کی گڑگڑا ہست۔ صدر بشار الاسد اپنے محل میں بیٹھے تھے جب ان کے چیف آف اسٹاف نے آکر کہا کہ گارڈز محل چھوڑ لئے ہیں، فوج نے ہتھیار ڈال دیے ہیں، اور باغی دار الحکومت میں داخل ہو چکے ہیں۔ چند گھنٹے بعد وہ روسی جہاز میں سوار ہو کر ماسکو چلے گئے۔ اسد خاندان کی مغرب کے خلاف پچاس سالہ مراجمت اس دن ختم ہو گئی۔ ایک ایسی مراجمت جس نے اسرائیل کے خلاف ایک مجاز مضبوطی سے سنبھال رکھا تھا۔

یہ کہانی چودہ سال پہلے شروع ہوئی تھی۔ مسلسل تباہی، بیرونی مداخلت، اور بیرونی طاقتوں کے کھیل کی دردناک داستان۔ یہ خونی کھیل مارچ 2011 میں شروع ہوا جب درعا کے ایک اسکول کی دیوار پر پندرہ لاکوں نے سپرے پینٹ سے لکھا کہ "اب تمہاری باری ہے، ڈاکٹر"۔ ڈاکٹر سے مراد بشار الاسد تھا، جو لندن میں آنکھوں کا معلم رہ چکا تھا اور اپنے باپ حافظ الاسد کی کرسی سنبھال چکا تھا۔ پولیس نے ان لاکوں کو گرفتار کر کے ان پر تشدد کر کے مار ڈالا۔ یہ ایک سازش کے تحت ہوا تھا۔ اس کے نتیجے میں ہنگامے پھوٹ پڑے، شہر کو سیل کر دیا گیا۔ مگر مغرب کو موقع مل چکا تھا۔ اس واقعے کو مغربی سو شل میدیا نے وایرل کر دیا۔ فسادیوں کا بندوبست پہلے سے ہو چکا تھا۔ پہلے مظاہرے درعا میں ہوئے، پھر حمص، حماہ اور پھر دمشق کے مضامات میں۔ فوج نے لکڑوں کی کوشش کی تو کتنی فوجی محرف ہو گئے اور ایک نئی ملیشیا بنی جس نے خود کو فرنی سیرین آرمی کہا۔ اس کا بندوبست بھی پہلے سے ہو چکا تھا۔ امریکہ، سعودی عرب، قطر اور تکی سب پس پردہ سرگرم تھے۔ ابتداء میں فسادیوں کو صرف سیٹلائٹ فون دیے گئے تاکہ ایک دوسرے سے رابطہ رکھ سکیں۔ چند مہینوں بعد قطر نے قذافی کے قبضے سے حاصل کردہ ہتھیار

انقرہ کے راستے شام پہنچانے شروع کیے۔ سعودی عرب نے فنڈنگ کی، فرانس اور برطانیہ نے انٹلی جنس اور میڈیا سپورٹ دی۔ یہ سب کہہ رہے تھے کہ مقصد "پر امن سیاسی حل" ہے مگر اصل منصوبہ ایک طویل جنگ کا تھا۔

سنہ 2013 میں دمشق کے نواح میں کیمیائی حملے ہوئے جن میں چودہ سو لوگ مارے گئے۔ امریکہ کے صدر اوباما نے پہلے ہی کہہ رکھا تھا کہ اگر کیمیائی ہتھیار استعمال ہوئے تو یہ ریڈ لائن ہوگی۔ مگر روس نے نیچ میں آکر ایک ڈیل کرادی۔ اقوام متحده کے نمائندوں نے کہا کہ یہ کیمیائی ہتھیار باغیوں نے استعمال کئے تھے۔ غیر جاندار مبصرین نے بھی فسادیوں پر الزام لگایا۔ اس کے بعد امریکہ نے فسادیوں اور دہشتگرد گروہوں کو باقاعدہ اسلحہ دینا شروع کر دیا۔ اس پروگرام کا نام رکھا گیا "ٹمبر سیکامور" یہ پروگرام پانچ برس میں آٹھ ارب ڈالر کا ہو گیا۔ امریکی اور سعودی ایجنسیوں نے ہزاروں ٹن اسلحہ اردن اور ترکی کے راستے بھیجا۔ ان میں ٹینک شکن میزائل، بھاری مشین گنر اور کروڑوں راؤنڈ گولیاں شامل تھیں۔ اسی دوران القاعدہ، داعش اور دوسرے دہشتگرد گروہ بھی یہی ہتھیار استعمال کر رہے تھے۔

سنہ 2015 میں روس نے جنگ میں براہ راست مداخلت کی۔ روسی بمبار طیارے حلب اور ادلب میں دہشتگردوں کے ٹھکانوں پر بم برسانے لگے۔ امریکہ نے اس کا جواب یہ دیا کہ کرد ملیشیا کے ساتھ اتحاد بنایا۔ ان کروں نے مشرقی شام کا بڑا علاقہ قبضے میں لے لیا۔ ادھر خلیجی ممالک نے دہشتگرد گروہوں کو مزید اسلحہ دینا شروع کیا۔ اس وقت شام میں پندرہ سو سے زیادہ گروہ سرگرم تھے، ہر ایک کسی نہ کسی یونی طاقت کا آلہ کار تھا۔ ان گروہوں کی آپس میں بھی اختلافات تھے۔ داعش کے مظالم اس قدر بڑھ چکے تھے کہ ان کے ساتھ تعلق رکھنا مغرب کیلئے اسقدر شرمناک تھا کہ امریکہ اور اسرائیل بھی یہ تہمت قبول کرنے سے گھبرانے لگے تھے۔

سنہ 2017 میں ٹرمپ کے دور میں ایک اور کیمیائی حملے کے جواب میں امریکہ نے شام پر میزائل برسائے۔ مگر اس سے کچھ نہیں بدلا۔ داعش کو ختم کرنا ایک مجبوری بن چکی تھی۔ داعش کے ختم ہوتے ہی شام تین حصوں میں بٹ گیا۔ شمال ترکی کے زیر اثر تھا، مشرق امریکی حمایت یافتہ کروں کے پاس، اور مغرب بشار الاسد کے قبضے میں تھا۔ باقی ملک کھنڈر بن گیا۔

پھر 2020 میں امریکہ نے سیزر ایکٹ کے نام سے سخت معاشی پابندیاں لگادیں۔ کسی ملک کو اجازت نہیں تھی کہ شام میں سرمایہ کاری کرے، حتیٰ کہ بھلی گھروں کی مرمت بھی جرم بن گئی۔ لبنان کا یمن نگ نظام بیٹھ گیا جس پر شام کا انحصار تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ

کرنی زین بوس ہو گئی، مہنگائی آسمان پر پہنچ گئی، اور لوگ بھوک سے تنگ آ کر گینگز اور ملیشیا ڈل میں شامل ہونے لگے۔ ایسے میں کپٹا گون نامی نشہ آور گولیوں کا کاروبار بھی شام میں پھیلایا گیا۔ یہ نشہ آور گولیاں خلیج اور یورپ میں بکتی تھیں۔ مسلسل پابندیوں اور جنگ نے لوگوں کو منشیات کی سملکنگ جیسے جرام میں دھکلیل دیا۔ ایک ایسا ملک جہاں پر لوگ امن سے رہ رہے تھے، بھوک اور افلاس کی جہنم میں دھکلیل دیا گیا۔

پھر سنہ 2024 آیا، اسرائیل نے لبنان میں حزب اللہ کے لیڈروں کو نشانہ بنایا اور ایران کے میزائل پروگرام کو نثار گڑ کیا۔ روس یوکرین کی جنگ میں پھنس چکا تھا، اس نے شام سے اپنے ماہر پائلٹ واپس بلا لیے۔ اس خلا کو ترکی اور باغی گروہوں نے فوراً آپر کیا۔ پرانے امریکی ٹینک شکن میزائل اور ترک ڈرونز کے ساتھ ایک بڑا حملہ شروع ہوا۔ چند دنوں میں حماہ، حمص، اور آخر کار دمشق باغیوں کے ہاتھ میں آگیا۔ بشار الاسد روس چلا گیا۔ نصف صدی پر محیط مذاہمت دم توڑ گئی۔

اس جنگ کی قیمت خوفناک تھی۔ مغرب کے اندازوں کے مطابق پانچ لاکھ اسی ہزار لوگ مارے گئے، تیس لاکھ سے زیادہ بچے دربارہ ہوئے، ساڑھے چھ ملین لوگ ملک چھوڑ کر پناہ گزین بنے۔ معیشت بر باد ہو گئی۔ کپاس اور گندم میں خود کفیل ملک اب ستر فیصد خوراک درآمد کرتا ہے۔ ملک کی دو تہائی بھلی کے پلانٹ تباہ ہیں۔ پانی ہفتے میں صرف دو دن ملتا ہے۔ ہزاروں گاؤں مسٹی کے ڈھیروں میں بدل چکے ہیں۔ اور سب سے زیادہ نقصان انسانی سطح پر ہوا۔ جو نسل دوہزار گیارہ میں اسکول میں تھی، وہ آج صرف بندوق اور کیمپ جانتی ہے۔ آزاد ذرائع کہتے ہیں کہ جانی نقصان مغربی اندازوں سے کہیں زیادہ ہے۔

اسرائیل نے نیتن یاہو کے مقرر کردہ اہداف میں سے ایک اور پورا کر لیا۔ ایران نے اپنا سب سے بڑا اتحادی کھو دیا۔ روس کے پاس اب صرف دو اڈے بچے ہیں جن پر بات چیت کیلئے الجولانی آجکل روس کے دورے پر ہے۔ ترکی کے کنٹرول میں شمالی علاقے ہے اور وہ تقریباً چالیس لاکھ پناہ گزینوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے۔ خیجی ملکوں نے اس جنگ میں تیس ارب ڈالرز انوسٹ کیے اور آخر کار ایک ایسے گروہ کا سربراہ اقتدار پر قابض ہوا جو القاعدہ اور داعش دونوں گروپوں میں رہ چکا تھا۔ امریکہ نے بارہ ارب ڈالر خرچ کر کے کردیاست بنا دی جو اب دمشق سے تیل پر سودے بازی کر رہی ہے۔ یورپ کو بارہ لاکھ مہاجرین ملے جن پر دائیں بازو کی جماعتیں شور مچا رہی ہیں۔ یہی دائیں بازو کی جماعتیں مغربی ایشیاء میں مداخلت کی سب سے زیادہ حمایتی رہی

ہیں۔

آج 2025 میں شام میں ایک عبوری حکومت ہے۔ الجولانی اپنا نام بدل کر احمد الشرع بن چکا ہے اور اس عبوری حکومت کا سربراہ ہے۔ امریکہ نے اسی سال جولائی میں اسے وہشت گروں کی فہرست سے نکالا ہے۔ یورپ نے پابندیاں نرم کرنی شروع کر دی ہیں۔

مگر چیلنج وہیں ہیں۔ کہاں بھی خود مختاری مانگ رہے ہیں، اسرائیل جنوبی شام میں اپنی فوج نہیں ہٹا رہا، اور مغرب کی اپنی اکانومی تباہ حال ہے اسلئے کہیں سے بھی بہتری کی امید نظر نہیں آ رہی۔

لیبیا کی طرح شام کو بھی ایسی آزادی ملی ہے جس میں غلاموں کی منڈیاں لگی ہیں۔ شام آزاد نہیں ہوا، بس حاکم بدل گئے ہیں۔ مجال ہے کہ مغربی تجزیہ نگاروں کو یہ کہتے ہوئے کبھی شرم آتی ہو کہ بشار الاسد ڈکٹیٹر تھا۔ اسرائیل کا مقصد ہی یہ تھا کہ شام میں ایسا فساد شروع کروا یا جائے جس کی کوئی انتہاء نہ ہو، کوئی حل نہ ہو۔

جب تک مغربی سامراجی نظام قائم ہے انسانیت ہارتی رہے گی۔ کبھی لیبیا میں تو کبھی شام میں۔

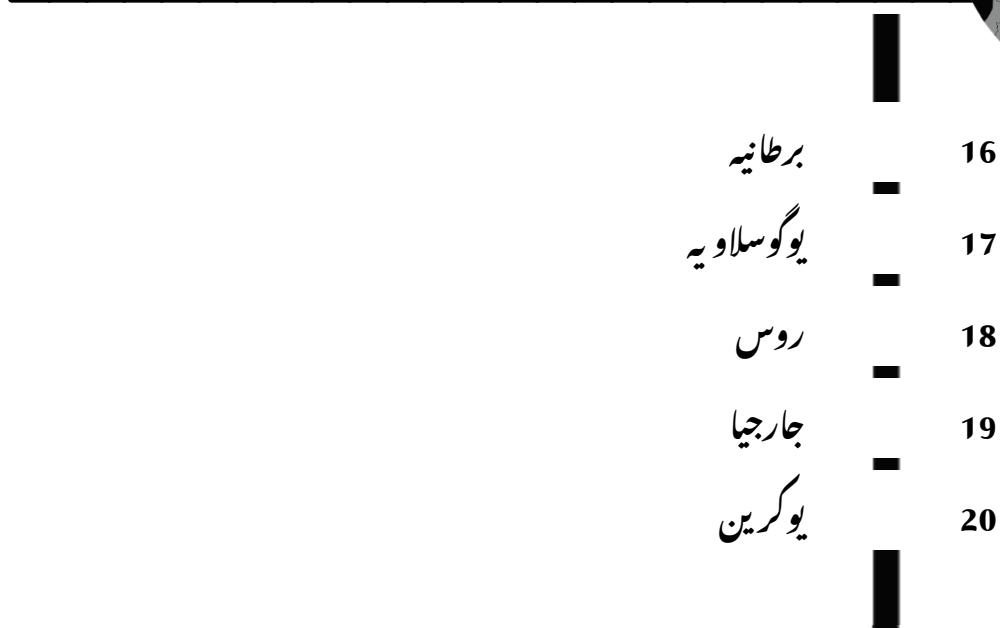
-----فائل 23-AS کا اختتام-----

# یورپ



فرانس	1
چیکو سلواکیہ	2
اٹلی	3
مغربی جرمنی	4
البانيا	5
مشرقی جرمنی	6
ہنگری	7
فرانس	8
قبرص	9
یونان	10
چیکو سلواکیہ	11
اٹلی	12
پرتگال	13
فرانس	14
پولینڈ	15

# يورپ





ملک: فرانس

سال: 1947

فال: EU-01

تھیس دسمبر 1947 کی رات تین بجے یہر میں ایک فیصلہ ہوا جس نے فرانس کی سیاست کا نقشہ بدل دیا اور امریکہ کو یورپ کی سیاست میں ایسا اثر دیا جو آج تک قائم ہے۔ اسی رات وزیر اعظم پال رامیڈیٹر نے اپنے پانچ کمیونسٹ وزیروں کو کاینہ سے نکال دیا۔ اگلی دوپہر واشنگٹن سے ایک مختصر سایپیغام آیا کہ فرانس کی امداد اب بغیر کسی رکاوٹ کے جاری رہے گی۔ اور یوں امریکہ کے ڈالر فرانس کی سیاست کے فیصلوں کا معیار بن گئے۔

یہ وقت تھا جب دوسری عالمی جنگ ختم ہو چکی تھی مگر فرانس کے شہر اور فیکٹریاں ملبے کے ڈھیر تھے۔ صنعت اپنی پرانی سطح کے نصف سے بھی کم پر تھی۔ لوگ راشن کارڈوں پر زندہ تھے۔ ملک کے پاس ڈالر نہیں تھے کہ باہر سے گندم خرید سکے۔ ایسے میں فرانس کی کمیونسٹ پارٹی سب سے بڑی سیاسی طاقت بن کر ابھری۔ پانچ وزراء اسی کے پاس تھے جن میں دفاع اور صنعت کے وزیر بھی شامل تھے۔ واشنگٹن کو ایسی جمہوریت ہرگز قبول نہیں تھی۔

پانچ جون 1947 کو امریکی وزیر خارجہ جارج مارشل نے یورپ کی تعمیر نو کے لیے ایک بڑے امدادی پروگرام کا اعلان کیا۔ ظاہری مقصد تو یورپ کی بحالی تھا مگر پس پرده اصل سوال یہ تھا کہ کیا امریکہ اپنے ڈالرز سے یورپ کے سیاسی نقشے کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال سکتا ہے۔ اسی سوال کا جواب فرانس میں دیا گیا۔

یہر میں امریکی سفیر جیفرسن کیفیری نے پیغام بھیجا کہ اگر فرانس کو مغربی اتحاد میں رکھنا ہے تو سب سے پہلے حکومت سے کمیونسٹوں کو نکالنا ہو گا۔ کچھ دن بعد امریکی نائب وزیر خارجہ ڈین ایچسن نے صاف کہا کہ کانگریس کبھی بھی ایسے ملک کو امداد نہیں دے گی جس کے دفاعی اور صنعتی محلے کمیونسٹ وزراء کے پاس ہوں۔

یہ بات وزیر اعظم رامیڈیئر تک پہنچی۔ وہ پہلے ہی کمیونسٹ لیڈروں سے جان چھڑوانا چاہتا تھا جو مزدوروں اور کسانوں کے حقوق کیلئے بات کرتے تھے اور انڈو چاننا یعنی، ویتنام، کمبودیا، لاوس وغیرہ میں جنگ کے لیے فوجی بجٹ کی مخالفت کر رہے تھے۔ اپریل 1947ء میں رینوکی فیکٹری سے شروع ہونے والی ہڑتا لیں پورے ملک میں پھیل گئیں۔

کمیونسٹوں نے انہیں مکمل حمایت دے دی۔ کمیونسٹ پارٹیوں نے صحیح طور پر مارشل پلان کو ڈالر اپیریلزم قرار دیا۔ فرانسیسی کمیونسٹوں نے بھی فرانس کی خود مختاری کی خاطر اسمبلی میں اس کے خلاف ووٹ دیا۔ وزیر اعظم نے اسی موقع کا فائدہ اٹھایا۔ بیس دسمبر کو امریکی امدادی مشن نے ایک یادداشت بھیجی جس میں صاف لکھا تھا کہ امداد صرف اسی صورت میں ملے گی جب حکومت میں ایسے عناصر نہ ہوں جو مارشل پلان کے مقاصد کے مخالف ہوں۔ اگلے ہی دن رامیڈیئر نے کابینہ اجلاس میں کمیونسٹ وزیروں پر جمہوریت کے خلاف سازش کا الزام لگایا اور ان سے استعفے مانگ لیے۔ تینیں دسمبر کی صحیح ان کے دستخط سے فیصلہ جاری ہوا۔ چند گھنٹے بعد واشنگٹن نے تصدیق کر دی کہ امداد جاری رکھی جائے گی۔

یہ صرف ایک سیاسی فیصلہ نہیں تھا بلکہ فرانس کے مستقبل کا موڑ تھا۔ کمیونسٹ پارٹی ایک دن میں اقتدار سے اپوزیشن میں چل گئی۔ اگلے سالوں میں حکومت کے اقدامات نے لاکھوں مزدوروں کو ہڑتا لوں پر مجبور کر دیا جن کی قیادت کمیونسٹ پارٹی کر رہی تھی۔ مگر کو امریکی ڈالرز کی حمایت میسر تھی وہ مضبوطی سے کھڑی رہی۔ دوسری طرف سو شلسٹ اور کر سچن ڈیموکریٹس نے ایک نیا اتحاد بنایا جسے بعد میں تھرڈ فورس کہا گیا۔ اسی اتحاد نے یورپی دفاعی کمیونٹی کے معاهدے کی بنیاد رکھی۔

امریکی امداد کے پہلے ارب ڈالرنے فرانسیسی میഷت کو سانس دی۔ گندم درآمد ہوئی، کرنی مسٹکھم ہوئی، اور مونیٹ پلان کے تحت اسٹیل کی پیداوار دو گئی ہو گئی۔ دو سال میں فرانس کی میഷت جنگ سے پہلے کے معیار پر واپس آگئی۔ مگر اس کامیابی کی قیمت یہ تھی کہ اب ہر بڑی سیاسی تبدیلی کے پچھے واشنگٹن کی رضامندی ضروری بن چکی تھی۔

اس فیصلے نے فرانسیسی بائیں بازو کو تقسیم کر دیا۔ کمیونسٹ پارٹی نے میں سال تک کسی دوسرے سیاسی گروہ سے ہاتھ ملانے سے انکار کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر انتخاب میں بایان بازو بٹا رہا اور دایاں بازو متحد ہو کر کامیاب ہوتا رہا۔ واشنگٹن نے یہی ماذل اٹلی، بیلچیم اور یونان میں بھی آزمایا۔ جہاں بھی مارشل پلان کے ڈالر گئے وہاں شرطیہ تھی کہ حکومت میں کمیونسٹ نہ ہوں۔

یورپی اداروں نے بھی اسی سوچ کو اپنا لیا۔ سنہ 1948 میں بننے والی او ای ای سی اور بعد میں یورپی اسمیل اینڈ کول کمیونٹی میں ایسی شفیع شامل کی گئیں جن کے مطابق کسی بھی حکومت میں اگر "کمیونٹ" عناصر آئیں تو فنڈر روک دیے جائیں گے۔ آج بھی یورپی یونین جب ہنگری یا پولینڈ پر قانون کی حکمرانی کے نام پر دباؤ ڈالتی ہے تو وہی پرانی منطق دہراتی ہے۔

پچھلے چند سالوں میں جب واشنگٹن نے خبردار کیا کہ اگرڑاں لیوک میلینشون جیسا لیڈر فرانس میں جیت گیا تو یئٹو کے تعلقات متاثر ہوں گے، تو فرانسیسی اخبارات نے فرما 1947 کی تاریخ کے حوالے دئے۔ اسی طرح یورپی کمیشن کا منصوبہ کہ فنڈر کی فراہمی کو "یورپی اقدار" سے مشروط کیا جائے، بائیں بازو نے اسے "مارشل پلان ورژن ٹو" کا نام دیا۔

پچھتر سال گزر گئے مگر یہ سوال اب بھی زندہ ہے کہ کیا یورپ اپنی خود مختاری برقرار رکھتے ہوئے امریکی امداد قبول کر سکتا ہے۔ سنہ 1947 کی وہ سرد رات جب رامیڈیئر نے پانچ وزیروں کے استغفار لیے تھے، آج بھی ہمیں یہی سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ مغربی جمہوریت کی اصل حقیقت کیا ہے؟

-----فائل EU-01 کا اختتام-----

ملک: اٹلی

سال: 1948

فائل: EU-02

انیں اپریل 1948 کی صبح جب روم کے اخبار چھپے تو ان کی سرخیوں نے پورے یورپ کو ہلا کر رکھ دیا۔ اٹلی کی پہلی ریپبلکن پارلیمانی الیکشن میں کر سچن ڈیموکریٹک پارٹی نے کمیونسٹ اتحاد کو شکست دے دی تھی۔ مگر اس جیت کے پچھے عوامی حمایت نہیں بلکہ امریکی مداخلت تھی۔ امریکہ کا پیسہ، ویٹ کن کا نمبر، اور ایک ایسی الیکشن کی پیش جو اٹلی میں نہیں بلکہ امریکہ میں پلان کی گئی تھی۔ اس الیکشن دھاندی نے سرجنگ کے بنیادی امریکی اصول طے کر دئے کہ سرجنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ پس منظیر ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد اٹلی کی معیشت مکمل تباہ کر دی گئی تھی۔ ملک میں چار لاکھ لوگ مارے جا چکے تھے، کرنی اپنی قدر کھو بیٹھی تھی، اور لوگ بھوک سے نڑھاں تھے۔

ایسے وقت میں دو جماعتیں سامنے آئیں۔ ایک طرف گیسپری کی کر سچن ڈیموکریسی تھی جو مغرب کے قریب تھی۔ دوسری طرف تھی تو گلیاتی کی کمیونسٹ پارٹی جس کے پاس لاکھوں کارکن، مزدور یونینیں اور عوامی حمایت موجود تھی۔ عوام کے دل میں سوال یہ تھا کہ کون انہیں روٹی، امن اور عزت دے گا۔ لیکن امریکہ کے ذہن میں سوال یہ نہیں تھا۔ واشنگٹن کو گلوبل استیبلشمنٹ سے ہر حال میں سرمایہ داری نظام بچانے کا ینڈیٹ ملا ہوا تھا۔

فروری 1948 میں جب چیکو سلو ایکہ میں کمیونسٹ حکومت بن گئی تو ٹروین حکومت میں کھلبی مج گئی۔ سی آئی اے کو پہلا خفیہ آپریشن دیا گیا۔ منصوبہ یہ تھا کہ کمیونسٹوں کو اٹلی میں کسی بھی قیمت پر ہر انہا ہے۔ امریکی سفارت خانے کے تہہ خانے سے کیش بھرے تھیلے رات کے اندر ہیرے میں کر سچن ڈیموکریٹس کے دفتروں تک پہنچنے لگے۔ اندازہ ہے کہ بیس ملین ڈالر سے زیادہ رقم تقسیم کی گئی۔ سی آئی اے کے ایک افسر نے بعد میں کہا کہ "میری گاڑی کی اگلی سیٹ پر میسے کے تھیلے پڑے ہوتے تھے اور میں انہیں مختلف علاقوں میں بانٹتا تھا۔"

صرف پیسے ہی نے سب کچھ نہیں کیا تھا۔ ایک نفسیاتی مہم بھی چالائی گئی تھی۔ امریکہ سے لاکھوں خطوط اٹلی کے شہریوں کو ملے جن پر لکھا تھا کہ اگر کمپونسٹ جیت گئے تو امریکہ امداد مدد کر دے گا۔ واتس آف امریکہ نے اطالوی زبان میں چوینس گھنٹے نشریات شروع کیں۔ ہالی ووڈ نے فلمیں بھیجیں جن میں کمپونز姆 کو غربت اور غلامی سے جوڑا گیا۔ دی گیسپری کی تصویر ٹائم میگزین کے سروق پر آئی۔ چرچوں میں خطبے دیے گئے کہ کمپونسٹوں کو ووٹ دینا گناہ ہے۔ یہاں تک کہ آٹے کے تھیلے جن پر "امریکی عوام کی طرف سے تحفہ" لکھا ہوتا، چرچ کے ذریعے تقسیم کیے گئے تاکہ لوگ مذہب اور امریکہ کو ایک ہی سائیڈ پر دیکھیں۔ سیکولر مغرب نے الیکشن جیتنے کیلئے مذہب کا بے دریغ استعمال کیا۔

دوسری طرف کمپونسٹ پارٹی کے پاس لاکھوں کارکن، اخبارات اور تنظیمی ڈھانچہ ضرور تھا، مگر ان کے پاس وہ وسائل نہیں تھے۔ ماسکو ان کی امریکہ کی طرح مدد نہیں کر سکتا تھا۔ تو گلیاتی نے گندم کے دس بھری جہازوں کی اپیل کی تھی، مگر سوویت یونین وہ مدد نہ بھیج سکا۔ کمپونسٹوں کے خلاف اسقدر پروپیگنڈہ کیا گیا کہ عام شہریوں کے دل میں ڈریٹھ گیا کہ کمپونسٹ حکومت بننے سے خانہ جنگلی شروع ہو جائے گی۔ امریکہ کمپونسٹ ملکوں پر ایتم بم گراۓ گا۔

سی آئی اے نے کرچن ڈیموکریٹس کو جتوادیا اور گیسپری وزیر اعظم بن گیا اور امریکہ نے سکھ کا سانس لیا۔ واشنگٹن نے سمجھا کہ اس نے اٹلی کی حکومت اپنے اتحادیوں کو دے کر اٹلی کو بھی کثروں میں لے لیا ہے اور پورے مغربی یورپ کی دفاعی لائن بھی محفوظ کر لی ہے۔ مگر اس دھاندلی زدہ الیکشن نے اٹلی میں ایک طویل دور شروع کیا جس میں ہر الیکشن ہی پیسے اور دھاندلی سے ہوتا رہا۔ کمپونسٹوں حکومت میں نہ آسکے مگر وہ دایں بازو کی حکومتوں کو اپنے آگے بھگاتے رہے۔

اٹلی کی سیاست میں ہر الیکشن کے پچھے خفیہ پیسے استعمال ہوتا۔ سی آئی اے نے بعد کے انتخابات میں بھی کرچن ڈیموکریٹس کو پیسے دیے، قوانین بدلنے میں مدد کی، اور بائیں بازو کی جماعتوں کو حکومت سے دور رکھا۔ اگلے چوالیں برس میں کرچن ڈیموکریٹس کو تقریباً ہر حکومت میں شامل رہے۔ اٹلی بظاہر ایک جمہوری ملک رہا گردراصل اس کی سیاست واشنگٹن کی جیب میں تھی۔

اٹلی کا الیکشن دھاندلی والا ماڈل بعد میں دوسرے ممالک میں بھی استعمال ہوا۔ یونان، گواتے مala، برازیل، چلی، جہاں کہیں امریکہ کو خدشہ ہوا کہ بائیں بازو کی حکومت آسکتی ہے، وہاں یہی ترکیب دہرانی گئی۔ نقد رقوم، جعلی خطوط، مذہبی مہمات، ریڈیو نشریات،

بالکل اسی طرح لاگو کر دیا جاتا۔ یہی وقت تھا جب "ایگز آف منی" امریکی انٹلی جنس کی اصطلاح بن گئی۔ بعد میں جب امریکی کانگریس کی کمیٹیوں نے ان رازوں کو بے نقاب کیا تو دنیا کو اندازہ ہوا کہ جمہوریت کے نام پر کیسا فراڈ چل رہا تھا۔ آج بھی اٹلی میں ہر ایکشن کے وقت "سنہ 48 کا بحوث" یاد کیا جاتا ہے۔ جب کوئی سیاستدان ایکشن مداخلت کی بات کرتا ہے تو لوگ اسی کہانی کی مثال دیتے ہیں۔ اب یہ مداخلت صرف ریڈیو یا خطوط سے نہیں بلکہ فیس بک پوسٹس، ٹوٹر ٹوٹس اور کرپٹو کرنسی سے کی جاتی ہے۔ مقصد وہی ہے، صرف طریقے بدل گئے ہیں۔ نیٹو نے اپنے "ہاترڈوار فیٹر" کے تصور میں اس تاریخ کو بطور انتباہ شامل کیا ہے کہ جمہوریت اب صرف ووٹ سے نہیں بلکہ ڈیٹا سے بھی جیتی یا ہاری جاتی ہے۔

محبھے لگتا ہے کہ 1948 کا واقعہ صرف اٹلی کی کہانی نہیں بلکہ پورے جدید سیاسی نظام کا آئینہ ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ مغربی سامراج کو یہ جمہوری نظام اسلئے چاہئے کیونکہ وہ اسے نہایت آسانی سے manipulate کر لیتے ہیں اور دنیا بھر میں اپنی مرضی کی حکومتیں بنو لیتے ہیں۔ اٹلی کے ایکشن نے 1948 ہی میں طے کر دیا تھا کہ اصل طاقت عوام کے ووٹ میں نہیں بلکہ ڈالرز اور میڈیا پروپیگنڈہ میں ہے۔ اور یہ حقیقت آج بھی ہر ملک کے ایکشن میں صاف نظر آتی ہے۔

-----فائل EU-02 کا اختتام-----

ملک: چیکو سلو اکیہ

سال: 1948

فائل: EU-03

پھیس فوری 1948 کو جب چیکو سلو اکیہ کے صدر ایڈورڈ بینش نے کیونسٹ حکومت کو حلف دوا�ا تو پورا یورپ جیسے لمحہ بھر کے لیے رک گیا۔ وہ ملک جنگ کے بعد مشرقی یورپ میں واحد مغربی حیف سمجھا جاتا تھا، اچانک ایک ہی ہفتے میں سوویت کیپ میں چلا گیا۔ اسے لوگ آج بھی "فوری کی جیت" کہتے ہیں۔

جنگ کے بعد چیکو سلو اکیہ کی حالت بتاہی کے قریب تھی۔ فیکٹریاں ٹوٹی ہوئی تھیں، جرم نسل کے لوگ ملک سے نکالے جا چکے تھے، خزانہ خالی تھا۔ لیکن اس ملک کے پاس دنیا کا سب سے قیمتی خزانہ بھی تھا، یورپیم کی وہ کان جو سوویت یونین کے اہمی پروگرام کے لیے سونا ثابت ہوئی۔ پھر بھی یہ ملک مغربی اثر میں رہا۔ سنہ 1946 کے انتخابات میں کیونسٹ پارٹی سب سے بڑی طاقت بن کر ابھری مگر اکثریت حاصل نہ کر سکی۔ کلیمنٹ گٹ والڈوزیر اعظم بنے لیکن اصل طاقت ان کے ساتھیوں کے پاس تھی جنہوں نے داخلہ، اطلاعات اور پولیس کا نظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یہی وزارت بعد میں پورے ملک کی تقدیر بدلنے والی تھی۔

اس وقت سوویت فوج چیکو سلو اکیہ سے واپس جا چکی تھی۔ اٹلی اور فرانس میں امریکی دباؤ پر کیونسٹ نمائندے حکومت سے نکال دیے گئے تھے۔ کیونسٹوں کو ڈر تھا کہ اگر پر اگ میں بھی ایسا ہوا تو مشرقی یورپ کا آخری دروازہ بند ہو جائے گا۔ دوسرا طرف واشنگٹن چیکو سلو اکیہ میں بھی اٹلی اور فرانس کی طرح دباؤ بڑھانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ سی آئی اے نے کانگریس سے خفیہ فنڈ کی منظوری لی کہ آئندہ انتخابات میں کیونسٹ مخالف جماعتوں کی مدد کی جائے۔ مگر یہ رقم کبھی استعمال نہ ہو سکی۔

اصل کھیل فوری 1948 میں شروع ہوا۔ بارہ فروری کو وزیر داخلہ و اسلاف نو سیک نے کاپینہ کی مخالفت کے باوجود آٹھ غیر کیونسٹ پولیس سربراہوں کو برطرف کر دیا اور اپنی پارٹی کے وفادار لگا دیے۔ اس کے جواب میں بارہ وزیروں نے استینی

دے دیا۔ ان کا خیال تھا کہ صدر بینش یہ استغفے قبول نہیں کریں گے اور گوٹ والڈ کو یا تو پسپا ہونا پڑے گایا نئے انتخابات کرانے ہوں گے جن میں امریکی ڈالرز اور پروپیگنڈہ سے جیتنے کے امکانات زیادہ تھے۔ لیکن بینش نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اکیس فروری سے پورا ملک ہڑتا لوں اور مظاہروں کی لپیٹ میں آگیا۔ پچیس لاکھ مزدور سڑکوں پر آگئے۔ کمیونسٹوں نے "ایکشن کمیٹیاں" بنائیں جنہوں نے سرکاری دفاتر، ریڈیو اسٹیشنوں اور اخباروں پر قبضہ کر لیا۔ فیکٹری مزدوروں کے گروہ شہر کے پلوں اور ریلوے اسٹیشنوں پر گشت کرنے لگے۔ سوویت نائب وزیر خارجہ ولیم زورن خود پر اگ پہنچنے تاکہ "غلہ کی ترسیل کی نگرانی کریں" تاکہ جو کوتاہی اٹلی میں ہوئی تھی وہ چیکو سلو اکیہ میں نہ ہو۔ اس دباؤ میں صدر بینش نے پچیس فروری کو استغفے قبول کر لیے اور نئی حکومت میں کمیونسٹوں کو اکثریت دے دی۔

کچھ ہی دنوں میں پارلیمنٹ نے متفقہ طور پر گوٹ والڈ کی حکومت پر اعتماد کا اظہار کیا۔ کمیونسٹوں نے اپنا کنٹرول قائم کر لیا۔ مئی کے انتخابات میں کمیونسٹ نمائندوں کو نوے فیصد ووٹ ملے۔

مغرب نے صرف چیکو سلو اکیہ ہی نہیں کھویا بلکہ پورے مشرقی یورپ میں کمیونسٹ انقلاب کی لہر پھیل گئی۔ ہنگری نے چند ماہ بعد اپنے سب سے بڑے مذہبی رہنمایا کارڈنل منڈزینٹی کو گرفتار کیا۔ پولینڈ میں کسان پارٹی بند کر دی گئی۔ حتیٰ کہ فن لینڈ جیسے غیر کمیونسٹ ملک نے بھی ہنگامی قوانین بنائیں تاکہ اندر وون ملک کمیونسٹوں کا اثر کم رکھا جاسکے۔

امریکہ نے اس شکست کے بعد مزید جارحانہ حکمت عملی اپنالی۔ اس کے بعد امریکہ نے مشرقی یورپ میں خفیہ فنڈر بانٹنے سے بڑھ کر پروپیگنڈہ کیلئے ریڈیو فری یورپ جیسے نشریاتی ادارے بنے، گلیڈیو جیسے خفیہ نیٹ ورک قائم ہوئے، اور جہاں ممکن ہوا وہاں معاشی دباؤ بڑھایا گیا۔ اسی واقعے کے بعد امریکہ نے نیٹو کے قیام کی منظوری دی۔ بعد میں وزیر خارجہ ڈین امچسن نے مانا کہ اگر چیکو سلو اکیہ میں مزدور نہ جیتے تو نیٹو بھی نہ بنتا۔

چیکو سلو اکیہ کے انقلاب نے طاقت کے ایک نئے تصور کو جنم دیا۔ کمیونزم کی مقبولیت تیزی سے بڑھنے لگی۔ بین الاقوامی سطح پر یہ انقلاب یورپ کے لیے ایک نفسیاتی موڑ تھا۔ اس کے بعد کوئی بھی ملک یہ وہم نہیں رکھ سکا کہ وہ مشرق اور مغرب دونوں کے ساتھ آزادانہ تعلقات رکھ سکتا ہے۔ مغرب نے کمیونزم کے خلاف جنگ کو بقاء کا مسلسلہ بنایا اور ہر اصول بالائے تاک رکھ کر کمیونزم کا راستہ روکنے کی حکمت عملی اپنالی۔

سوسیت یونین کے بھرنے کے بعد نیٹو کا مشرق کی طرف پھیلا۔ اسی مغربی سوچ کا حصہ ہے جو سوسیت یونین کے بعد بدلنی چاہئے تھی۔ نیٹو کو ختم کر کے روس کو یورپی یونین کا حصہ بنایا جانا چاہئے تھا۔ اور اگر نیٹو کو برقرار رکھنا ضروری تھا تو روس کو اس میں شامل کر کے ایک عالمی سطح کا دفاعی نظام بنایا جا سکتا تھا جس سے دنیا میں امن قائم کرنا بہت آسان ہو جاتا۔ مگر مغرب کی سوچ مکمل اجارہ داری قائم کرنے کی رہی۔ پوری دنیا کو غلام بنانا کہ اپنا نظام چلانے کی پالیسی۔

لیکن اچانک حالات بدے اور یہی مقاصد پورے کرنے کی وجہ سے مغرب ضرورت سے زیادہ محاذ کھول بیٹھا، کتنی جنگیں توقع کے مطابق نہیں چلیں، جس کی وجہ سے کساد بازاری کا سامنا کرنا پڑا۔ چین کو مجرماً ترقی کیتے زیادہ وقت مل گیا۔ اس وقت حالات یہ ہیں کہ امریکہ اور اسکے اتحادیوں کو کمیونزم سے بھی ٹڑے چیلینچ کا سامنا ہے۔ نئی سرد جنگ شروع ہو چکی ہے۔ اور امریکی سی آئی اے ایک بار پھر سرگرم ہے۔ لیکن اس بار حالات کافی مختلف ہیں۔ کمیونسٹ چھلے اسی سالوں میں بہت کچھ سیکھ چکے ہیں۔

-----فائل EU-03 کا اختتام-----

ملک: ال巴نیہ

سال: 1949

فائل: EU-04

سنہ 1949 کی ایک رات تھی جب برطانیہ نے ایک خفیہ آپریشن میں الباویہ کے ساحل پر چند تربیت یافتہ کمانڈوز اتارے۔ ان کا مشن تھا انور ہوڑا کی کمیونسٹ حکومت کو گرا کر ایک اپنی کٹھپتلی حکومت قائم کرنا۔ مگر جیسے ہی وہ زین پر اترے، الباویں سیکیورٹی فورس ان کی منتظر تھی۔ چند گھنٹوں میں سب مارے گئے یا گرفتار ہوئے۔ یہ تھی اس خفیہ جنگ کی شروعات جسے مغرب نے "آپریشن ولیو اسپل" کہا اور الباویں اسے "قیمتی لوگ" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

دوسری جنگِ عظیم کے اختتام پر الباویہ ایک تباہ حال ملک تھا۔ اس پر پہلے اطاولی قبضہ تھا پھر جرمن فوجیں قابض ہوئیں، اور آخر کار کمیونسٹ گوریلا گروہ نے الباویہ کو آزادی دلوائی۔ انور ہوڑا انہی کمیونسٹ انقلابیوں کے لیڈر تھے جنہیں برطانیہ اور امریکہ نے فاشزم کے خلاف جنگ میں مددی تھی۔ لیکن جنگ ختم ہونے کے بعد ہوڑا نے مغرب کی کمیونزیم کے خلاف جارحانہ پالیسی کے مقابلے میں سخت موقف اختیار کر لیا۔ انہوں نے بادشاہیت ختم کر کے ملک میں سو شلسٹ ریفارمز کیں اور سوویت یونین کے اتحادی بن گئے، الباویہ پر اپنا کنٹرول مضبوط کر لیا۔ مغرب کے لیے یہ ناقابل برداشت تھا۔ انہیں لگا کہ اگر کسی ملک سے کمیونزیم کو پچھے دھکیلا جا سکتا ہے تو وہ الباویہ ہے۔

اسی خیال سے آپریشن ولیو اسپل شروع ہوا۔ سی آئی اے اور ایم آئی سکس نے مل کر منصوبہ بنایا کہ بیرون ملک جلاوطن الباویں باشندوں کو خفیہ تربیت دے کر واپس بھیجا جائے۔ مقصدیہ تھا کہ وہ اندر ورنی بغاوت بھڑکائیں، حکومت گردیں اور ایک مغرب نواز حکومت قائم ہو جائے۔ ان جلاوطنوں میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو کبھی بادشاہ یا نیشنلیٹ پارٹی کے حامی تھے۔ ان کی تربیت مالٹا اور جرمنی میں ہوئی۔ انہیں جاسوسی، اسلحے کے استعمال، کوڈ سسٹم اور تحریک کاری سکھائی گئی۔

پہلا مشن اکتوبر 1949 میں لانچ ہوا۔ سمندر کے راستے نو افراد پر مشتمل ٹیم الینیہ کے ساحل پر پہنچی۔ لیکن جیسے ہی وہ اتارے گئے، سرکاری فوج ان کے انتظار میں تھی۔ فوراً گھیر لیا گیا۔ چند گھنٹوں میں سب یا تو مارے گئے یا گرفتار ہو گئے۔ سی آئی اے اور ایم آئی سکس کو لگا شایدیہ بد قسمتی تھی۔ انہوں نے دوسرا، تیسرا اور پھر چوتھا مشن بھیجا۔ مگر نتیجہ ہمیشہ ایک جیسا نکلا۔ ہر ٹیم کپڑی گئی، ہر کمانڈو مارا گیا۔ الینیں حکومت نہ صرف تیار تھی بلکہ انہیں معلوم تھا کہ دشمن کب، کہاں اور کیسے آ رہا ہے۔ یہ سب ایک شخص کی وجہ سے ہوا۔ اس کا نام تھا ہیرلڈ "کم" فلپی، جو برطانوی خفیہ ادارے ایم آئی سکس کا افسر اور دراصل سوویت یونین کا جاسوس تھا۔ وہ واشنگٹن میں امریکی سی آئی اے کے ساتھ رابطہ پر مامور تھا۔ یعنی سارا منصوبہ، تربیتی شیڈول، اترنے کے مقامات، اور خفیہ کوڈ، سب کچھ فلپی کے علم میں تھا، اور وہ سب کچھ ماسکو کو دے رہا تھا۔ ماسکو نے یہ معلومات الینیں حکومت کے خفیہ ادارے "سیگوریمی" کو دے دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر مشن کے شروع ہونے سے پہلے ہی دشمن کو مکمل علم ہوتا تھا۔

ان ناکام کوششوں نے نہ صرف مغرب کی خفیہ حکمت عملی کو تباہ کیا بلکہ انور ہوڑا کی حکومت کو اور بھی مضبوط بنادیا۔ انور ہوڑا نے ان حملوں کے بعد الینیہ کے اندر موجود جاسوسوں اور غداروں کے خلاف مہم شروع کی اور زیادہ تر کو ختم کر دیا۔

دوسری طرف مغرب میں یہ آپریشن خفت کی علامت بن گیا۔ سی آئی اے کے لیے یہ اس کی تاریخ کی سب سے بڑی ناکامی تھی۔ ایک طرف ان کے ایجنت مر رہے تھے، دوسری طرف سوویت جاسوس ان کے اندر بیٹھے منصوبے بیچ رہے تھے۔ برطانوی خفیہ ادارے کے لیے بھی یہ ایک ندامت بھرا الحد تھا۔ ایم آئی سکس اور سی آئی اے کے درمیان اعتماد ٹوٹ گیا۔ آنے والے برسوں میں امریکہ نے یہ سبق سیکھا کہ اپنے ملک کے غدار آپ کے ساتھ بھی یو فائی کر سکتے ہیں۔ صرف غداروں پر بھروسہ کر کے کسی ملک کا اقتدار نہیں بدلا جا سکتا۔

مغرب کے یہ آپریشنز الینیہ کے عوام کیلئے ہولناک اثرات چھوڑ گئے۔ ہوڑا نے خوف کو نظام میں بدل دیا۔ اس کی ظالماںہ پالیسیز کی وجہ سے سوویت یونین نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس نے کچھ عرصہ تک چین کا ساتھ لیا، پھر چین بھی اس کے ساتھ نہ چل سکا اور آخر میں وہ دنیا سے مکمل طور پر کٹ گیا۔ ملک بھر میں چھوٹے چھوٹے کنکریٹ بنکروں کی دیواریں بنوائیں تاکہ کوئی

دشمن حملہ نہ کر سکے۔ اسی خوف میں البانیہ نے چالیس سال گزار دیے۔ جب نوے کی دہائی میں کیونزم گرا تو البانیہ یورپ کا سب سے غریب اور پسمندہ ملک تھا۔

آج البانیہ نیٹو کا رکن ہے، یورپی یونین کی مبر شپ کا امیدوار ہے، مگر اس کے مااضی کے زخم ابھی تک سماج میں محسوس ہوتے ہیں۔ لوگوں کا ریاست پر اعتماد نہیں، خفیہ اداروں کے خلاف نفسیاتی نفرت ہے، اور وہ خوف جس نے ایک نسل کو خاموش رکھا تھا، اب بھی لکنگو کے انداز میں جھلکتا ہے۔

-----فائل EU-04 کا اختتام-----

ملک: جرمنی

سال: 1949

فال: EU-05

سنہ 1949 میں جب کانزادر ایڈینا اور نے مغربی جرمنی کا چانسلر بننا قبول کیا تو ملک ایک کھنڈر تھا۔ تقریباً آدھے گھروں کی چھتیں گری ہوئی تھیں، سٹیل فیکٹریاں اتحادیوں کے قبضے میں تھیں، اور نیا آئین ابھی کسی الیکشن سے گزر کر آزمایا بھی نہیں گیا تھا۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ اسی تباہ حال جرمنی کو امریکہ نے سرد جنگ کے سب سے اہم مورچے کے طور پر چنا۔ واشنگٹن کا مانا تھا کہ اگر جرمنی غیر جانبدار ہو گیا یا کیونزم کی طرف جھک گیا تو پوری مغربی دنیا کا دفاع بکھر جائے گا۔

یہی خوف امریکہ کو فوراً حرکت میں لے آیا۔ سی آئی اے کے ہلکار فرینکفرٹ میں اس وقت پہنچ چکے تھے جب ابھی وفاقی حکومت کے پاس مستقل دفاتر بھی نہیں تھے۔ مقصد یہ تھا کہ ہر سیاسی، مزدور، صحفی اور خفیہ ادارہ مغرب کی سمت جھکاؤ رکھے۔ اس کے لیے انہوں نے ایک خفیہ نیٹ ورک تیار کیا جسے بعد میں ”سٹے بی ہائند“ کہا گیا۔ یہ نیٹ ورک ہتھیاروں کے خفیہ ذخائر، جعلی دستاویزات، اور ایسے افراد پر مشتمل تھا جو خاموشی سے کام کرتے رہیں اور صرف اس وقت حرکت میں آئیں جب روپی فوجیں یورپ پر چڑھ دوڑیں۔ مگر حقیقت میں ان کے ذریعے امریکہ نے جرمنی کی اندرونی سیاست کو اپنے مفاد کے مطابق ڈھالنا شروع کر دیا۔

یہ منصوبہ برلن سے شروع ہوا جہاں سی آئی اے کے افسر بل ہاروی نے 1950 میں ”کیپ گروپ آئینشٹ ان ہوینٹنٹی“ نامی تنظیم کو مالی مدد دینی شروع کی۔ بظاہر یہ گروپ مشرقی جرمنی کے خلاف پروپیگنڈا کر رہا تھا، مگر اصل فائدہ یہ ہوا کہ ہزاروں جرمن کارکنوں کو سی آئی اے کے لیے تربیت یافتہ دی گئی اور انہیں ہی بعد میں مغربی جرمنی کی سیاست میں داخل کر دیا گیا۔ اسی دوران امریکی فوج کے خفیہ محلے نے رائے لینڈ میں گوداموں کا ایک جال بچھا دیا جہاں پندرہ ہزار رانفلیں، دو ہزار سب میشین گز،

اور سینکڑوں ریڈیو سیٹ رکھے گئے۔ بظاہر مقصد رو سیوں کے خلاف مزاحمت تھا، مگر ان ہتھیاروں کا اصل مقصد مغربیب جرمنی پر کنٹرول حاصل کرنا تھا۔

اب جو میں لکھنے جا رہا ہوں اس پر آپ نے خصوصی توجہ دیتی ہے۔ اصل فیصلہ کن موڑتب آیا جب سابق "تازی جنرل رائے ہارڈ گیبلن" کو سی آئی اے نے اپنا مرکزی اتحادی بنایا۔ گیبلن، جو ہٹلر کے زمانے میں مشرقی محااذ پر ایٹلیجننس کا سربراہ تھا، جنگ کے بعد اپنے سارے فائلز اور ایجننس کے نیٹ ورک سمیت امریکہ کے پاس گیا اور بدلتے میں نئے ادارے کے قیام کی پیشکش کی۔ امریکے نے یہ پیشکش فوراً قبول کی اور اس نئے ادارے کو "بی این ڈی" یعنی وفاقی ایٹلیجننس سروس کے نام سے قائم کیا۔ سنہ 1949 سے 1956 کے درمیان امریکہ نے تقریباً سات ملین ڈالر اس ادارے پر خرچ کیے۔ سی آئی اے کے افسران اس کے اجلاسوں میں بیٹھتے، تنخواہیں منظور کرتے، اور ان خفیہ مشینوں کا کنٹرول بھی رکھتے جن سے ادارہ کو ڈشہد پیغامات بھیجتا تھا۔ معاهدہ یہ تھا کہ کوئی بھی افسر بائیں بازو یا سو شلسٹ نظریات والا نہیں ہوگا، اور ہر منصوبہ امریکہ کے ساتھ مل کر طے کیا جائے گا۔ جب 1952 میں جرمن وزارت داخلہ نے اس ادارے پر پارلیمانی نگرانی کی تجویز دی تو سی آئی اے کے سربراہ نے براہ راست ایڈینا اور کوڈ ہمکی دی کہ اگر امریکہ کی نگرانی کمزور ہوئی تو دفاعی امداد روک دی جائے گی۔

سنہ 1953 کے انتخابات سی آئی اے کے لیے اہم امتحان بنے۔ سو شلسٹ پارٹی یعنی ایس پی ڈی نے غیر جانبداری اور روس سے بات چیت کا نعرہ لگایا تھا۔ سی آئی اے نے ایڈینا اور کی کر سچن ڈیمو کریٹک پارٹی کو تقریباً تین ملین ڈالر فراہم کیے جن سے پورے ملک میں اشتہارات، پوسٹرز، اور مہمات چلانی لگیں۔ نعرہ تھا کہ "ایس پی ڈی کو ووٹ دینا مطلب ماسکو کو ووٹ دینا۔" نتیجہ یہ ہوا کہ ایڈینا اور کی پارٹی اکثریت لے گئی اور امریکہ نے جرمن الیکشن میں مداخلت کو اپنی بڑی کامیابی قرار دیا۔

اسی دوران مزدور یونینوں کو بھی نشانے پر لیا گیا۔ سنہ 1953 میں مشرقی برلن کے مزدوروں نے بغاوت کی تو مغرب کو خطرہ ہوا کہ مزدور تحریک پورے جرمنی میں پھیل سکتی ہے۔ چنانچہ سی آئی اے نے جرمن یونینوں کے رہنماؤں کو امریکی دوروں پر بھیجا، ان کے لیے کتابچے چھپوائے، اور خفیہ طور پر ایسے گروپس بنائے جو ہڑتال کی صورت میں کمیونسٹ رہنماؤں کے خلاف کارروائی کریں۔ بعد میں انہی یونینوں میں خفیہ ہتھیاروں کے ذخائر دریافت ہوئے جنہیں امریکی بھرپور ایٹلیجننس کی نگرانی میں رکھا گیا تھا۔

سنہ 1954 میں جب جرمنی کو مکمل خود مختاری ملی تو یہ خفیہ نیٹ و رک نیٹ کے نظام میں باضابطہ شامل ہو گیا۔ کوڈ نیم بدل کر ”رائیکی“ رکھا گیا، مزید ہزاروں ہتھیار ذخیرہ کیے گئے، اور جعلی مشرقی جرمن کرنی چھاپی کئی تاکہ دشمن کے اندر تحریک پھیلانی جاسکے۔ پارلیمنٹ کو کچھ خبر نہیں تھی۔ جب ایک رکن نے پوچھا کہ کیا حکومت کے پاس خفیہ فوجیں ہیں، تو ایڈینا اور نے کہا کہ حکومت کو کسی ایسی تنظیم کا علم نہیں۔ یہ بیان لفظی طور پر درست تھا کیونکہ وہ ادارہ دفاعی بجٹ میں شامل ہی نہیں تھا۔ اور نہ ہی حکومت کو اعتماد میں لا کر کام کرتا تھا۔ وہ مغربی جرمنی کی ڈیپ سٹیٹ تھی۔ اس سے اپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مغربی سامراج میں ڈیپ سٹیٹ کیسے کام کرتی ہو گی۔

مغربی جرمنی مکمل طور پر امریکی کنٹرول میں تھا۔ اس پرے نظام کے اثرات بہت گہرے تھے۔ یروپی طور پر مغربی جرمنی ہر بھرائیں امریکے کے ساتھ کھڑا نظر آتا تھا، چاہے وہ کوئی ایک جنگ ہو یا کیوبا کا بھرائی۔ اندرونی طور پر بی این ڈی مکمل طور پر امریکے کے تبع رہا، اور بعد کے عشروں میں یہی افران سیاست پر اثر انداز ہوتے رہے۔ 1960 کی دہائی میں جب طلبہ تحریک نے سی آئی اے کی مالی مدد کے بثوت پیش کیے تو میڈیا نے اسے ”آزادی کے دفاع“ کے طور پر جواز فراہم کر دیا۔ میڈیا بھی مکمل طور پر امریکی کنٹرول میں تھا۔

یہ خفیہ ڈھانچہ 1990 کے بعد ہی ٹوٹنا شروع ہوا جب صحافیوں نے پہاڑوں میں پرانے اسلحے کے ذخائر ڈھونڈنے کا لے۔ تحقیقات میں پتہ چلا کہ تقریباً سولہ سو جرمن شہری خفیہ طور پر نیٹ سے تخلوہ کے رہے تھے۔ زیادہ تر پرانے ریکارڈ ٹب تک تلف کر دئے گئے تھے۔ لیکن ڈنیست وہی رہی۔ 2013 میں جب ایڈورڈ اسنودن نے انکشاف کیا کہ بی این ڈی امریکی این ایس اے کو ڈیٹا دیتا ہے تو جرمن حکومت نے محض طریقہ کار پر بحث کی، اصول پر نہیں۔ جرمنی میں امریکی کنٹرول اسقدر ہے کہ حکومت کے ہر اہم عہدے پر وہ اپنے وفادار تعینات کر چکے ہیں۔ بالکل یہی حال جاپان، ساؤ تھک کوریا اور تائیوان کا ہے۔

آج جب یورپ دفاعی خود مختاری کی بات کرتا ہے تو جرمن سفارت کار اب بھی پچاس کی دہائی کی یاد دلاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر یورپ نے اپنا انٹلیجنس سسٹم بنایا تو اس میں امریکہ کے اثر سے بچاؤ کی ضمانت ہونی چاہیے۔ ایڈینا اور کے زمانے میں جو خفیہ جال بچھانے گئے تھے، وہ اب بھی جرمنی کو جکڑے ہوئے ہیں۔ یہ ہے مغربی جمہوریت کا خلاصہ۔



ملک: مشرقی جرمنی

سال: 1953

فال: EU-06

ستہ جون 1953 کی صبح مشرقی برلن میں ہزاروں مزدور فیکٹریوں سے نکل کر سڑکوں پر آگئے، بینز اٹھائے ہوئے تھے جن پر لکھا تھا "ہمیں آزاد انتخابات چاہیے" اور "حکومت نامنظور"۔ روپی ٹینک ابھی حرکت میں نہیں آئے تھے، لیکن فضا میں خوف اور بغاوت دونوں ساتھ ساتھ تیر رہے تھے۔ سو شلسٹ حکومت کے لئے ایک نہایت خطرناک وقت تھا۔

پس منظر سمجھنے تو کہانی اور گہری ہے۔ جنگ کے بعد مشرقی جرمنی میں والٹر البرخت کی حکومت نے سو شلسٹ ریفارمز کی رفتار بڑھانے کا اعلان کیا۔ اس فیصلے نے کسانوں اور مزدوروں کی کمر توڑ دی۔ چالیس فیصد کسان اپنی زمینیں چھوڑ کر مغرب کی طرف بھاگ گئے، فیکٹریوں میں کام کے معیار بڑھا دیے گئے لیکن اجرتیں کم کر دی گئیں۔ مزدور محنت سے تنگ آچکے تھے۔ مارچ 1953 میں سٹالن کی موت کے بعد امید جاگی کہ شاید حالات نرم ہوں، مگر جب حکومت نے 11 جون کو نیا لائچہ عمل پیش کیا تو مزدوروں کو کوئی ریلیف نہ ملا۔ کسانوں اور دکانداروں کے لیے تو پابندیاں نرم ہوئیں لیکن مزدوروں کے لیے وہی سخت کوئے برقرار رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند دنوں میں برلن کی فضا پھٹ پڑی۔

اصل واقعہ 16 جون کو شروع ہوا جب سٹالن ایلے کے تعمیراتی مزدوروں نے کام چھوڑا اور وزارتِ محنت کے دفتر جا کر مطالہ کیا کہ ان کے کوئے واپس لیے جائیں۔ درخواست رد ہوئی تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب بات سڑک پر ہو گی۔ وہ واپس اپنی ساتھ پر گئے، دوسروں کو بلایا، اور کچھ ہی گھنٹوں میں بیس ہزار مزدور شہر کے وسط میں جمع ہو گئے۔ نمرے گونج رہے تھے، "حکومت ہٹاؤ" اور "ہمیں آزادی چاہیئے"۔

اس شورش کے پچھے شہر کے دوسری طرف امریکی ریڈیو اسٹیشن "ریاس" کی پروپیگنڈہ مہم کام کر رہی تھی۔ امریکی سٹیشن اس آگ پر تیل چھڑک رہا تھا۔ صبح نوبجے سے وہ خبریں نشر کر رہا تھا کہ مزدور احتجاج پر نکل آئے ہیں۔ دوپہر تک انہوں نے نہ صرف

مظاہرین سے فون پر بات چیت نشر کی بلکہ عوام کو یہ پیغام دیا کہ "مغربی دنیا آپ کے ساتھ ہے"۔ ان الفاظ نے شعلے میں تیل کا کام کیا۔ پورے ملک میں آگ پھیل گئی۔ اگلی صبح تک اڑھائی سو شہروں میں چار لاکھ مزدور ہڑتال پر تھے۔ کہیں جیلوں پر حملہ ہوئے، کہیں پولیس نے ہتھیار ڈال دیے۔ مشرقی جرمنی کی حکومت بوکھلا گئی اور ماسکو نے فوراً حکم دیا کہ فوج عربکت میں لائی جائے۔

ستہ جون کی شام تک روسی فوج کے بیس ہزار سپاہی اور تین سو ٹینک برلن کی سڑکوں پر تھے۔ فائزگ ہوئی، سینکڑوں زخمی ہوئے، کم از کم ایک سو چیس افرا دمارے گئے۔ ہزاروں کو گرفتار کیا گیا۔ امریکی ریڈ یو سٹیشن ریاس نے سب کچھ نشر کیا، یہاں تک کہ مشین گنوں کی آوازیں بھی نشر کیں۔ لیکن جب لوگ ریڈ یو پر پوچھنے لگے کہ امریکی فوج کب آئے گی تو جواب یہی تھا کہ "آزادی تمہیں خود لینی ہو گی"۔ اس وقت مشرقی جرمنی کے مزدوروں کو احساس ہوا کہ انہیں اسکا کرم وایا گیا ہے۔ انہوں نے دیواروں پر لکھ دیا "ریاس جھوٹ بولتا ہے" اور "آئیزن ہاور کہاں ہے"۔ انہیں مغرب نے صرف زبانی ہمدردی دکھائی، عملی مدد نہیں۔ واشنگٹن فوج نہیں بھیج سکتا تھا۔ فوج بھیختے تو تیسری عالمی جنگ شروع ہو سکتی تھی۔ امریکہ کا مقصد صرف تحریک کاری تک محدود تھا۔ امریکہ نے صرف ایک امدادی پروگرام شروع کیا جس کے تحت خوراک کے پیکٹ گرانے گئے، لیکن تب تک سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔

اس بغاوت کے اثرات بہت گہرے تھے۔ مشرقی جرمنی کی حکومت نے فوراً مزدوروں کے مطالبات مان لیے، اجرتیں بڑھائیں، سب سڈی دی اور اجتماعی زراعت کے منصوبے و قتلی طور پر روک دیے۔ البرخت کی حکومت بچ گئی۔ ماسکو کو احساس ہو گیا کہ امریکی پروپیگنڈہ کا جواب سخت نگرانی سے ہی دیا جا سکتا ہے ورنہ حکومت نہیں چلے گی۔ چند سالوں میں سٹازی کا نیٹ ورک پھیل گیا، ہر فیکٹری، ہر دفتر، ہر محلے میں کوئی نہ کوئی خفیہ مخبر بیٹھا ہوتا تھا۔ حکومت کا کنٹرول بہت مضبوط ہو گیا۔

دوسری طرف مغربی جرمنی نے پروپیگنڈہ کی خاطر اس دن کو قومی علامت بنادیا۔ 17 جون کتنی دہائیوں تک "یومِ اتحاد جرمنی" کے طور پر منایا گیا۔ مغرب کے لیے یہ کمیونزم کو بدنام کرنے کا سنبھری موقع تھا۔ وہ جو خود مغربی جرمنی کی حکومت کو مکمل طور پر کنٹرول کر کے بیٹھے ہوئے تھے، کتنی دہائیوں تک یہ پروپیگنڈہ کرتے رہے کہ مشرقی جرمنی کی حکومت اپنی نہیں بلکہ روسی بندوقوں کے ساتے میں ہے۔ اسی واقعے کو جواز بنا کر نیٹو کو از سرنو مسلح کیا گیا اور جرمن فوج کے قیام کو عوامی حمایت ملی۔

-----EU-06 کا اختتام-----

ملک: ہنگری

سال: 1956

فال: EU-07

چار نومبر 1956 کی صبح جب ہنگری کے دارالحکومت ڈاپسٹ میں ٹینک داخل ہوئے تو اس وقت ہنگری میں نوجوان سڑکوں پر یہ یقین لیے لڑ رہے تھے کہ مغرب ان کی مدد کو ضرور آئے گا۔ ان کی امید کی وجہ ریڈیو فری یورپ کا وہ پروپیگنڈہ تھا جو کتنی سالوں سے ہنگری کے لوگوں کو مسلسل اکساراً تھا کہ وہ اپنی حکومت کے خلاف بغاوت کریں۔ ریڈیو پر گونجنے والی وہی آوازان کے لیے سب سے بڑی غلط فہمی بن گئی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ کا نقشہ بدل چکا تھا۔ مشرقی یورپ پر کیونسٹ انقلاب کی آندھی مکمل طور پر چھا چکی تھی۔ امریکہ نے اس کے مقابلے میں ایک بیان ہتھیار نکالا، ریڈیو پروپیگنڈہ، جو کسی بھی امریکی بندوق یا بم سے زیادہ خطرناک ثابت ہوا۔ سنہ 1950 میں ریڈیو فری یورپ کے نام سے ایک خفیہ منصوبہ شروع کیا گیا جسے سی آئی اے فنڈ کرتی تھی۔ مقصد یہ تھا کیونسٹ ملکوں کے لوگوں کے دلوں میں کیونزم کے خلاف نفرت پیدا کی جائے اور انہیں کیونسٹ نظام سے ناامید کیا جائے۔ مغربی دنیا انہیں وہ باتیں سننے لگیں سن کر انہیں مغربی دنیا حسین لگے اور انکی اپنی زندگی مشکل اور تکلیف دہ لگنے لگے۔

یہ ریڈیو پروپیگنڈہ عام نشریات سے مختلف تھا۔ وائس آف امریکہ ایک غیر جانبداری کا تاثر قائم رکھنے کی کوشش کرتا تھا جبکہ ریڈیو فری یورپ ایک روایتی پروپیگنڈہ مشین تھی۔ اس کا مقصد کیونزم کے اثر کو مکمل طور پر ختم کرنا تھا کہ صرف روکنا۔ برسوں تک یہ ریڈیو مشرقی یورپ کے شہروں، دیہاتوں اور کارخانوں میں کام کرنے والوں کو برین واش کرتا تھا کہ مغرب فتح کے قریب ہے اور سب کچھ بدلنے والا ہے۔

اور پھر 1956 آیا۔ سوویت بلاک کے اندر ہلچل مچی ہوئی تھی۔ سلطان کی موت کے بعد مغرب نے پروپیگنڈہ میں تیزی پیدا کر دی تھی۔ پولینڈ میں مزدوروں کے احتجاج نے حکومت بدل دی تھی اور ہنگری میں بھی کچھ لوگ پروپیگنڈہ کے زیر اثر بے چین تھے۔

23 اکتوبر کو بڈاپسٹ میں طلبہ کا مظاہرہ شروع ہوا اور چند گھنٹوں میں ایک ملک گیر بغاوت بن گیا۔ لوگوں نے نظام بدلنے کا مطالبہ کیا، سوویت فوجوں کی واپسی اور اپنے پرانے لیڈر امری ناگی کی بحالی کا مطالبہ بھی کیا۔ حیرت انگیز طور پر روسی فوجیں بھی ہٹ گئیں۔ چند دنوں کے لیے ایسا لگا جیسے سب کچھ بدلنے جا رہا ہے۔

انہی دنوں میں ریڈیو فری یورپ کے مائیکروfon سے ایسی باتیں نکلنے لگیں جو ہنگری کے عوام کے لیے زہر بن گئیں۔ ان نشریات میں کہا گیا کہ یہ آزادی کی آخری لڑائی ہے، یہ وقت مقابلہ کرنے کا ہے۔ سی آئی اے نے جلاوطن ہنگریں براؤکا سڑز بھرتی کئے ہوئے تھے، وہ پورے جوش میں مغربی دنیا کی طرف سے مدد کی باتیں کرتے تھے۔ انہوں نے پروپیگنڈہ میں اقوام متحده کی بحثوں اور مغربی ملکوں کے بیانات کے حوالے دئے مگر یہ نہیں بتایا کہ امریکہ فوجی مداخلت نہیں کر سکتا۔ اس وقت صدر آئزن ہاور کو دو محاذوں کا سامنا تھا۔ ایک طرف سوویت یونین، دوسری طرف مشرق و سلطی میں سوتز بحران۔ امریکہ کا مقصد صرف ہمدردی دکھا کر ہنگری کے عوام کو اکسانا تھا۔

لیکن بڈاپسٹ کی گلیوں میں نوجوان لڑکے جب ریڈیو فری یورپ کا پروپیگنڈہ سنتے تھے تو انہیں لگتا تھا مغرب کے ٹینک کسی بھی وقت پہنچ جائیں گے۔ یہی غلط فہمی ان کی ہلاکت کا باعث بنتی۔ چار نومبر کی صحیح فوج نے آپریشن شروع کیا۔ شورش کو آسانی سے کچل دیا گیا۔ جو لوگ ریڈیو پروپیگنڈہ سن کر صرف اس امید پر خالی ہاتھوں حکومت گرانے نکل پڑے تھے کہ مدد آرہی ہے چند دنوں میں مسل دئے گئے۔ کوئی مدد کیلئے نہیں آیا۔ امری ناگی کو گرفتار کر کے چھانسی دے دی گئی، اور دو لاکھ ہنگریں ملک چھوڑ کر بھاگ گئے۔

امریکہ کے پروپیگنڈہ نے اپنے مقاصد حاصل کرنے۔ سوویت یونین کو ایک سخت گیر طاقت کے طور پر دکھایا گیا۔ مغرب کے کتنی دانشور جو ماسکو کی ترقی پسندی کی تعریف کرتے تھے انہیں خاموش کر دیا گیا۔ ریڈیو فری یورپ کی ایک اندرولی تحقیق، جسے "پامر پورٹ" کہا جاتا، اس نتیجہ پر پہنچی کہ ریڈیو نے اگرچہ بغاوت کو بھڑکایا نہیں مگر اپنی غیر ذمہ دارانہ نشریات سے عوام میں غلط امید ضروری سیدا کی۔ دعویٰ کیا گیا کہ ریڈیو اپنی پالیسی بدل رہا ہے۔ اب سے صرف حقائق نشر ہوں گے، جذباتی نعرے نہیں۔ حکومت کی پالیسی کو عوامی وعدے کے طور پر پیش کرنے پر سخت پابندی لگا دی گئی۔ ریڈیو فری یورپ نے بدنامی کا داعغ مٹانے کیلئے اپنی شناخت تبدیل کی اور آگے چل کر سرد جنگ کے دوران اپنے آپ کو ایک معتبر صحفی ادارہ قرار دیا۔ آج جب ہم دیکھتے ہیں

کہ دنیا کا ستر فیصد مغربی میڈیا صرف ایک شخص، روپرٹ مردوخ کے زیر اثر تھا۔ نیتن یا ہو ٹیلیویژن پر بیٹھ کر ٹک ٹاک کو کنٹرول کرنے پر خوشی کا اظہار کر رہا ہے، ایلوں مسک سے ایکس پر کنٹرول لینے کی بات کر رہا ہے تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس دور میں کیا کچھ ہو رہا ہو گا۔ ہمارے بزرگ بی بی سی کو بہت معتبر آواز سمجھتے تھے۔

لیکن ہنگری کے لوگوں کو مغربی پروپیگنڈہ کی بہت بھاری قیمت چکانا پڑی۔ اس واقعے نے انہیں یہ سکھا دیا کہ مغرب کے وعدے بھی جھوٹے ہیں اور دعوے بھی۔ جب سوویت یونین کے بکھر نے کامیابی کا عمل شروع ہوا تو بالآخر 1989 میں ہنگری نے پر امن طریقے سے الگ ہو کر ایک نیا راستہ اختیار کیا۔

-----فائل 07-EU کا اختتام-----

ملک: فرانس

سال: 1958

فال: EU-08

چودہ مئی 1958 کو الجزائر کے شہر الحیرز میں فرانسیسی فوجیوں اور آبادکاروں نے حکومتی عمارتوں پر قبضہ کر لیا۔ ان کا نعرہ تھا صرف ایک شخص ملک کو بچا سکتا ہے، چار لزوںے گال۔ یہ وہ لمحہ تھا جب فرانس خاز جنگی کے دہانے پر کھڑا تھا اور واشنگٹن کے ایوانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ امریکہ کو یقین تھا کہ اگر دے گال واپس آیا تو وہ نیٹو کے ڈھانچے کو ہلا کر کر کھو دے گا۔ لیکن تاریخ نے اس دن فیصلہ کر لیا تھا کہ فرانس اب کسی کی مرضی سے نہیں چلے گا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ دو حصوں میں بٹ چکا تھا۔ ایک طرف سوویت یونین کا پھیلتا اثر، دوسری طرف امریکہ کی قیادت میں نیٹو۔ فرانس، جو ابھی جرمن قبضے اور اندرونی تقسیم سے نکلا تھا، سنہ 1946 میں چوتھی جمہوریہ کے نام سے نیا نظام لایا۔ مگر یہ نظام مسلسل عدم استحکام کا شکار رہا۔ حکومتیں بننی گرتی رہیں، ایک کے بعد ایک وزیر اعظم بدلتا ہا۔ پھر 1954 میں الجزائر کی آزادی کی جنگ شروع ہوئی تو ملک مزید بکھر نے لگا۔ فوج، سیاستدان اور عوام سب الگ الگ سمت میں کھڑے تھے۔ ایسے میں امریکہ کو خدشہ ہوا کہ اگر فرانس گر گیا تو نیٹو کی دیوار میں شگاف پڑ جائے گا۔

صدر آئزن ہاور کے دور میں امریکی پالیسی کا مرکزی ہی تھا کہ یورپ میں ایک مسٹریکٹ، امریکہ نواز فرانس قائم رہے۔ لیکن ایک نام تھا جو واشنگٹن کو مسلسل بے چین رکھتا تھا، جنرل چارلز دے گال۔ یہ وہی شخص تھا جس نے جنگ کے دوران نازیوں کے خلاف فری فرانس کی قیادت کی تھی، مگر اب وہ ایک خود مختار یورپ کا خواب دیکھ رہا تھا، جونہ امریکہ کے تابع ہونے روں کے۔ اس نے کھلے عام کہا تھا کہ یورپ کو اپنی تیسرا راہ تلاش کرنی چاہیے۔ امریکیوں کے لیے یہ ناقابل برداشت خیال تھا۔ اس لیے سی آئی اے نے فرانس کی سیاست میں خفیہ مداخلت شروع کی۔

سنہ 1958 کے موسم بھار میں سی آئی اے اور امریکی محلہ خارجہ نے "آپریشن ٹمبر لیک" کے نام سے ایک خفیہ منصوبہ بنایا۔ مقصد تھا دے گال کو اقتدار میں آنے سے روکنا۔ اس منصوبے کے تحت امریکی خفیہ اداروں نے مخالف سیاسی جماعتوں کو خفیہ فڈنگ دی، خاص طور پر سو شلسٹ اور کرسچن ڈیمو کریٹس کو۔ اخبارات میں مضامین شائع کروائے گئے جن میں دے گال کو ایک ملکہ ڈکٹیٹر کے طور پر پیش کیا گیا۔ امریکی سفارت کار فرانس کے فوجی رہنماؤں اور صدر رینی کوٹی سے خفیہ ملاقاتیں کر کے سمجھانے لگے کہ اگر دے گال واپس آیا تو فرانس عالمی سطح پر تہبا ہو جائے گا۔

مگر حالات واشنگٹن کی مرضی کے مطابق نہ چلے۔ الجزائر میں بغاوت بڑھتی گئی اور سیرس میں حکومت ٹوٹ گئی۔ عوام نے دے گال کو واحد نجات دہنہ کے طور پر دیکھنا شروع کر دیا۔ یکم جون 1958 کو قومی اسمبلی نے اسے وزیر اعظم منتخب کر لیا اور ہنگامی اختیارات دے دیے کہ وہ نیا آئین تیار کرے۔ چند ماہ بعد جب پانچویں جمہوریہ کا قیام ہوا تو فرانس کی سیاست ایک نئی شکل اختیار کر چکی تھی۔ سی آئی اے کی ساری کوششیں ناکام ہو گئیں۔

دے گال کے اقتدار میں آتے ہی وہی ہوا جس سے امریکہ ڈرتا تھا۔ 1959 میں اس نے فرانس کے بھری بیڑے کو نیٹو کی فوجی کمانڈ سے نکال لیا اور 1966 میں پورے ملک کو نیٹو کے عسکری ڈھانچے سے باہر کر دیا۔ نیٹو کا ہیڈ کوارٹر سیرس سے بر سر متنقل کرنا پڑا۔ واشنگٹن کے لیے یہ ایک تلحیخ شکست تھی۔ دے گال نے اپنی آزاد خارجہ پالیسی شروع کی۔ اس نے امریکی ڈالر کے ذخائز کو سونے میں تبدیل کیا، بریٹن ووڈر نظام پر دباؤ بڑھایا، سوویت یونین اور چین کے ساتھ اقتصادی تعلقات بنائے، اور امریکی اثر سے آزاد یورپ کی بات کی۔ فرانسیسی معاشرے میں اس پالیسی نے ایک نئی قومی اعتماد پیدا کیا۔ فرانس کو کہ جرمی کی طرح مکمل طور پر امریکی اسپاٹر کے زیر اثر آچکا تھا، آزاد ہونے میں کامیاب ہوا۔

چارلس دے گال نے امریکی عزائم کو مغربی دنیا کے سامنے بے تقاب بھی کیا، فرانس میں زیادہ کنشروں لینے کی سازشیں فریض عوام کے سامنے آگئیں۔ یونیورسٹیوں، میڈیا اور سیاست میں امریکہ مخالف جذبات عام ہو گئے، جو آگے چل کر 1968 کی طلبہ تحریکوں میں بھی حصے۔

امریکہ کے لیے یہ پورا واقعہ ایک سبق بن گیا۔ فرانس جیسے اتحادی ملک میں خفیہ مداخلت نہ صرف ناکام ہوئی بلکہ اللائقان دہ ثابت ہوئی۔ آئن ہاور کے بعد آنے والی حکومتوں نے یورپ میں پالیسی بدلتی۔ اب دباؤ کے بجائے سفارت کاری کو ترجیح دی

گئی۔ نکسن کے دور میں امریکہ نے بظاہر تسلیم کر لیا کہ اتحادیوں کو اپنی خود مختار پالیسی رکھنے دینا ہی طوبیل المیعاد استحکام کے لیے بہتر ہے۔ لیکن 2014 میں ایڈورڈ سنوڈن نے امریکہ کے مغربی ممالک میں یک وسیع خفیہ پروگرام کا انکشاف کیا تو دنیا کو بتہ چلا کہ امریکہ نے اپنی پالیسی خفیہ طریقے سے جاری رکھی تھی۔

تاریخ اپنے کو بار بار دہراتی، وہ شکل بدل کر واپس آتی ہے۔ صدر ایمانوئل میکرون جب "یورپی خود مختاری" کی بات کرتے ہیں یا امریکہ کے اقدامات جیسے آکس اتحاد پر تقيید کرتے ہیں تو دے گال کی یاد آتی ہے۔ آج فرانس خاص طور پر یہ بات کر رہا ہے کہ یورپ کو اپنی راہ خود طے کرنی چاہیے۔ لیکن یورپ کے دوسرے ممالک پر امریکہ کا بہت زیادہ اثر ہے۔

آج جب دنیا کو ایک نئی سرد جنگ کا سامنا ہے تو بہتری کی امید صرف اس صورت میں نظر آتی ہے کہ اگر فرانس سے کوئی دے گال اٹھے اور موجودہ نظام پر سوال اٹھائے، اسے بدلنے کی ہمت کرے یا پھر یورپ کو اس جنگ سے الگ کرے۔

قومی خود مختاری ایک ایسی طاقت ہے جسے دبایا نہیں جا سکتا۔ 1958 کا فرانس ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ آزادی کی قیمت ہمیشہ خطرہ مول لینے میں چھپی ہوتی ہے، اور کبھی کبھی ایک قوم کی خودی پوری عالمی سیاست کا رخ بدل دیتی ہے۔

-----فائل EU-08 کا اختتام-----

ملک: قبرص

سال: 1964

فائل: EU-09

---

سن 1964 میں امریکی صدر لینڈن بی جانسن نے ترکی کے وزیر اعظم کو ایک خط لکھ کر کھلی دھمکی دی کہ اگر ترکی نے قبرص پر حملہ کیا تو امریکہ اس کا ساتھ نہیں دے گا۔ لیکن بات اتنی سادہ نہیں تھی۔ اس ایک خط کے پچھے برسوں کی خفیہ سیاست، سی آئی اے کی منصوبہ بندی، اور سرد جنگ کے دور کا وہ سرمایہ دارانہ جنون چھپا تھا جس میں انہوں نے اپنی اجارہ داری کو ہر حالت میں برقرار رکھنا تھا۔

قبرص ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے، لیکن امریکہ اور اتحادیوں کیلئے دنیا پر اجارہ داری قائم کرنے رکھنے کیلئے اس کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔ سنہ 1960 میں جب برطانیہ نے اپنی نوآبادیاتی حکمرانی ختم کی تو قبرص آزاد ہوا۔ نیا آئینہ بڑی مشکل سے بنایا گیا، جس میں یونانی اکثریت اور ترک اقلیت کے درمیان اقتدار کی تقسیم کا نظام موجود تھا۔ لیکن اصل مقصد کچھ اور تھا۔ برطانیہ، ترکی، اور یونان کے درمیان طے پانے والے زیورخ اور لندن معابدے کا مقصد یہ تھا کہ قبرص نے یونان میں ضم ہو (جسے Enosis کہا جاتا تھا) اور نہ ہی تقسیم ہو کر ترک اور یونانی حصوں میں بٹ جائے (جسے Taksim کہا جاتا تھا)۔

اس نئے ملک کے صدر آرج بشپ مکاریوس بنے جو ایک سمجھدار اور خود مختار سوچ رکھنے والے رہنمای تھے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ قبرص کسی طاقت کا حصہ نہیں بننے گا۔ نہ امریکہ کے زیر اثر، نہ سوویت یونین کے۔ یہ بات واشنگٹن کو پسند نہیں آئی۔ سرمایہ داروں کو غیر جانبداری کبھی قبول نہیں رہی۔ انکا فارمولہ ہمیشہ سے یہ ہا ہے کہ، "یا تو آپ ہمارے ساتھ ہیں، یا پھر ہمارے دشمن" خاص طور پر جنگوں کے دوران۔ آج کے حالات میں دیکھ لیجئے کہ امریکہ نے پوری دنیا کو واضح طور پر سائیڈ چنے کا الٹی میٹم دے رکھا ہے۔ سرد جنگ کے دوران بھی سرمایہ دارانہ سامراج کیلئے غیر جانبداری کا مطلب مشکوک وفاداری تھا۔ مکاریوس نے جب ناصر حسیے غیر وابستہ رہنماؤں سے تعلقات بڑھائے تو امریکہ کے لیے وہ "خطراناک بائیں بازو کے لیڈر" بن گئے۔ سی آئی

اے اور بیناگوں نے قبرص پر مکمل کنٹرول قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ انہیں اس رسک کا اچھی طرح سے اندازہ تھا کہ اس کو شش یہی قبضہ دو ٹکڑوں میں بٹ سکتا ہے۔ لیکن اس صورت میں بھی کم از کم ایک حصہ یقینی طور پر ان کے قابو میں رہتا۔ سنہ 1965 تک سی آئی اے نے یہ طے کر لیا کہ مکاریوس کو ہٹانے بغير مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔ ترکی کو تو محلی دھمکی مل چکی تھی، ترکی نے بھی اسی دوران ایک منصوبہ بنایا جسے ”ترک تقسیم منصوبہ“ کہا گیا۔ ترکی کے وزیر اعظم سلیمان دیمیرل نے یہ منصوبہ امریکی سفیر کو دیا، اور جلد ہی واشنگٹن تک بات پہنچ گئی۔ منصوبے کے مطابق قبرص کو آہستہ آہستہ نسلی بینادوں پر تقسیم کیا جانا تھا، تاکہ ترک علاقوں پر مکمل کنٹرول حاصل ہو سکے۔

امریکی محلہ خارجہ نے عوامی سطح پر اتحادی بات کی، مگر سی آئی اے اور بیناگوں نے اس منصوبے میں فائدہ دیکھا۔ یہ سب کھلے عام ہو رہا تھا، ترکی اور ترک قبرصی قیادت کو اعتماد ملا۔ انہیں لگا کہ امریکہ ان کو ڈبل کراس نہیں کرے گا۔

مگر پھر وہی ہوا جو امریکہ ہمیشہ سے کرتا آیا ہے، امریکہ نے تمام اتحادیوں کو دھوکہ دیا۔ سنہ 1965 سے 1967 کے درمیان جزیرے پر فسادات اور نسلی جھٹپیں بڑھنے لگیں۔ ہر پورٹ میں سی آئی اے مکاریوس کو مورد الزام ٹھہراتی رہی۔ سنہ 1967 میں ایک ترک قبرصی علاقے پر تصادم نے یونان اور ترکی کے درمیان جنگ چھیڑ دی۔ امریکی دباو پریہ جنگ تورک گئی، مگر قبرص کی تقسیم کی بنیاد پڑی چکی تھی۔ ترک آبادی اپنے علاقوں میں سمٹ گئی اور یونانی اکثریت نے باقی جزیرے پر کنٹرول سنبھال لیا۔

یہی وہ لمحہ تھا جب ”عارضی تقسیم“ ایک حقیقت بن گئی۔ اور پھر 1974 میں، امریکہ کے اشارے پر یونانی فوجی جتنا نے مکاریوس کے خلاف بغاوت کر دی تاکہ قبرص کو یونان میں خصم کیا جاسکے۔ ترکی نے قبرص پر یونانی قبضے کو روکنے کیلئے اسی وقت حملہ کر دیا۔ دو مرحلوں میں کی گئی اس فوجی کارروائی نے جزیرے کا تقریباً 36 فیصد حصہ ترکی کے قبضے میں دے دیا۔ دو لاکھ لوگ اپنے گھروں سے بے گھر ہوئے۔ شمالی حصہ آج تک ”ترک جمہوریہ شمالی قبرص“ کہلاتا ہے، جسے دنیا میں صرف ترکی تسلیم کرتا ہے۔

قبرص کی یہ تقسیم اب ساٹھ سال سے زیادہ پرانی ہو چکی ہے، لیکن زخم ابھی تازہ ہیں۔ نیکو سیا آج بھی ایک دیوار سے دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ اقوام متحدہ کی امن فورس وہاں موجود ہے، مگر سرمایہ دارانہ سامراج کا پیدا کردہ اصل مسئلہ جوں کا توں ہے۔

اسرائیلی صیہونیوں کی قبرص میں انوسمٹ نے حال ہی میں ایک نئی بحث کو جنم دیا ہے۔ سنہ 2004 میں قبرص یورپی یونین میں شامل ہو گیا تھا، مگر ترک قبرص کا مسلسلہ ابھی تک حل نہیں کیا گیا۔ اسے ابھی تک دنیا سے کاٹ کر رکھا گیا ہے۔ شاید اس کیلئے کوئی طوبیل عرصے کا منصوبہ بنایا گیا ہو۔

یہ ساری کہانی صرف ایک جزیرے کی نہیں بلکہ سرد جنگ کے زمانے کی ایک سوچ کی ہے۔ اس سوچ میں مقامی عوام کی آزادی یا خود مختاری کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ صرف اتنا دیکھا جاتا تھا کہ کنٹرول کیسے کیا جائے۔ امریکہ نے مکاریوس کو صرف اس لیے دشمن سمجھا کہ وہ غیر جانبدار تھا۔ مگر وقت نے ثابت کیا کہ وہ اپنے ملک کی خود مختاری کے لیے کھڑا تھا، کسی نظریے کا غلام نہیں تھا۔ قبرص ایک آزاد اور خود مختار حیثیت میں ترقی یافتہ خوشحال ملک بن سکتا تھا مگر سرمایہ داروں کو صرف اپنے مفادات عزیز تھے۔

آج جب مشرقی بحیرہ روم میں گیس کے ذخائر کی دوڑ چل رہی ہے، قبرص ایک بار پھر اسی تنازع کا مرکز بنا ہوا ہے۔ یونان پورے قبرص پر کنٹرول قائم کرنا چاہتا ہے مگر ترکی کو ایسا کوئی حل قبول نہیں جس میں ترک آبادی کے مفادات کی گارنٹی نہ ہو۔

-----فائل EU-09 کا اختتام-----

ملک: یونان

سال: 1967

فائل: EU-10

ایکس اپریل 1967 کی رات میں ایتھنز کی سڑکوں پر فوجی ٹینک گھوم رہے تھے اور ہزاروں لوگوں کو گرفتار کیا جا رہا تھا۔ یہ سب نیٹو کے ایک منصوبے کے تحت ہوا ہے جسے امریکہ نے سرد جنگ کے زمانے میں تیار کیا تھا۔ اس منصوبے کا نام تھا "پرو یٹھنیس" تھا جسے "جمهوریت کے علمبردار" امریکہ نے استعمال کر کے یونان کی جمہوریت کو اسی کی فوج کے ہاتھوں ختم کروادیا۔ پس منظر یہ ہے کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد یونان میں ایک خونی خانہ جنگی چھڑ گئی تھی۔ ایک طرف مغرب کے حمایت یافتہ حکومتی دستے تھے، دوسری طرف عوام جن میں کمیونزم بیحد مقبول ہو چکی تھی۔ امریکہ نے اس جنگ میں مداخلت کا فیصلہ کر لیا۔ صدر ہیری ٹروین نے 1947 میں وہ مشہور "ٹروین ڈاکٹر ان" پیش کی جس میں کہا گیا کہ امریکہ ہر اس قوم کی مدد کرے گا جو کمیونسٹ دباؤ سے آزاد رہنا چاہتی ہے۔ اس مقصد کو جو نام دیا گیا اور اس مقصد کے حصول کیلئے جو کچھ کیا گیا وہ دو مقتضاد چیزیں تھیں۔ یونان میں قوم کمیونزم چاہتی تھی مگر امریکہ نے اس پالیسی کو فوج کی ڈکٹیٹر شپ قائم کرنے اور عوامی خواہشات کو دبانے کیلئے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔

امریکی امداد، مشیر اور سی آئی اے کے افسران بڑی تعداد میں ایتھن پہنچے۔ اگلے چند برسوں میں امریکیوں نے یونانی فوج اور انٹیلی جنس اداروں میں گھرے تعلقات بنالیے۔ انہوں نے عوام میں کمیونزم کی مقبولیت کو روکنے کیلئے انہی طاقتور اداروں کا استعمال کیا۔ جب 1952 میں یونان نیٹو کا رکن بنا، تو یہ تعلقات مزید مضبوط ہو گئے۔ فوج نے حکومت پر مکمل کنٹرول حاصل کر لیا اور یونانی فوج کو امریکہ کی مکمل حمایت حاصل رہی۔

اصل کہانی ساٹھ کی دہائی میں شروع ہوتی ہے جب جارج پاپاندriو کی حکومت نے اقتدار سنبھالا۔ وہ سینٹر لیفت کے سیاستدان تھے، اور ان کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ وہ فوج اور بادشاہت کو قابو میں لانا چاہتے تھے۔ ان کے بیٹے آندریاس پاپاندriو کی تیز

زبان اور امریکی پالیسیوں پر تنقید نے واشنگٹن کو برہم کر دیا۔ فوج کے اندر امریکی وفاداروں میں، خاص طور پر ان افسران میں جو برسوں سے سی آئی اے کے قریب تھے، یہ خیال پھیل گیا کہ پاپاندروی خاندان کی خود مختاری کی خواہش کو لگام دینا ہوگی۔

انتخابات میں 1967ء میں ہونے والے تھے، اور اندازہ تھا کہ پاپاندروی کی جماعت دوبارہ واضح اکثریت سے جیت جائے گی۔ اس سے پہلے کہ ایسا ہوتا، اکیس اپریل کی رات چند درمیانے درجے کے فوجی افسروں نے، جن کی قیادت کرنل جارج پاپادوپولس کر رہا تھا، اچانک بغوات کر دی۔ شہر کے ہر حصے میں ٹینک نکل آئے، ریڈیو اسٹیشنز پر قبضہ ہو گیا، اور اگلی صبح یونان میں مارشل لاءِ گل چکا تھا۔

یہ وہی پاپادوپولس تھا جس کے بارے میں سی آئی اے کے پاس برسوں پرانی فائلیں موجود تھیں، اور جسے امریکیوں کے نزدیک "قابل اعتماد" افسر سمجھا جاتا تھا۔ امریکہ کی سرکاری پوزیشن یہ تھی کہ انہیں اس بغوات کا علم نہیں، مگر ان کی خاموشی اور فوری رد عمل سب کچھ بتا گیا۔ اگلے ہی دن امریکی سفارت خانے نے نئی فوجی حکومت کو تسلیم کر لیا۔ واشنگٹن نے جمہوریت کے خاتمے اور مارشل لاءِ گانے پر کسی قسم کی مذمت نہیں کی۔ ظاہر ہے کہ یہ امریکی سازش کے تحت لگایا گیا مارشل لاءِ تھا۔ اگلے سات برس یونان نے وہ ظلم دیکھا جس نے اس قوم کی نفیسیات بدل کر رکھ دی۔ ہزاروں لوگوں کو گرفتار کیا گیا، تشدد عام تھا، اخبارات بند کر دیے گئے، اور ہر آواز کو "قومی سلامتی" کے نام پر دبایا گیا۔ امریکہ نے خاموشی سے اس حکومت کو امداد دینا جاری رکھی۔ کچھ رسمی بیانات دے کر اپنے ماتھے پر لگے دھبے کو چھپانے کی کوشش کی۔ امریکہ نے رسمی طور پر کہا کہ یونان کو جمہوریت کی طرف جانا چاہیے، مگر ان کا عمل بالکل متضاد تھا۔ واشنگٹن کو ایک تابعدار اور وفادار حکومت چاہیے تھی، چاہے اس کے ہاتھ خون سے رنگے ہوں۔

ظلم و ستم کا یہ دور 1974ء میں تبدیل ہونا شروع ہوا جب فوجی حکومت نے قبرص کے صدر آرج بشپ مکاریوس کے خلاف بغوات کر دی تاکہ جزیرے کو یونان کے ساتھ ملا سکے۔ اس احمقانہ قدم نے ترکی کو مداخلت کا موقع دیا، اور ترک فوج نے قبرص پر حملہ کر دیا۔ نیٹو کے دو رکن ملک ایک دوسرے سے لڑنے لگے، اور یونانی فوج مکمل طور پر بے نقاب ہو گئی۔ ذلت آمیز شکست اور تباہی کے بعد فوجی حکومت گر گئی، اور سات برس بعد ملک میں جمہوریت بحال ہوئی۔

جب قسطنطین کارانلس واپس آئے اور نئی جمہوری حکومت بنی تو یونانی عوام پر یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ امریکہ نے ان کی جمہوریت ختم کروائے کے مارشل لاءِ گلوایا تھا۔ جس ملک کو یونانی دوست سمجھتے رہے وہی ان کے ڈکٹیٹریز کے پیچھے کھڑا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب یونانی معاشرے میں ایک گہری اینٹی امریکن سوچ نے جڑ پکڑی۔ اس احساس نے اگلے کئی عشروں تک سیاست کی سمت بدل دی۔

سنہ 1971 کے بعد بننے والے نئے آئین میں فوج کی سیاست میں مداخلت کو مکمل طور پر غیر آئینی قرار دیا گیا۔ اسی دور کے زخموں نے 1981 میں پاسوک پارٹی کو اقتدار تک پہنچایا، جو کھلے عام امریکہ مخالف نعروں پر انتخاب جیتی۔ یونان کی خارجہ پالیسی میں ایک نئی خود مختاری کا جذبہ پیدا ہوا، اور نیٹو پر عوامی عدم اعتماد بڑھتا گیا۔

یہ کہانی صرف یونان کی نہیں، امریکہ کی بھی ہے۔ ایک ایسی سپرپاور کی جو بار بار اپنے نظریات کے خلاف فصلے کرتی ہے۔ جو جمہوریت کا علم اٹھاتی ہے مگر آمریتوں کو سہارا دیتی ہے، بس اس شرط پر کہ اس کا مفاد ہر حال، ہر قیمت پر پورا ہوتا رہے۔

-----فائل 10-EU کا اختتام-----

ملک: چیکو سلو اکیہ

سال: 1968

فائل: EU-11

بیس اگست 1968 کی رات جب پوری دنیا سورہی تھی، چیکو سلو اکیہ کی سرحدوں پر دو لاکھ سے زیادہ فوجیں ٹینکوں کے ساتھ داخل ہو رہی تھیں۔ یہ سوویت یونین اور اس کے اتحادیوں کی فوجیں تھیں جو اپنے ہی ایک اتحادی ملک میں بغاوت کھلنے آئی تھیں۔ آپ کو یہ سمجھنے کے لیے میں پہلے تھوڑا پچھے لے کر چلتا ہوں۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد چیکو سلو اکیہ سوویت یونین کے اثر میں آ گیا تھا۔ بیس سال تک وہاں سخت گیر سٹالنیٹ حکومت رہی۔ معیشت بری طرح پٹی ہوئی تھی، عوام یزار تھے۔ پھر جنوری 1968 میں الیگزانڈر ڈپیک نامی ایک لیڈر سامنے آیا جس نے "Socialism with a human face" کا نعرہ لگایا۔ اس نے سنر شپ ختم کی، عوامی بحث کو فروغ دیا، معیشت میں اصلاحات کیں۔ یہ پر اگ سپرنگ کا دور تھا۔

لیکن دوستو، یہاں ایک اور اہم پہلو ہے جسے اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ مغربی ممالک، خاص طور پر امریکہ، نے اس سارے واقعے میں بہت ہوشیاری سے کام لیا۔ وہ جانتے تھے کہ بریزنسیف ڈاکٹر ان کے تحت سوویت یونین کسی بھی اشتراکی ملک میں سو شلسٹ نظام میں تبدیلیاں برداشت نہیں کرے گا۔ امریکہ نے دانستہ طور پر ایسی پروپیگنڈا مہم چلائی جس سے چیکو سلو اکیہ کے اصلاح پسندوں کو غلط فہمی ہوئی۔

ریڈیو فری یورپ اور وائس آف امریکہ کے ذریعے وہ مسلسل ڈپیک کی اصلاحات کی تعریف کر رہے تھے، انہیں مزید آگے بڑھنے کی ترغیب دے رہے تھے۔ یہ بالکل ایسا تھا جیسے کسی بھڑکتی ہوئی آگ میں تیل ڈالا جا رہا ہو۔ امریکہ کو پوری طرح علم تھا کہ اس کی یہ ریڈیو broadcasts سوویت یونین کو مشتعل کر رہی ہیں، لیکن وہ جان بوجھ کریے کام کر رہا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ امریکہ چیکو سلو اکیہ کی مدد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ حالات اس قدر خراب کر دئے جائیں کہ سوویت یونین کو اپنے ہی اتحادی ملک پر حملہ کرنا پڑے، تاکہ دنیا بھر میں اشتراکیت بدنام ہو۔ مغرب کو مزید پروپیگنڈہ کا موقع ملے۔

جب سوویت ٹینکوں نے پر اگ کے گلی کوچوں میں گھسنا شروع کیا تو امریکی صدر جانسن نے صرف زبانی مذمت کی۔ صدر جانسن نے واضح کر دیا کہ امریکہ فوجی طور پر مدد کے لیے نہیں آئے گا۔ جیسے امریکہ کے ریاس ریڈیو سٹیشن نے مشرقی جرمنی میں کیا تھا۔ یہ ایک سوچی سمجھی حکمت عملی تھی۔ امریکہ ویت نام جنگ میں پھنسا ہوا تھا اور وہ مشرقی یورپ میں سوویت یونین سے براہ راست تصادم کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ انہوں نے چیکو سلو ایکہ میں سازش کر کے انکی عوام کو بلی کا بکرا بنادا۔ اصلاح یہ ثابت کرنے کیلئے کہ سوویت یونین ایک جارح قوت ہے۔

اس واقعے کے دور رس اثرات ہوئے۔ ایک طرف تو چیکو سلو ایکہ میں بیس سال تک سخت گیر حکومت قائم رہی، دوسری طرف اس واقعے نے سوویت یونین کی ساکھ کو عالمی سطح پر بری طرح نقصان پہنچایا۔ چین نے بھی سوویت یونین کی سخت مذمت کی۔ لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس واقعے نے ثابت کر دیا کہ مغربی ممالک اپنے مفادات کے لیے کسی بھی چھوٹے ملک کو قربان کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ انہوں نے چیکو سلو ایکہ کے عوام کو جھوٹی امیدیں دیں، انہیں اشتغال دلایا، اور پھر مشکل وقت میں انہیں تنہا چھوڑ دیا۔

آج بھی جب ہم یوکرین پر روس کے حملے کو دیکھتے ہیں تو پر اگ سپرنگ کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ روس آج ایک بار پھر مغربی جاریت پر پیشگی دفاعی پوزیشن لینے پر مجبور ہے۔ اور مغربی ممالک آج بھی وہی کھیل کھیل رہے ہیں۔ وہ خود باہر پیٹھ کر یوکرین کو ہتھیار دے رہے ہیں۔ خود جنگ میں شامل نہیں ہو رہے بس یوکرین کی بربادی کو یقینی بنارہے ہیں۔ یوکرائی عوام کی لاشوں پر چڑھ کے روس کو بدنام کر رہے ہیں۔

تاریخ خود کو دہرا رہی ہے لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ مغربی پروپیگنڈہ مشینزی اس قدر مضبوط ہے کہ تنقید مظلوم پر ہوتی ہے۔ چھوٹے ممالک کو آسانی سے قربان کر دیا جاتا ہے جیسے کہ ان ممالک میں رہنے والے لوگ انسان نہیں کوئی حقیر مخلوق ہیں جنہیں تلف کرنا انسانیت کے کسی بڑے مقصد کیلئے ضروری ہے۔

اس زمانے میں کیونزم میں ترمیم پر بہت تنقید کی جاتی تھی کیونکہ مغربی سامراج کسی بھی تقسیم اور ترمیم کی کھل کر حمایت شروع کرتا تھا۔ اور دوسری طرف مغربی سامراج سو شلزم اور کیونزم کی ہر قسم کوٹانے پر تلا ہوا تھا۔ خود مغربی سامراج کا واحد نظریہ

کامل اجراہ داری قائم رکھنا تھا اور دنیا بھر کی اشرافیہ اس مقصد میں مکمل طور پر متحد تھی۔ ایسے میں ٹاپ کمیونسٹ لیڈر شپ میں  
کے حوالے سے قدرتی مخالفت موجود تھی۔ revisionism

-----  
فائل EU-11 کا اختتام-----

ملک: اٹلی

سال: 1969

فائل: EU-12

بارہ دسمبر 1969 کو شام کے ساڑھے چار بجے، اٹلی کے شہر میلان کے پیاطرا فونٹانا میں ایک بینک میں زبردست بم دھماکہ ہوا جس میں سترہ لوگ مارے گئے اور اٹھاسی زخمی ہوئے۔ یہ دھماکا ایک بین الاقوامی سازش کا نقطہ آغاز تھا جس میں امریکی خفیہ ادارے سی آئی اے نے اٹلی کی فاشست جماعتوں کے ساتھ مل کر کام کیا تھا۔

دوستو، اس واقعے کو سمجھنے کے لیے ہمیں سرد جنگ کے دور میں جانا ہو گا۔ اٹلی میں کمیونسٹ پارٹی تیزی سے مقبول ہو رہی تھی اور ووٹوں کا ایک بڑا حصہ حاصل کر چکی تھی۔ امریکہ کو خدشہ تھا کہ اگر اٹلی میں کمیونسٹ حکومت بن گئی تو یورپ میں سوویت یونین کے لیے دروازہ کھل جائے گا۔ اس خوف نے امریکہ کو ایک دشمنگردی اپنانے پر مجبور کیا۔

سی آئی اے نے آپریشن گلیڈیونامی ایک خفیہ نیٹ ورک قائم کیا جس کا مقصد اٹلی کی اندرونی سیاست کو اس طرح متاثر کرنا تھا کہ بدنامی کمیونسٹ پارٹی پر عاید ہو اور یہ تاثر قائم کیا جائے کہ امریکہ سوویت یونین کے خلاف اٹلی کی مدد کر رہا ہے۔ اس نیٹ ورک نے دائیں بازو کی انتہا پسند جماعتوں کو رقم، ہتھیار اور تربیت فراہم کی۔

پیاطرا فونٹانا کا دھماکا اسی حکمت عملی کا پہلا بڑا واقعہ تھا۔ سی آئی اے کے ایک ایجنسٹ ڈیوڈ کیرٹ نے فاشست رہنماء اسٹیفانو ڈیلے چینے کے ساتھ مل کر اس دھماکے کی منصوبہ بندی کی۔ بم نیٹو کے اسلحے خانے سے حاصل کردہ مواد سے تیار کیا گیا تھا۔ دھماکے کے فوراً بعد پولیس نے اس واقعے کا الزام دائیں بازو کی پارٹیوں پر لگا دیا، جبکہ حقیقت میں یہ دائیں بازو کے عناصر نے کیا تھا۔

اس کا میاںی کے بعد یہ سلسلہ جاری رہا۔ سنہ 1972 میں پیٹانو میں تین پولیس اہلکاروں کو مارا گیا۔ سنہ 1973 میں میلان پولیس ہیڈ کوارٹر پر حملہ ہوا۔ سنہ 1980 میں بولنیاریلوے اسٹیشن پر ہونے والے دھماکے میں پچاسی افراد ہلاک ہوتے۔ ہر واقعے میں گلیڈیونیٹ ورک اور سی آئی اے کا ہاتھ ثابت ہوا۔

ان واقعات کے دور رس اثرات مرتب ہوتے۔ اٹلی میں جمہوریت کمزور ہوئی، پولیس کو غیر معمولی اختیارات ملے، اور عدالتی نظام مشکوک ہوا۔ کیونسٹ پارٹی کی مقبولیت میں کمی آئی جبکہ دائیں بازو کی جماعتیں مضبوط ہوئیں۔

جب 1990 میں یہ اسکینڈل عوام کے سامنے آیا تو پورے یورپ میں ہلچل مج گئی۔ یورپی پارلیمنٹ نے اس کی مذمت کی اور خفیہ نیٹ ورکس کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا۔

لیکن دوستو، فالس فلیگ آپریشنز کا یہ سلسلہ رکا نہیں بلکہ آج بھی جاری ہے۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا بھر میں پراسرار دھماکے ہوتے ہیں، پروپیگنڈہ کے ذریعے عوام کو گراہ کیا جاتا ہے، اور حقیقی مجرموں کو بچایا جاتا ہے سپیاٹزا فونٹانا کا واقعہ یہ سبق دیتا ہے کہ سرکاری بیانات پر آنکھیں بند کر کے یقین نہیں کر لینا چاہیے۔ ہمیں حقائق کی تلاش جاری رکھنی چاہیے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ خفیہ ادارے کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں۔ آج امریکہ میں نائن الیون پر سوالات اٹھاتے جا رہے ہیں اور اس بات سوال اٹھانے والے کوئی اور نہیں بلکہ راتٹ ونگ کے دانشور ہیں۔

-----فالن 12-EU کا اختتام-----

ملک: پرتگال

سال: 1974

فائل: EU-13

سنہ 1974 کی ایک صبح لزبن کی سڑکوں پر فوجی ٹینک آگے بڑھ رہے تھے اور عام لوگ ان کی بندوقوں میں کاربینشن کے پھول رکھ رہے تھے۔ کسی کو اندازہ نہیں تھا کہ یہ منظر پچاس سالہ آمریت کے خاتمے کے ساتھ امریکہ کے ایک خفیہ مشن کو بھی بے نقاب کرنے والا ہے۔ یہ وہ لمحہ تھا جب پرتگال کا پرانا اتحادی، امریکہ، اپنے ہی بنائے ہوئے نظام کے بوجھ تلتے دب گیا۔

مجھے ہمیشہ سے مغرب پر شک تھا۔ ان کی نام نہاد جمہوریت پسندی، ہیومن رائٹس کے کھوکھلے دعووں اور آزادی اظہار کی بڑھکوں پر مجھے کبھی یقین نہیں آتا تھا، اسی لئے ایک سال پہلے میں نے یہ تحقیق شروع کی تاکہ اپنے مغرب نوازوں کی باتوں کا جواب دیا جاسکے۔ جب وہ دوسرے ملکوں پر ڈیکٹیٹر شپ کا الزام دھر کے اس کا حساب ہم سے مانگتے ہیں۔ جب نیو لبرل کسی بھی دوسرے نظرے پر بات کرنے والے کو حقارت سے رد کرتے ہیں تو انہیں مغرب کا ریکارڈ دکھایا جائے اور الٹا ان سے سوال کیا جائے کہ یہ کیا تھا؟

تحقیق شروع کرتے ہوئے مجھے ہرگز یہ اندازہ نہیں تھا کہ تباخ اس قدر حیران کن نکلیں گے۔ پرتگال ہی کے کیس میں دیکھنے کے لیے امریکہ نے 1960 سے 74 تک ایک غریب یورپی آمریت کو اپنی جیب سے سہارا دیا۔ آپ سوچتے، ایک طرف جان ایف کینیڈی کی حکومت دنیا بھر میں آزادی اور جمہوریت پر لیکھ برازی کر رہی تھی اور دوسری طرف وہی امریکہ ایک ایسے شخص کو پیسے، ہتھیار اور تربیت دے رہا تھا جو افریقہ میں اپنی کالونیوں پر بھم بر سارہ تھا۔

پس منظر یہ ہے کہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب افریقہ میں نوآبادیاتی نظام ٹوٹ رہا تھا تو پرتگال نے اپنے قبضے کو "اوورسیز صوبے" کہہ کر جائز ثابت کرنے کی کوشش کی۔ اس کے آمر انطونیو دی او لیویرا سلازار کا کہنا تھا کہ یہ علاقے پرتگال کا حصہ ہیں، غلام نہیں۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ ان علاقوں میں زبردستی کی مشقت، تشدد، اور آزادی کی ہر آواز کو گولی سے دبایا جاتا تھا۔

امریکہ اس عظیم اخلاقی آزمائش پر بھی سرخر و ثابت ہوا تھا۔ ایک طرف سوویت یونین پر ڈکٹیٹر شپ کے الزامات، آخرن کرٹن والا پروپیگنڈہ اور دوسری طرف پر تگال کے انسانیت سوز جنگلی جرام کی مدد کی۔ جی ہاں، یہ بھی ہوا تھا۔ ازورس کے جزاً پر امریکہ نے فوجی اڈہ بننا کر مشرق وسطی سے آنے والے تیل کے جہازوں کی نگرانی کی، یورپ کی اجارہ داری کا دفاع کیا اور ساتھ ہی سلازار کی انسانیت سوز ڈکٹیٹر شپ کو حمایت دی۔

سنہ 1961 میں کینیڈی نے ایک خفیہ حکم پر دستخط کیے جس کے تحت دو ملین ڈالر کی رقم خفیہ راستوں سے پر تگال کو دی گئی۔ یہ پسے براہ راست سی آئی اے کے ذریعے لبین کے بینکوں میں جاتا اور وہاں سے پر تگالی فوج اور ان کی خفیہ پولیس کے کام آتا۔ یہ رقم پروپیگنڈہ، گولے بارود، اور انٹیلی جنس کے آلات پر خرچ ہوتی اور ان سے افریقہ میں آزادی پسندوں کو بے دردی سے قتل کیا جاتا تھا۔

امریکہ نے ان جنگلی جرام میں اپنی شرکت کو چھپانے کے لیے ایک نظریاتی پرده بھی تیار کیا۔ برازیل کے ایک سورخ گلبیر تو فریرے کے نظریے "لوسوڑا پیکلزمن" کو فروغ دیا گیا جس میں دعویٰ کیا گیا کہ پر تگالی نوآبادیات میں نسلی ہم آہنگی اور دوستی ہے۔ یہ نظریہ بعد میں امریکی یونیورسٹیوں اور سکولوں میں پھیلایا گیا تاکہ افریقہ میں پر تگال کی جنگوں پر تنقید کو دبایا جاسکے۔

وقت گزرتا گیا، ظلم بڑھتا گیا اور اسکے ساتھ آزادی کی تحریکیں بھی بڑھتی گئیں۔ سنہ 1965 تک امریکہ نے امداد تین گناہ بڑھا دی۔ بظاہر تو اسے "زرعی ترقیاتی امداد" کہا گیا، مگر حقیقت یہ تھی کہ ستر فیصد فنڈز جنگلی جہازوں، نیپام بموں اور جنگلی تربیت پر خرچ ہوتے۔ امریکی ماہرین نے پر تگالی فوجیوں کو ہیلی کاپڑ حملوں اور آزادی کی تحریکوں کو سختی سے کچلنے کے طریقے سکھائے۔ نتیجیہ نکلا کہ ہزاروں افریقی گاؤں جلا دیے گئے اور ہزاروں لوگ مارے گئے۔

سلازار کے بعد جب مارسیلو کیتانو آیا تو امریکہ نے اسے ایک نئے جہوری چہرے کے طور پر پیش کیا۔ نکسن حکومت نے اسے واشنگٹن بلایا، تیس ملین ڈالر کے قرض دیے، اور بظاہر یہ تاثر دیا کہ پر تگال اصلاحات کی طرف بڑھ رہا ہے۔ لیکن پس پرده سی آئی اے نے امداد مزید بڑھا دی۔ اس با پسے خفیہ طور پر اخبارات، مزدور تنظیموں اور پرو حکومت مہماں کے لیے استعمال ہوا۔

یہ ساری مہم آخر کار خود پر تگال کے فوجیوں کے خلاف جا کر لگی۔ جو نوجوان افسر افریقہ میں یہ جنگلی لڑ رہے تھے، انہوں نے دیکھا کہ وہ اپنے ہی ملک کے عوام سے زیادہ بیرونی مفادات کی خاطر قربانیاں دے رہے ہیں۔ انہی افسروں نے 1974 میں بغاوت کی بنیاد رکھی۔ وہی بغاوت جو کارنسن انقلاب کے نام سے مشہور ہوئی۔

چونیس گھنٹے میں حکومت گر گئی، آمریت ختم ہو گئی، اور وہ خفیہ فائلیں سامنے آئیں جن میں سی آئی اے کے اہلکاروں کے نام، خفیہ رقم کے ریکارڈ، اور پر تگال کی خفیہ پولیس کے امریکی تعلقات درج تھے۔ نئی حکومت نے فوری طور پر افریقہ کی آزادی کا اعلان کیا۔ ایک سال کے اندر اندر انگولا، موزبیق اور گنی بساو آزاد ہو گئے۔

اس انقلاب نے تین بڑی تبدیلیاں کیں۔ پہلا، افریقہ نے صدیوں پرانی غلامی سے نجات پائی۔ دوسرا، امریکہ اور نیٹو کے چہرے سے جمہوریت پسندی کا نقاب اتر گیا اور اپنی ساکھ بحال کرنے کیلئے امریکہ اور یورپ کو مجبوراً انسانیت کا بھرم رکھنا پڑا۔ تیسرا، امریکہ کو اپنے خفیہ پروگراموں پر قانون سازی کرنا پڑی۔ سنہ 1974 میں ہائی وزرائیں ترمیم آئی جس کے بعد کسی بھی خفیہ کارروائی کے لیے صدر کی منظوری لازم قرار دی گئی۔

ان کہانیوں سے یہ چیز بھی ثابت ہوتی ہے کہ امریکہ اور یورپ کی حکومتیں حقیقی طاقت نہیں ہیں بلکہ کوئی اور پچھے یہٹھا خفیہ ایجنسیوں، مالی نظام اور میڈیا کے ذریعے سب کچھ کثروں کرتا ہے۔ یہ سیریز مکمل کرنے کے بعد اس رخ پر بھی کام شروع کریں گے۔ میں اور آپ اس پورے نظام کو بے نقاب کریں گے۔ یورپ اور امریکہ کے لوگ بھی ہماری طرح اس نظام کے غلام ہیں۔ امریکہ اور یورپ کے جوان بھی کسی خفیہ طاقت کی نشانے پر جنگلوں کا ایندھن بنائے جاتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ کے فوجی بھی اس غلامی سے نکلنا چاہتے ہیں۔ پر تگال کے فوجی اس کی مثال ہیں۔ امریکہ کے طالب علموں نے ویتنام جنگ کی مخالفت کر کے اس کی مثال قائم کی تھی۔

پر تگال میں آج بھی 25 اپریل کا دن آزادی کے طور پر منایا جاتا ہے۔ لزبنا کا پل جسے پہلے "سلطنت پل" کہا جاتا تھا، اب "کارنسن برج" کہلاتا ہے۔ اگر ضمیر کی آواز سنی جائے تو ایک چھوٹے ملک کے لوگ بھی ظلم کے نظام کو چھوڑ کر بڑی طاقتوں کے منصوبے محوں میں خاک میں ملا دیتے ہیں۔

اس کہانی کا سبق آج بھی زندہ ہے۔ امریکہ نے بعد میں لاطینی امریکہ، مشرق وسطی اور وسطی ایشیا میں یہی طریقہ دہرا�ا، کبھی چلی یہ پنوشے کے ساتھ، کبھی مصر میں حسنی مبارک کے ساتھ، پاکستان میں ایوب، ضیاء اور مشرف کے ساتھ، انڈونیشیا میں سوہارتو، کوریا میں جزرل پارک اور فلپائن میں مارکوس کے ساتھ۔ بہت لمبی لسٹ ہے مگر ہر جگہ نتیجہ ایک جیسانکلا۔ چند سالوں کے وقتی استحکام کے بعد یا تو انقلاب آیا یا عوامی رد عمل۔

-----فائل EU-13 کا اختتام-----

ملک: فرانس

سال: 1980

فال: EU-14

---

سنہ 1980 کی دہائی میں جب پوری دنیا سرد جنگ کی لپیٹ میں تھی، اس وقت امریکہ اور فرانس کے درمیان ایک خاموش جنگ بھی جاری تھی۔ یہ جنگ میدانوں میں نہیں لڑی جا رہی تھی بلکہ لیبارٹریوں، سفارت خانوں اور بورڈرومز میں لڑی جا رہی تھی۔ اس کا مقصد ٹیکنالوجی پر اجارہ داری قائم کرنا تھا۔

اس وقت فرانس یورپ میں ایک ابھرتی ہوئی طاقت بن رہا تھا۔ اس نے کمپوٹر ٹیکنالوجی، ٹیلی کمیونیکیشن اور ایرو اسپیس میں بڑی سرمایہ کاری شروع کر دی تھی۔ ادھر امریکہ کو خطرہ تھا کہ اگر یورپ خود کفیل ہو گیا تو امریکی اجارہ داری کمزور پڑ جائے گی۔ یہی وہ پس منظر تھا جس میں دونوں ممالک کے خفیہ ادارے ایک دوسرے کے خلاف سرگرم ہو گئے۔

فرانسیسی خفیہ ایجنسی DGSE نے امریکہ میں درجنوں جاسوسی نیٹ ورک قائم کیے تاکہ ہائی ٹیک کمپنیوں سے معلومات چھرانی جاسکیں۔ دوسری طرف CIA نے بھی فرانس میں اسی طرح کے آپریشنز شروع کیے۔ خاص طور پر فرانسیسی کمپنیوں چیسے "Dassault" اور "Thomson-CSF" کو نشانہ بنایا گیا۔

کئی رپورٹس کے مطابق امریکی ایجنسیاں اپنے اتحادیوں کے خلاف بھی معاشی جاسوسی کر رہی تھیں۔ ایک مثال 1980 کی دہائی میں سامنے آئی جب پتہ چلا کہ امریکہ نے فرانس کے سفارتی پیغامات کو "Echelon" نامی سسٹم کے ذریعے مانیٹر کیا۔ یہ سسٹم بعد میں دنیا بھر کے تجارتی مذاکرات میں ایک خاموش ہتھیار بن گیا۔

فرانس نے رد عمل کے طور پر ایک مکمل یونٹ بنایا جس کا کام صرف امریکی اقتصادی جاسوسی کا مقابلہ کرنا تھا۔ اس یونٹ نے کئی امریکی "بزنس کونسلز" کو دراصل CIA کے الہکار قرار دیا جو یہ میں میں کمپنیوں کے اندر معلومات اکٹھی کر رہے تھے۔

یہ کشمکش صرف معلومات تک محدود نہیں رہی بلکہ براہ راست معیشت کو نقصان پہنچانے تک جا پہنچی۔ فرانس کے کئی صنعتی منصوبے اچانک بین الاقوامی سطح پر ناکام ہو گئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ ان میں سے کئی منصوبوں کی بولی کی تفصیلات پہلے ہی امریکی کمپنیوں کو پہنچادی گئی تھیں۔

اسی زمانے میں ایک اور اہم واقعہ پیش آیا۔ سوویت یونین کو بھی فرانس اور امریکہ کی اس لڑائی سے فائدہ پہنچ رہا تھا۔ بعض مغربی ذرائع کے مطابق، فرانسیسی انٹلی جنس نے کبھی بھار سوویت ایجنسیوں کو امریکی معاشی سرگرمیوں سے متعلق معلومات فراہم کیں تاکہ امریکہ پر دباؤ بڑھایا جاسکے۔

یہ وہ وقت تھا جب دنیا گلوبالائزیشن کے ابتدائی دور میں داخل ہو رہی تھی۔ مگر پس پرده طاقتوں مالک کے خفیہ ادارے یہ فیصلہ کر رہے تھے کہ اگلی صدی کی معیشت کس کے ہاتھ میں ہو گی۔ آج جب ہم یورپی یونین اور امریکی ٹیک کمپنیوں کے درمیان مقابلہ دیکھتے ہیں تو اس کی جھریں اسی دور کی معاشی جنگ میں ملتی ہیں۔

-----فائل 14-EU کا اختتام-----

ملک: پولینڈ

سال: 1981

فائل: EU-15

تیرہ دسمبر 1981 کی صبح، جب پولینڈ کے شہری اپنی روزمرہ زندگی کی تیاری کر رہے تھے، اچانک ملک بھر میں ٹینک نکل آئے۔ ٹی وی پر جنرل ووچینج یا روزیلسلکی نمودار ہوئے اور اعلان کیا کہ مارشل لانا فذ کر دیا گیا ہے۔ ہزاروں کارکن گرفتار کر لیے گئے، ٹیلیفون لاٹنیں منقطع ہو گئیں، اور ملک ایک ہی رات میں فوجی کنٹرول میں آگیا۔ مگر یہ کہانی نہ تو یہاں سے شروع ہوئی تھی اور نہ ہی وہیں پہنچتی ہوئی۔ یہ وہ دن تھا جب پولینڈ کی عوام کو سرمائے اور مذہب کے گٹھ جوڑنے نہ تھمنے والی مزاحمت میں بدل دیا، جس نے آنے والے برسوں میں پورے مشرقی یورپ کا نقشہ بدل دیا۔

پولینڈ میں مذہب اور قومیت کی کافی گنجائش تھی اور انہی کو استعمال کر کے ایک مزاحمتی تحریک شروع کی گئی۔ پولینڈ ہائیوں سے سوویت یونین کا حصہ تھا، مگر عوام کے دلوں میں کیتھولک چرچ کی گہری جھیں تھیں۔ مذہب کی اسی طاقت کو استعمال کر کے لوگوں کو کمیونزم سے تنفس کرنے کا بندوبست کیا گیا۔ جب سنہ 1978 میں کراکوف کے بشپ کارول ووئیٹیوا کو پوپ جان پال دوم بنوایا گیا، تو یہ پولینڈ کے لیے ایک علامتی trigger ثابت ہوا۔ پہلی بار کسی پوش شخص نے ویٹیکن کی سربراہی سنبھالی تھی۔ اس سے پوش عوام میں یہ یقین پیدا کیا گیا کہ ان کی شناخت مذہب سے ہے۔ یہی جذبہ دو سال بعد ایک بڑی عوامی بغاوت میں بدل گیا۔

سنہ 1980 کی گرمیوں میں جب خوراک کی قیمتیں بڑھیں تو مزدوروں نے ہڑتا لیں شروع کر دیں۔ گڈانسک شپ یارڈ میں ایک بھلی ملکی، لیک والیسے، نے قیادت سنبھالی۔ چند دنوں میں یہ تحریک پورے ملک میں پھیل گئی۔ حکومت کو مذاکرات پر مجبور ہونا پڑا، اور اکتیس اگست کو گڈانسک معاهدہ طے پایا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب پہلی بار کسی کیونسٹ ملک میں آزاد یونین کو تسلیم کیا گیا۔

اس یونین کا نام "سو لیڈیرٹی" رکھا گیا۔ ایک سال میں دس ملین لوگ اس تحریک کا حصہ بن گئے۔ کیونٹ پارٹی کے سامنے پہلی بار ایک ایسی عوامی طاقت کھڑی ہو گئی جو ریاستی نظام کے باہر موجود تھی۔

سوویت یونین کو مسلسل مغربی سازشوں کا سامنا تھا ان کیلئے یہ خطرے کی گھنٹی تھی۔ سوویت یونین کے سربراہ سمجھ گئے کہ پولینڈ میں زبردست سازش کی جا رہی ہے اور اگر یہ تحریک کامیاب ہو گئی تو اسی قسم کی تحریک مشرقی یورپ میں بھی سپانسر کی جائیں گی۔ امریکہ اور اتحادیوں کا تیر اس بارٹھیک نشانے پر لگا تھا اور انہیں ایک تاریخی موقع مل چکا تھا۔ ریگن نے کمیوزنزم کے خلاف مذہب کو ایک مہلک ہتھیار میں تبدیل کر دیا تھا۔ اتحادیوں کی پولینڈ انوسٹمنٹ کامیاب ہو رہی تھی اور انہیں اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا کہ پولینڈ ہی وہ جگہ ہے جہاں سے سوویت نظام کی دیوار میں پہلا شگاف ڈالا جا سکتا ہے۔

مغرب نے یہ جنگ بندوقوں سے نہیں لڑی۔ واشنگٹن نے یہ جنگ ویٹکن کے ساتھ مل کر ایک خفیہ مہم کے طور پر شروع کی تھی۔ سی آئی اے کے سربراہ ولیم کیسی کا پوپ جان پال دوم سے برہ راست رابطہ تھا۔ ویٹکن نے پولینڈ میں اپنی چرچ نیٹ ورک کے ذریعے اس نظریاتی جنگ میں عملی طور پر مدد فراہم کی، اور سی آئی اے نے وسائل، رابطے اور آلات پہنچائے۔ خفیہ طور پر لاکھوں ڈالر پولینڈ بھیجے گئے، جدید پرنٹنگ پریس، ریڈیو ٹرانسیمیٹر اور کیو نیکلیشن آلات چرچ کے ذریعے ملک میں داخل کیے گئے۔ یہ سب کچھ اس لیے کہ اگر ریاست سولیڈیرٹی کو کچلنے کی کوشش کرے تو پھر بھی بغاوت کی چنگاریوں پر تیل چھڑ کنے کا بندوبست موجود ہوا۔

اور یہی ہوا۔ جب مارشل لانافڈ ہوا تو قیادت گرفتار ہو گئی، مگر نیٹ ورک انڈر گروند کام کرتا رہا۔ انہی آلات کی مدد سے خفیہ نیوز لیٹر چھپتے رہے، غیر قانونی ریڈیو نشریات جاری رہیں، اور مغربی پروہینڈہ ہر گھر تک پہنچتا رہا۔ ریاست کی پوری طاقت کے باوجود یہ تحریک ختم نہ ہوئی۔ سی آئی اے اور چرچ کی کوششوں سے آگ سلکتی رہی۔

وقت گزرتا گیا۔ مارشل لا اٹھا لیا گیا۔ مغربی مالک کی اقتصادی پابندیوں نے کیونٹ حکومت کو مزید کمزور کر دیا۔ پھر 1988 میں جب ہڑتالوں کی ایک اور لہر اٹھی تو حکومت کے پاس کوئی راستہ نہ بچا۔ سوویت یونین کے سربراہ گورباچوف پہلے ہی غیر مداخلتی پالیسی اختیار کر چکے تھے۔ چنانچہ حکومت نے مذکرات کیے۔ سنہ 1989 میں گول میز کانفرنس ہوئی جس کے نتیجے میں

جزوی طور پر آزاد انتخابات کروائے گئے۔ سولیدیرٹی نے مغربی فنڈنگ اور زبردست پروپیگنڈہ مہم کی بدولت زبردست کامیابی حاصل کی اور مشرقی یورپ میں پہلی غیر کمیونسٹ حکومت وجود میں آئی۔

تاریخ کے اس موڑ پر پوری دنیا بدل رہی تھی۔ برلن وال کے گرنے کی راہ ہموار ہو چکی تھی، اور صرف دو سال کے اندر اندر سوویت یونین بکھر گیا۔ یہ سب مغربی خفیہ اجنسیوں نے ایک چھوٹی سی مزدور تحریک کو فنڈنگ اور پروپیگنڈہ کی مدد سے بہت بڑا بنانے کے، ویٹکن کی مدد سے مذہب کو ہتھیار بنا کے اور چرچ کے نیٹ ورک کو استعمال کر کے مکن بنایا تھا۔

آج جب ہم پولینڈ کو یورپی یونین اور نیٹو کا ایک مضبوط رکن دیکھتے ہیں تو یہ سمجھنا ضروری ہے کہ یہ سب سولیدیرٹی کی جدوجہد کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ یہ سی آئی اے اور ویٹکن کے درمیان وہ خفیہ پارٹنر شپ تھی جس نے کمیونزم کو کمزور کیا۔

یہ کہانی ختم نہیں ہوتی۔ آج ایک بار پھر مغرب دنیا میں مذہب کو ہتھیار بنا کر استعمال کرنے پر تلاشی ہے۔ ابراہیم معاهدہ اس پالیسی کی ایک مثال ہے۔ لیکن اسوقت کچھ چیزیں بدل چکی ہیں۔ مغربی سامراج فری مارکیٹ کے اصول توڑ رہا ہے۔ لوگ مغربی پروپیگنڈہ کو پہنچانے لگے ہیں۔ مغرب نے حال ہی میں مذہب کی اس قدر بڑائی کی ہے کہ لوگ ابراہیم معاهدے جیسی کوششوں پر ہنستے ہیں۔ آج میڈیا میں چند آوازیں آزاد ہیں اور وہ سنی جا رہی ہیں۔ جس طرح مسلم دنیا کمیونزم کے خلاف مکمل طور پر متحد تھی، اس بار مغرب کی منافقت کے خلاف اتحاد کئے ہوئے ہے۔

-----فال 15-EU کا اختتام-----

ملک: برطانیہ

سال: 1986

فائل: EU-16

---

پندرہ اپریل 1986 کی صبح امریکی ایف الیون بمبار طیاروں نے ب्रطانوی اڈوں کا استعمال کر کے لپیا پر حملہ کیا۔ ان طیاروں کا نشانہ طرابلس اور بن غازی کے وہ ٹھکانے تھے جہاں معمر قذافی کے خلاف امریکی انتقامی کارروائیاں جاری تھیں۔ مگر ہماری کہانی کا اصل موضوع کچھ اور ہے۔ اصل کہانی لندن اور واشنگٹن کے درمیان اس گھرے خفیہ تعاون کی ہے جس نے برطانیہ کو عملی طور پر امریکہ کی ماتحت ریاست بنادا۔

سرد جنگ کے زمانے میں دنیا دو طاقتوں کے درمیان بڑی ہوئی تھی۔ ایک طرف سوویت یونین اور دوسری طرف امریکہ۔ برطانیہ میں مارگریٹ تھیچر کی حکومت تھی اور امریکہ میں رونالڈ ریگن کا دور۔ دونوں نظریاتی طور پر ایک جیسے تھے۔ آزاد منڈی پر یقین رکھنے والے، اشتراکیت کے سخت مخالف۔ ان کے درمیان ذاتی دوستی بھی تھی اور سیاسی مفاہمت بھی۔ یہی دوستی آگے چل کر ایک ایسے خفیہ اتحاد میں بدل گئی جس نے عالمی سیاست پر بہت گہرا اثر ڈالا۔

لپیا کے حکمران معمر قذافی اس دور میں دنیا بھر میں آزادی کی تحریکوں کی مدد کر رہے تھے۔ وہ نہ صرف فلسطینی اور آئرلش باغیوں کو فنڈنگ کر رہے تھے بلکہ ایٹھی پروگرام پر بھی کام کر رہے تھے۔ اپریل 1986 میں مغربی برلن کے ایک ڈسکو پر بم دھماکہ ہوا جہاں امریکی فوجی جاتے تھے۔ دو فوجی اور ایک ترک خاتون ہلاک ہوئیں۔ امریکی اٹیلی جنس نے اس حملے کا الزام قذافی کے سر پر ڈال دیا۔

اب سوال تھا کہ رد عمل کیسے دیا جائے۔ ریگن نے لپیا پر فضائی حملے کا منصوبہ بنایا، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ امریکی طیاروں کو حملے کے لیے یورپ کے اوپر سے گزرنے کی اجازت نہیں ملی۔ فرانس، اسپین اور اٹلی نے انکار کر دیا۔ صرف برطانیہ ہی ایسا ملک رہ گیا تھا جہاں سے طیارے اڑ سکتے تھے، مگر اس اجازت کا مطلب تھا کہ برطانیہ خود کو خطرے میں ڈال دے۔ تھیچر پر اندر ونی دباؤ

بہت زیادہ تھا۔ اس کی اپنی کابینہ میں اختلاف، حزب مخالف کی مراحمت، عوامی خوف، سب کچھ ایک طرف اور دوسری طرف ریگن کی ذاتی امیل کہ امریکہ کو اس کی ضرورت ہے۔

تھپر نے اجازت دے دی۔ رات کے اندر ہیرے میں امریکی ایف الیون طیارے انگلینڈ کے اڈوں سے اڑے۔ طویل راستے سے ہوتے ہوئے وہ لپیا پہنچے۔ حملہ اتنا شدید تھا کہ طرابلس میں دھماکوں کی گونج میلوں دور تک سنی گئی۔ قذافی کے گھر پر بم گرے، ان کی گودلی ہوئی بیٹھی مار دی گئی، دو بیٹے زخمی ہوئے۔ مگر قذافی خود محفوظ رہے۔

اس حملے کے بعد دنیا بھر میں رو عمل آیا۔ یورپ نے اس فیصلے پر برطانیہ کو تیقید کا نشانہ بنایا۔ فرانس نے کہا کہ برطانیہ نے عالمی قانون کی خلاف ورزی کی۔ عرب دنیا میں غصہ پھیل گیا۔

لپیا پر حملہ صرف ایک فوجی کارروائی نہیں تھی بلکہ ایک علامت بن گیا۔ اس نے ثابت کیا کہ برطانیہ اب محض نیٹو کا حصہ نہیں بلکہ امریکہ کا فعال عسکری بازو بن چکا ہے۔ تھپر نے اپنے ملک کو امریکی مفادات کے لیے کھول دیا۔ یہی پالیسی آگے چل کر عراق جنگ میں ٹونی بلینر کے دور میں دوبارہ دھرائی گئی۔ ٹونی بلینر نے تمام حدیں پار کرتے ہوئے امریکہ کیلئے جھوٹی انٹلیجنس رپورٹ تک تیار کی کہ عراق کے پاس مہلک ہتھیار ہیں۔ ٹونی بلینر کے کردار نے رہی سہی برطانوی ساکھ بھی ختم کر ڈالی۔

اس خفیہ تعاون نے برطانوی سیاست کی سمت بدل دی۔ کنز رویٹو پارٹی کے اندریہ نظریہ جڑ پکڑ گیا کہ برطانیہ کی سلامتی کا انحصار امریکہ سے قریبی تعلق پر ہے۔ اسے یورپ اور امریکہ کے درمیان ایک "پل" کہا گیا۔ مگر اس پل کی قیمت بھاری تھی۔ برطانوی عوام کے ذہن میں یہ سوال بیٹھ گیا کہ کیا واقعی ہم آزاد ہیں یا محض امریکی پالیسی کا ایک حصہ بن گئے ہیں۔ برطانیہ کی خارجہ پالیسی ایک ماتحت ریاست کی طرح امریکہ کے تابع ہو گئی۔

اسی زمانے میں برطانیہ اور امریکہ نے انٹلی جنس شیئرنگ کو ایک منظم شکل دی۔ یو کے یو ایس اے معاهدہ، جس نے بعد میں فائیو آئز اتحاد کی بنیاد رکھی، اسی دور کی پیداوار ہے۔ برطانیہ نے اپنے اڈے، اپنے آلات اور اپنی معلومات امریکی خفیہ اداروں کے لیے کھول دیے۔ بدلتے میں برطانیہ کو امریکی ڈیٹا تک رسائی ملی، مگر اس نے برطانیہ کی خود مختاری کو داؤ پر لگا دیا۔

آج ہم برطانیہ کو بریگزٹ کے بعد اپنی شناخت ڈھونڈتے دیکھتے ہیں۔ برطانیہ کی اپنی کوئی ذاتی حیثیت نظر نہیں آتی۔ تھپر اور ریگن کا ماذل آج بھی لندن اور واشنگٹن کے تعلقات کا محور ہے۔ یہ ماذل طاقتور انٹلی جنس تعاون دیتا ہے، مگر ساتھ ہی یہ خطرہ بھی

رکھتا ہے کہ برطانیہ ہر امریکی مہم کا حصہ بن جائے، چاہے وہ درست ہو یا غلط۔ اور اگر امریکہ کا اقتصادی جہاز ڈوبتا ہے تو برطانیہ کی کشتی بھی نج نہیں پائے گی کیونکہ وہ اسی جہاز کے ساتھ بندھی ہو گی۔

سنہ 1980 کی دہائی میں بننے والے اتحاد نے برطانیہ کے فیصلوں کا محور طے کر دیا۔ امریکی طاقت کے لیے برطانوی زمین، برطانوی اڈے اور برطانوی ادارے استعمال ہوتے رہے۔ اس وقت کی لی گئی ایک اجازت نے آنے والی دہائیوں کی پالیسیوں پر ایک گہرا سایہ ڈال دیا۔

-----فائل 16-EU کا اختتام-----

ملک: روس

سال: 1992

فائل: EU-17

سنہ 1992 کے آغاز میں ماسکو کی مارکیٹوں کا منظر ناقابلِ یقین تھا۔ دکانوں کے شیلف خالی، لوگ قطاروں میں گھنٹوں سے کھڑے رہتے، اور اچانک ضروریات زندگی کی قیمتیں آسمان کو چھوٹے لگی تھیں۔ چند ہفتوں میں لاکھوں روپیہ اپنی ساری جمع پونجی کھو یہی تھے۔ یہ کسی جگہ کا نتیجہ نہیں تھا، یہ مغربی ماہرین میں تھا۔ انہوں نے "شاک تھیراپی" کا نام دیا تھا۔

مقصد یہ تھا کہ سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد روس کو ایک ہی جھٹکے میں سرمایہ دارانہ نظام میں داخل کر دیا جائے۔

سوویت یونین کے بکھرنے کے بعد روس کو ایک بڑا مسئلہ درپیش تھا۔ ستر سال سے ایک ایسا نظام چل رہا تھا جہاں ہر چیز ریاست کے ہاتھ میں تھی، اب اچانک کہا جا رہا تھا کہ یہ سب ختم کرو اور آزاد منڈی بناؤ۔ مغرب نے روس کی مدد کے نام پر اپنے ماہرین کیمپ، زیادہ تر ہاروڈ یونیورسٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں آندرے شلیفر، جونا تھن ہے، اور لارنس سمرز جیسے نام شامل تھے جو اس وقت عالمی بینک کے اعلیٰ مشیر تھے۔ روس کے اپنے اصلاح پسند رہنماء، بیگور گاندار اور اناطولی چوبائس، ان سے متاثر تھے۔ ان کا نعرہ تھا کہ اگر جلدی میں سرمایہ دار طبقہ میں کیا گیا تو کمیونزم واپس آجائے گا۔

پہلا قدم قیمتیوں کی آزادی تھا۔ حکومت نے جنوری 1992 میں فصلہ کیا کہ اب قیمتیں مقرر نہیں کی جائیں گی۔ اگلے ہی مہینے مہنگائی اس سطح پر پہنچی کہ ایک عام شہری کی عمر بھر کی بچت ایک دن میں ختم ہو جاتی۔ لوگ فیکٹریوں کے باہر قطاروں میں کھڑے تھے مگر خریدنے کو کچھ نہیں تھا۔ جنہوں نے برسوں جمع کی ہوئی رقم بینکوں میں رکھی تھی وہ کاغذ کا ڈھیر بن چکی تھی۔

پھر آیا بچاری کا مرحلہ۔ یہ دو حصوں میں ہوا۔ پہلے تو ہر شہری کو ایک کاغذی واپچر دیا گیا جس کے ذریعے وہ کسی سرکاری کمپنی میں حصہ خرید سکتا تھا۔ لیکن عوام کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ سرمایہ کاری کیا ہوتی ہے۔ ان کے واپچر چند کوڑیوں میں بڑے سرمایہ کاروں نے خرید لیے۔ اگلا مرحلہ سب سے خطرناک تھا جسے "لونز فار شیئرز" یعنی قرض کے بدال ملکیت کا منصوبہ کہا گیا۔

حکومت کو پیسے کی سخت ضرورت تھی۔ چند طاقتور ینکاروں نے ریاست کو قرض دیا، بدلے میں روس کی سب سے قیمتی کمپنیاں ان کے لئے نہیں۔ تیل، گیس، نکل اور دیگر وسائل ان کے ہاتھ چلے گئے۔ جب حکومت قرض واپس نہ کر سکی تو یہ ادارے انہی کے ہو گئے۔

یوں چند ہی برسوں میں روس میں ایک نیا طبقہ پیدا ہوا۔ انہیں ”اویگارکس“ کہا گیا۔ میخانیل خودرو کو فلکی، ولادیمیر پوتان، بورس بریزو فلکی جیسے لوگ راتوں رات ارب پتی بن گئے۔ عام رو سی کے لیے یہ سب ایک صدمہ تھا۔ ایک طرف چند افراد کے پاس جہاز، محل، اور ینکوں کی ملکیت، دوسری طرف کروڑوں لوگ جن کے پاس کھانے کو روٹی نہیں تھی۔

یہ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ روس کی معیشت بیٹھ گئی۔ سنہ 1991 سے 1998 تک ملک کی معیشت چالیس فیصد سکڑ گئی۔ لوگوں کی اوسط عمر کم ہو گئی۔ شراب نوشی، خودکشی، اور جرام نے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جو روس کبھی سپریا اور تھا، وہ اب مغرب کے معاشری تجربات کا میدان بن چکا تھا۔ رو سیوں کو لگا کہ مغرب نے ان کی مدد نہیں کی بلکہ انہیں کمزور کرنے کا منصوبہ بنایا۔

یہ وہ احساس تھا جس نے ایک نئے لیڈر کو جنم دیا۔ سنہ 1999 کے آخر میں ولادیمیر پوتن سامنے آئے۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ ریاست کو دوبارہ مضبوط بنائیں گے، ان لئیوں کو قابو میں لایں گے، اور روس کو عزت واپس دلوائیں گے۔ ان کے اقتدار میں آتے ہی پہلا ہدف وہی اویگارکس بنے جو کبھی یلتسن کے قریبی ساتھی تھے۔ خودرو کو فلکی کو گرفتار کیا گیا، بریزو فلکی ملک چھوڑ گیا، باقی سب خاموش ہو گئے۔ عوام نے اسے خوشی سے قبول کیا کیونکہ ان کے نزدیک پوتن انصاف کر رہا تھا۔

اسی دور میں روس نے مغرب سے فاصلہ بنانا شروع کیا۔ ”شاک تھیر اپی“ کے زخم اتنے گھرے تھے کہ رو سی عوام کے ذہن میں یہ بیٹھ گیا کہ امریکہ اور مغربی ماہرین نے ان کے ملک کو لوٹنے میں مدد کی تھی۔ اس نفرت نے پوتن کو وہ سیاسی مقام دیا جس کی بنیاد پر وہی ورنی دشمنوں سے گھرے روس کو بچائے ہوئے ہیں۔

آج کا روس اس بنیادی شاک سے نکل کر ترقی کے راستے پر گامزن ہے۔ ریاست کے زیر نگرانی سرمایہ دارانہ نظام چل رہا ہے، جہاں دولت چند ہاتھوں ہی میں ہے لیکن چین کے ماذل کو اپناتے ہوئے سیاست سے اویگارکس کو دور کر دیا گیا ہے۔ طاقت

اب واپس کریملن میں موجود حکومت کے پاس ہے۔ روس کا موجودہ نظام مغرب کے سکھانے گئے فری مارکیٹ سے ہٹ کر ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ رو سی نظام اس وقت تمام یورپی مالک سے زیادہ کامیاب ہے۔

اگر ہم آج روس اور مغرب کے تعلقات کو دیکھیں تو ان کی جڑیں وہیں 1990 کی ہائی میں ہیں، جہاں مغرب نے روس کی مدد کرنے کی بجائے انہیں غلط راستے پر ڈالا۔ وہ عدم اعتماد آج بھی موجود ہے۔ روس اب کسی عالمی ادارے یا مالیاتی منصوبے پر آسانی سے یقین نہیں کرتا۔ مغرب کا کوئی بھی مشورہ رو سی عوام کے لیے قابل قبول نہیں ہوتا۔ رو سی عوام کو شاک تھیراپی والا جھٹکا آج تک نہیں بھولا۔ اسی لیے صدر پوتن جب بھی مغرب کی بات کرتے ہیں تو وہ ”شاک تھیراپی“ کا حوالہ ضرور دیتے ہیں تاکہ عوام کو یاد رہے کہ ایک بار ہم ان پر بھروسہ کر کے برباد ہو چکے ہیں۔

سوویت یونین کے خاتمے کے بعد مغرب کو نیٹو اتحاد ختم کر کے روس اور دوسری کیونسٹ ریاستوں کو یورپی یونین کا حصہ بنانا چاہئے تھا تاکہ دنیا میں امن قائم ہو سکتا مگر مغربی سامراج نے اپنا کھلیل جاری رکھا اور گورباچوف کے ساتھ کئے گئے تمام وعدے توڑ کر نیٹو کو مشرق کی طرف پھیلاتے گئے۔ سوویت یونین کے بکھرے نے کے بعد بھی مغرب نے روس اور اس کے اتحادیوں کے ساتھ دشمنی ترک نہیں کی۔

-----فائل 17-EU کا اختتام-----

ملک: یوگوسلاویہ

سال: 1999

فائل: EU-18

---

سنہ 1999 کے موسم بہار میں نیٹو کے طیارے مسلسل اٹھتہر دن تک بلغراد پر بمباری کرتے رہے تھے۔ ایک یورپی دارالحکومت پر پہلی بار دوسری عالمی جنگ کے بعد مغربی طیارے کھلے عام حملہ کر رہے تھے۔ اس وقت تک دنیا کو اچھی طرح سے اندازہ ہو چکا تھا کہ یوگوسلاویہ نام کی ریاست اب ماضی کا قصہ بن چکی ہے اور امریکہ اب یورپ میں براہ راست طاقت کے استعمال سے باز نہیں آئے گا۔ لیکن یہ انجام اچانک نہیں آیا تھا، بلکہ ایک طویل اور سوجی سمجھی مداخلت کا نتیجہ تھا، جس میں امریکہ اور جرمنی نے مل کر ایک پوری ریاست کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا۔

یوگوسلاویہ دراصل ایک خواب کی پیداوار تھی، مارشل ٹیٹو کا خواب، جس نے دوسری عالمی جنگ کے بعد چھ مختلف قویتوں کو ایک ریاست میں جوڑ کر ایک ایسا وفاق بنایا جو دہائیوں تک امن سے چلتا رہا۔ مگر یہ اتحاد مارشل ٹیٹو کے زور بازو اور تدبیر قائم تھا۔ ٹیٹو کے بعد تقسیم کے پرانے زخم کھلنے لگے اور ان زخمیوں نمک پاشی کرنے کا کام امریکہ اور جرمنی نے کیا۔ سرب، کروਨڈ، بوسنین، سلووین، ہر ایک کے اندر برسوں کا غصہ اور محرومی دبے ہوئے تھے۔ معیشت بگڑ چکی تھی، قرضوں نے ریاست کو جکڑ رکھا تھا، اور جیسے ہی برلن کی دیوار گری، سرد جنگ کا توازن ٹوٹ گیا۔ اب مغرب کے لیے مشرق یورپ ایک نیا میدان بن چکا تھا۔ جرمنی اور امریکہ نے موقع دیکھا کہ اس پرانی سو شلسٹ ریاست کے انهدام سے وہ اپنا اثر و رسوخ بڑھا سکتے ہیں۔

یہ قصہ سنہ 1991 میں شروع ہوا۔ اور یہ سب اچانک نہیں تھا بلکہ ایک منظم سازش کا نتیجہ تھا۔ پہلے سلووینیا اور کروشیا نے آزادی کا اعلان کیا۔ بلغراد میں سلوبودان میلوزووچ نے فوج بھیجا تاکہ وفاق کو بچایا جاسکے، مگر جرمنی نے فوراً اپنا وزن علیحدگی پسندوں کے پلٹرے میں ڈال دیا۔ جرمنی نے یورپی برادری پر بھی دباؤ ڈالا کہ وہ ان نئی ریاستوں کو تسلیم کرے۔ باقی یورپی

مالک بچکا رہے تھے، مگر آخر کار جرمی کی خلاف کے آگے جھک گئے۔ جنوری 1992 میں یورپی کمیونٹی نے کروشیا اور سلووینیا کو تسلیم کر لیا۔ امریکہ نے بھی کچھ دیر بعد یہی کیا۔ اس فصیلے نے باقی ماندہ یوگوسلاویہ کو سیدھا خانہ جنگی کی طرف دھکیل دیا۔ بوسنیا میں تین قویتیں، مسلمان، کروٹس اور سرب، آمنے سامنے آگئیں۔ یہ کابنا ہوا ملک تیزی سے آگ و خون میں ڈوبنے لگا۔

بوسنیا کی جنگ میں عالمی طاقتوں کا کردار شرمناک حد تک متصاد تھا۔ اقوام متحده نے ہتھیاروں کی پابندی لگا دی، مگر اس سے نقصان صرف بوسنین مسلمانوں کو ہوا، کیونکہ سربوں کے پاس پرانی یوگوسلاوی فوج کا اسلحہ پہلے سے موجود تھا۔ یورپ نے مسلمانوں کے ہاتھ باندھ کر انہیں مرنے کیلئے سرب فوج کے سامنے پھینک دیا۔ اور خود تمثالتی بن کر ایک سائیڈ پریمیٹھ گئے۔ جرمی اور فرانس سیاسی بیان دیتے رہے، مگر عملی اقدام سے گریز کرتے رہے۔ تب امریکہ نے پس پردہ مداخلت شروع کی۔ کلینٹ انتظامیہ نے ایک خاموش پالیسی اختیار کی جسے واشنگٹن میں "آنیز وائیڈ شٹ" کہا گیا۔ یعنی بظاہر اقوام متحده کی پابندی کو تسلیم کرنا، مگر عملی طور پر ایران اور دیگر اسلامی ممالک کو اسلحہ بچانے کی اجازت دینا تاکہ بوسنیا کے مسلمانوں کا دفاع ممکن ہو۔ اس بہت دیر سے کئے گئے خفیہ تعاون کے بعد بھی جب مسلمانوں کا قتل عام نہ رکا تو آخر کار امریکہ نے براہ راست مداخلت شروع کی۔

سنہ 1994 میں امریکہ نے بوسنین اور کروشین فورسز کو ایک ساتھ منظم کیا۔ امریکی کنٹریکٹرز نے ان کی تربیت شروع کی، جدید اسلحہ فراہم کیا گیا، اور میدان جنگ کا توازن یکسر بدلتا گیا۔ جب بوسنین سرب کمزور پڑے تو امریکہ نے نیٹو کے ذریعے فضائی کارروائیاں شروع کر دیں۔ پھر سب کو ڈیٹن، اوایو کے اڈے پر اکٹھا کیا گیا، جہاں رچرڈ ہالبروک نے ایک پیچیدہ امن معاملہ کروایا۔ یہ امن دراصل ایک محمد تقسیم تھی جس نے بوسنیا کو ایک ایسی ریاست میں بدل دیا جو آج تک خود مختاری اور تقسیم کے درمیان لٹکی ہوئی ہے۔ یورپ نے اپنی ناکامی تسلیم کی اور امریکہ براعظم کا نیا ثالث بن کر ابھرا۔

اسی دوران امریکہ نے کروشیا کے ساتھ خفیہ فوجی تعاون بڑھا دیا۔ سنہ 1995 میں آپریشن اسٹورم کے نام سے ایک بڑی کارروائی ہوئی جس نے کروشیا کے اندر موجود سرب علاقوں کو ختم کر دیا۔ امریکی سیٹلات، انٹلی جنس اور اسٹریجیک مشاورت نے اس کارروائی کو ممکن بنایا۔ یہ فوجی کارروائی ایک انسانی المیہ ثابت ہوئی۔ دو لاکھ سے زیادہ سرب شہری اپنے گھروں سے

بھاگنے پر مجبور ہوئے۔ یہ مظالم واشنگٹن کی نگرانی میں ہوئے کیونکہ انہیں میلوزووچ کے خلاف ایک فیصلہ کن کامیابی چاہئے تھی۔ جغرافیائی فائدہ انسانی نقصان سے زیادہ اہم سمجھا گیا۔

اب میدان کوسوو کا تھا۔ سربیا کا جنوبی صوبہ، جہاں اکثریت البانوی مسلمانوں کی تھی۔ کوسوو لبریشن آرمی نے بغاوت شروع کی، سرب فوج نے بے رحمانہ جوابی کارروائیاں کیں، اور یورپ دوبارہ بے بس ہو گیا۔ امریکہ نے فیصلہ کیا کہ اب براہ راست کارروائی ہو گی۔ سنہ 1999 میں رامبولیے مذکرات میں سربیا پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ اپنی سرزین پر نیٹو کی موجودگی قبول کرے۔ میلوزووچ نے انکار کیا۔ پھر نیٹو نے بغیر اقوام متحده کی منظوری کے یوگوسلاویہ پر حملہ کر دیا۔ روس اور چین نے مخالفت کی، مگر امریکہ نے ایک نئی مثال قائم کر دی کہ اگر کوئی قرارداد نہ ملے تو بھی مغرب اپنی مرضی سے جنگ کر سکتا ہے۔

بلgrad، نیش، اور نووی ساد جیسے شہر بمباری سے تباہ ہو گئے۔ بجلی گھر، ریلوے، ہسپتال سب نشانہ بنے۔ سربیا کی معیشت زین بوس ہو گئی۔ مگر جنگ کے دوران ہی لاکھوں کوسوو البانوی اپنے گھروں سے نکال دئے گئے، امریکہ اور اسکے چند اتحادیوں نے اپنے مفاہات حاصل کرنے کیلئے ایک کے بعد ایک انسانی لمبے کو جنم دیا۔ آخر کار روس نے ثالثی کی، سربیا نے فوج واپس بلائی، اور کوسوو کو اقوام متحده کی نگرانی میں دے دیا گیا۔ نیٹو کی افواج وہیں رہ گئیں اور امریکہ نے فوری طور پر اپنا اڈہ "کیمپ بانڈ سٹیل" قائم کر لیا۔ یہ صافیہ یغام تھا کہ اب بالکن میں طاقت کا توازن ہمیشہ کے لیے مغرب کے حق میں جھک چکا ہے۔

ان تمام جنگوں کے اثرات گھرے اور طویل المیعاد تھے۔ یوگوسلاویہ چھ نئی ریاستوں میں بٹ چکا تھا، مگر زخم ابھی تازہ تھے۔ ایک لاکھ تیس ہزار سے زائد لوگ مارے گئے، لاکھوں بے گھر ہوئے، ہزاروں عورتوں کی عصمت دری ہوئی، اور کروڑوں انسان غربت میں دھکیل دیے گئے۔ امریکہ فاتح کے طور پر ابھرا، مگر یورپ کی اخلاقی چیزیں ختم ہو گئی۔ اقوام متحده بے بسی کے تصویر بنی طاقت کا یہ کھیل دیکھنے پر مجبور تھی، اور نیٹو ایک سیاسی ہتھیار بن گیا۔ اس دوران جنگی جرائم کے مقدمے شروع ہوئے، میلوزووچ اور دوسرے سرب رہنمادی ہیگ میں پیش کیے گئے۔ مگر کسی نے یہ نہیں پوچھا کہ جرمی اور امریکہ نے یہ آگ بھڑکائی ہی کیوں؟

امریکہ کے لیے یہ صرف یوگوسلاویہ کی جنگ نہیں تھی، بلکہ ایک تجربہ گاہ تھی۔ انہوں نے پہلی بار دیکھا کہ کس طرح میڈیا، سفارت کاری، این جی اوز، اور محدود فوجی طاقت کو ملا کر کسی ریاست کے اندر تبدیلی لائی جا سکتی ہے۔ یہی ماڈل بعد میں سربیا

یہ استعمال ہوا جب سنہ 2000 میں میلوزووج کے خلاف "بلڈوزر ریولوشن" ہوتی۔ اس انقلاب کے پچھے امریکی اداروں کی فنڈنگ اور تربیت تھی۔ اوپر نامی نوجوان تحریک نے واشنگٹن کے پیسوں سے وہی حرbe اپناتے جو بعد میں یوکرین، جارجیا اور دیگر جگہوں پر نظر آئے۔

آج جب ہم بالکن کی طرف دیکھتے ہیں تو اس امریکی ویورپی تجربے کے اثرات اب بھی موجود ہیں۔ سنہ 2008 میں کوسوو نے یکطرفہ آزادی کا اعلان کیا۔ امریکہ نے فوراً تسلیم کیا، مگر سربیا، روس، چین اور کئی ویورپی ممالک نے انکار کر دیا۔ روس نے اسی نظیر کو بنیاد بنا کر ابخازیا، جنوبی اوسیتیا، کریمیا اور یوکرین کے علاقوں کو تسلیم کرنے کا جواز بنایا۔ مغرب کہتا ہے کوسوو منفرد معاملہ ہے، مگر ماسکو اسے دو غلائیں قرار دیتا ہے۔ یہی تضاد آج کی دنیا کے بڑے تناظروں کی جڑ ہے۔

بوسینیا اب بھی غیر مستحکم ہے۔ سرب رہنماء کھلے عام علیحدگی کی بات کرتے ہیں۔ کروشیا اور سربیا کی سرحدوں پر اب بھی تلنخی باقی ہے۔ امریکہ کا اثربدستور قائم ہے، مگر وہ امن جو نیٹو نے بندوق کے زور پر قائم کیا تھا، وہ اصل استحکام کبھی نہ بن سکا۔ یہ امن ایک عارضی وقفہ ہے، جس کے نیچے پرانے زخم ابھی بھرے نہیں۔ جرمنی اور امریکہ نے جس تیزی سے یوگوسلاویہ کو ٹکڑوں میں بانتا، اسی جلدی میں انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ قومی شناختیں کاغذی سرحدوں سے دبائی جا سکتی ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ نسلی نفرت اور تاریخی جھگڑے کسی بیرونی طاقت کے منصوبوں سے نہیں ملتے۔

یوگوسلاویہ کا ٹوٹنا مغرب کی اس پالیسی کی علامت ہے جس میں "جمهوریت" اور "انسانی حقوق" کے نعرے لگا کر مکمل اجارہ داری قائم کی جاتی ہے۔ امریکہ نے ان جنگلوں سے جو سبق سیکھا، وہ یوکرین، شام اور مشرق وسطیٰ کی پالیسیوں میں نظر آتا ہے۔ جرمنی نے جس خود اعتمادی سے کروشیا کی آزادی منوائی، وہی خود اعتمادی آج ویورپی یونین کی روس کے خلاف پالیسیوں میں جھلکتی ہے۔

دوستو مغرب کی مداخلتیں اس وجہ سے نہیں تھیں کہ ان ملکوں میں رفتیں تھیں، کرپشن تھی یا پھر ڈکٹیٹر شپ تھی، وہ مداخلتیں اپنے مفادات کیلئے تھیں۔ اگر امریکہ حقیقتاً اصولوں پر چل رہا ہوتا تو غرہ میں انسانی حقوق کی پامالی پر بھی کچھ کرتا۔ روانڈا میں صرف سو دنوں میں دس لاکھ لوگ قتل کئے گئے تھے امریکہ کے کام پر جوں تک نہیں رینگی تھی۔ صدام اور قذافی اگر ڈکٹیٹر تھے تو جزل سیسی، پنوشے، عرب بادشاہتیں، مسلمان جزر اور اب الجولانی جیسے لوگ کیا ہیں؟ یوگوسلاویہ میں اندر ہونی نفترتوں اور

تھیں تھا، بلکہ یہ مغرب کی نئی عالمی حکمت عملی کا آغاز تھا، جس میں ہر کمزور ریاست ایک "پروجیکٹ" بن گئی۔ یہی مغربی ایمپائر کا اصل چہرہ ہے۔

-----**فائل EU-18 کا اختتام**-----

ملک: جارجیا

سال: 2003

فائل: EU-19

---

یہ سنہ 2003 کی بات ہے۔ جارجیا کے صدر ایڈورڈ شیورڈناذے جب پارلیمنٹ کا اجلاس شروع کرنے جا رہے تھے تو ایک نوجوان لیڈر مائیکل ساکاشویلی ایک سرخ گلبہر ہاتھ میں لے کر سیدھا اسٹیچ پر پہنچ گیا اور صدر کو بولنے نہیں دیا۔ اس نے سپیکر کی گھہ سنبھال کر اعلان کیا کہ حکومت عوامی ینڈیٹ کھوچکی ہے۔

یہ کوئی مقامی انقلاب نہیں تھا بلکہ امریکہ کا وہ طے شدہ ڈرامہ تھا جو کروڑوں ڈالرز خرچ کر کے پارلیمنٹ کے اسٹیچ پر ایکٹ کیا گیا۔ جارجیا روس کا پڑوسی ملک ہے جو سوویت یونین کے ٹوٹنے کے بعد آزاد ہوا تھا۔ یہاں کے صدر ایڈورڈ شیورڈناذے سابق سوویت وزیر خارجہ رہ چکے تھے۔ انہوں نے سوویت دور کے بعد ایک نہایت کمزور اکانومی کو سنبھالا مگر ایک طرف تو جارجیا کے معاشی مسائل بہت شدید تھے اور دوسری طرف مغربی سازشیں عروج پر تھیں۔ اسکے علاوہ سابق سوویت یونین کی دوسری ریاستوں کی طرح جارجیا میں بھی سرمایہ دارانہ نظام والی لوٹ مار شروع ہو چکی تھی اور عوام غریب ہوتے جا رہے تھے۔ ایڈورڈ شورڈناذے روس کے ساتھ اچھے تعلقات برقرار رکھنا چاہتے تھے، اور یہی وہ بات تھی جو امریکہ کو قبول نہیں تھی۔

امریکہ نے فیصلہ کیا کہ جارجیا میں ایک ایسی حکومت لانی ہے جو روس سے دور ہو کر نیٹو اور یورپی یونین میں شامل ہو۔ اس مقصد کے لیے امریکی اداروں یو ایس ایڈ اور نیشنل اینڈ منٹ فارڈیمو کریسی نے کروڑوں ڈالرز خرچ کیے۔ یہ سے ہتھیاروں پر نہیں بلکہ طلبہ کی تنظیموں، میڈیا اور این جی اوز پر لگایا گیا۔ ایک طلبہ گروپ کمارا جس کا مطلب تھا "بس کرو" بنایا گیا، جنہیں سرمایہ کی تحریک کے طریقوں پر تربیت دی گئی۔ امریکہ نے ٹی وی چینل رستاوی ٹو کو بھی مالی مدد دی جو روزانہ حکومت کے خلاف پروپیگنڈا کرتا تھا۔

دو نومبر 2003 کے پارلیمانی انتخابات میں دھاندی کا بہانہ بنایا گیا۔ درحقیقت یہ دھاندی امریکی منصوبے کا حصہ تھی۔ مائیکل ساکا شویلی جو امریکہ میں پڑھا تھا اور جسے امریکہ اور اتحادیوں کی مکمل حمایت حاصل تھی، ہزاروں لوگوں کو سڑکوں پر لے آیا۔ باقیس نومبر کو وہ اپنے حامیوں کے ساتھ پارلیمنٹ میں گھس گیا۔ صدر شیوروناڈزے نے دیکھا کہ امریکی سفارتکار کھلم کھلانے والوں کے ساتھ کھڑا ہے، تو انہوں نے فوری طور پر استعفی دے دیا۔

اس کے بعد جو ہوا وہ تاریخ کا ایک المیہ ہے۔ ساکا شویلی صدر بنا اور فوری طور پر نیٹو میں شمولیت کا اعلان کر دیا۔ اس نے روس کے حامی علاقوں ابخازیا اور جنوبی اوسیشیا پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ روس جانتا تھا کہ اس سازش کے پچھے امریکہ اور اسکے نیٹو اتحادی ہیں۔ اس جاریت نے صدر پوتن کی برداشت ختم کر دی۔

سوویت یونین کے بکھر نے پر امریکہ نے رو سی قیادت کو بار بار یہ یقین دہانی کروائی تھی کہ نیٹو اتحاد مشرق کی طرف ایک انج بھی نہیں بڑھے گا۔ لیکن کلنٹن نے اقتدار میں آتے ہی نیٹو کو پھیلانا شروع کر دیا۔ حتیٰ کہ وہ روس کے سرحدی ملک جارجیا تک آن پہنچے۔ روس کو یہ چیز اسی قدر ناقابل قبول تھی جس قدر امریکہ کو کیوں میں رو سی میزائل نصب کرنا ناقابل قبول تھا۔ آگست 2008 میں روس نے جارجیا پر حملہ کر دیا۔ صرف پانچ دن کی جنگ میں جارجیا کی فوج کو شکست ہوئی۔ امریکہ نے ساکا شویلی کی کوئی مدد نہ کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جارجیا کے یہس فیصد علاقے پر روس نے قبضہ کر کے اسے آزاد ملک تسلیم کر لیا۔

آج جارجیا کی حالت بہت خراب ہے۔ ملک دو حصوں میں بٹ چکا ہے۔ ساکا شویلی کو بعد میں ملک سے بھاگنا پڑا۔ بعد میں آنے والی حکومت روس کے ساتھ تعاون کر رہی تھی مگر وہاں ایک بار پھر حالات خراب کئے جا رہے ہیں۔ مغرب نے عوام پر اس قدر پروپیگنڈہ انوسمٹنٹ کر رکھی ہے کہ انکی اکثریت نیٹو میں شامل ہونے کی خواہش رکھتی ہے، مگر عملاً یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ روس یہ نہیں ہونے دے گا۔

امریکہ نے جارجیا کو استعمال کیا، اپنا مفاد حاصل کیا، اور پھر چھوڑ دیا جسیے وہ سب کے ساتھ کرتا آیا تھا اور جسے آج ہم یو کرین میں دیکھ رہے ہیں۔ میں سمجھتا تھا کہ سب سے زیادہ ظلم اور دھوکا پاکستان کے ساتھ ہوا ہے، لیکن مغرب نے کم از کم اس حوالے سے مکمل انصاف کیا ہے۔ مغرب نے سبھی حلیفوں کو استعمال کر کے برابر کا دھوکہ دیا ہے۔ کسی کو نہیں بخشا۔



ملک: یوکرائن

سال: 2014

فائل: EU-20

فوری 2014 میں کیف کی سڑکوں پر گولیاں چل رہی تھیں، صدر یا نوکو وچ ملک چھوڑنے پر مجبور کرنے گئے تھے اور روس کے دروازے پر امریکی حمایت سے ایک کٹھ پتلی حکومت قائم کی جا رہی تھی۔ دوستونہ تو یہ کوئی مقامی تحریک تھی اور نہ ہی کوئی سیاسی انقلاب تھا، بلکہ یہ روس کے خلاف فیصلہ کن مجاز آرائی کا آغاز تھا، ایک نئی عالمی جنگ کا آغاز، جس کے اثرات آج تک ختم نہیں ہوئے۔ یہ سب اچانک نہیں ہوا تھا۔ یوکرین میں مداخلت کی سازش سوویت یونین کے انهدام کے ساتھ ہی شروع ہو چکی تھی۔ اس سازش پر عمل درآمد کیلئے پہلا قدم سنہ 2004 میں اٹھایا گیا تھا جب امریکہ اور اسکے اتحادیوں نے یوکرین کے سیاسی، عسکری اور جنرالی ڈھانپے کو ایک نئی سمٹ میں موڑ دیا تھا۔

پس منظر سمجھنا ضروری ہے۔ سوویت یونین کے خاتمے کے بعد 1991 میں یوکرین آزاد ہوا تو بظاہر ایک نیا ملک تھا مگر اندر سے ٹوٹا ہوا، دو شناختوں کے درمیان پھنسا ہوا۔ مغربی یوکرین یورپ سے جڑا، قوم پرست اور مغربی اقدار کا حامی تھا، جبکہ مشرقی اور جنوبی حصے روس سے تاریخی، لسانی اور معاشی طور پر وابستہ تھے۔ سیواستپول میں روس کا بھری اڈہ اس تعلق کی علامت تھا۔ یوکرین کی سیاست ایک نازک توازن پر قائم تھی، ایک طرف ماسکو کے ساتھ صدیوں پر انادیرینہ تعلق اور دوسرا طرف مغرب کی مسلسل کھینچاتانی اور جھوٹی کشش۔ ان دو طاقتوں کے درمیان کرپشن زدہ سیاست دان بیٹھے تھے جو دونوں طرف کے مفادات سے کھیل رہے تھے۔ یہ توازن سنہ 2004 کے صدارتی انتخابات میں ٹوٹ گیا۔

یہ وقت تھا جب دو متضاد نظریات آمنے سامنے آگئے۔ ایک طرف روس کے حامی وزیر اعظم وکٹریا نوکو وچ، دوسرا طرف مغرب نواز امیدوار وکٹریو شیپکنکو۔ جب سرکاری نتائج میں یا نوکو وچ کو فاتح قرار دیا گیا تو پورے ملک میں احتجاج پھوٹ پڑا۔ یہ مظاہرے کوئی عام عوامی رد عمل نہیں تھے بلکہ برسوں کی امریکی تیاریوں کا نتیجہ تھے۔ امریکہ نے یو ایس ایڈ، نیشنل اینڈ منٹ فار

ڈیموکریسی اور دیگر اداروں کے ذریعے کروڑوں ڈالریوں کے سول سوسائٹی نیٹ ورکس میں ڈال رکھے تھے۔ این جی او، میڈیا اور نوجوانوں کے گروپس کو باقاعدہ تربیت دی گئی تھی کہ کیسے موثر احتجاج منظم کیے جاسکتے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں نوجوان تحریک "پورا" تھی، جو سربیا کی تحریک "اوٹپور" کے ماذل پر بنی تھی۔

امریکی سی آئی اے کی لیبارٹری میں تیار کردہ اس تحریک نے کیف کی سردوں کو ایک سیاسی طوفان میں بدل دیا۔ عوامی دباؤ اور مغربی حمایت کے زیر اثر دوبارہ ایکشن کروائے گئے اور یو شپنکو صدر قرار پایا۔ امریکی پالیسی سازوں نے اسے جمہوریت کی فتح قرار دیا، مگر حقیقت یہ تھی کہ ایک سیاسی انخیمنگ تھی جس نے یو کرائن کو ماسکو سے دور اور نیٹو کے قریب کر دیا۔ یو شپنکو کی حکومت بعد میں اندرونی اختلافات اور کرپشن کے باعث کمزور پڑی، اور یانوکو وچ 2010 میں دوبارہ صدر بن گئے، لیکن مغربی اتحادیوں کے لیے یو کرائن ایک ایسا محاذ تھا جسے بند نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اصل تصادم دس سال بعد شروع ہوا۔ سنہ 2013 کے آخر میں یانوکو وچ نے یورپی یونین کے ساتھ ایک معابدے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اس معابدے کو یو کرین کی مغرب سے وابستگی کی علامت سمجھا جا رہا تھا۔ لیکن روس کے ساتھ دوستی میں یانوکو وچ حکومت نے پچھے ہٹنے کا فیصلہ کیا۔ بس یہ وہ لمحہ تھا جب پورا منظر بدل گیا۔ مغربی فنڈنگ اور سیاسی انخیمنگ سے کیف میں مظاہرے شروع ہوئے جنہیں ریاست نے کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔ اس سیاسی مقام سے کسی بھی تحریک کو انقلاب میں تبدیل کرنے کی صلاحیت مغرب پچاس سال پہلے ہی حاصل کر چکا تھا۔ یہ فارمولہ مغرب نے درجنوں بار آزمایا تھا۔ ایران کے محمد مصدق کے خلاف، پاکستان کے بھٹو کے خلاف، چلی میں پنوشے کے ذریعے، انڈونیشیا میں سہارتو کو استعمال کر کے مغرب کی مداخلت سے جلد ہی اس پر ریاستی تشدد کا ٹیک لگا دیا گیا جس نے اس تحریک کو عوامی بغاوت میں بدل دیا۔ سینکڑوں لوگ مارے گئے اور احتجاج بڑھتا گیا۔

امریکہ کی پالیسی واضح تھی۔ کھل کر مظاہرین کی حمایت، سیاسی یہادات، مالی امداد اور سفارتی دباؤ۔ امریکی سینئر جانکیں کیف کے میدان میں عوام کے ساتھ موجود جہوریت اور آزادی کے نعرے لگا رہا تھا، مگر پردوے کے پچھے ایک اور کھیل چل رہا تھا۔

امریکی عہدیدار و کثوریا نویں کی ایک ہونے والی کال نے سب کچھ کھول کر رکھ دیا۔ وہ امریکی سفیر کے ساتھ بات کرتے ہوئے نئی حکومت کے لیے اپنے پسندیدہ امیدواروں پر بات کر رہی تھی، یہاں تک کہ یورپی اتحادیوں کو ایک گالی دے کر مسترد کر رہی تھی۔ اس کال نے روسی خدشات کو دنیا بھر میں حقیقت بنا کر پیش کر دیا کہ یہ انقلاب دراصل ایک امریکی منصوبہ ہے۔ فروری 2014 میں حالات اس قدر بگاڑ دئے گئے کہ یا نو کو وجہ کو روس فرار ہونا پڑا اور ایک نئی کٹھپتی حکومت بنادی گئی۔ ماسکو کو مجبوراً اپنے دفاع کیلئے انتہائی قدم اٹھانے پڑے۔ روس نے کریمیا میں چند ہفتوں میں ریفرنڈم کروائے اسے روس میں شامل کر لیا۔ یوکرائن کی ملٹری نے مشرقی علاقوں میں روسی زبان بولنے والوں کے خلاف آپریشن شروع کیا جس کے جواب میں با غی گروہ سامنے آئے جنہیں ماسکو نے اپنے دفاع کیلئے ہتھیار فراہم کئے۔ اس طرح ایک نئی جنگ شروع ہوئی جس نے اگلے آٹھ سال میں چودہ ہزار سے زیادہ جانیں لے لیں۔

اس دوران امریکہ نے یوکرائن کو ہتھیاروں سے نہیں بلکہ ایک مکمل عسکری نظام سے لیس کرنا شروع کیا۔ یوکرائن میں امریکی سی آئی اے نے متعدد بیسز قائم کیں۔ سنہ 2014 کے بعد سے یوکرینی فوج کو از سر نو تربیت دی گئی۔ امریکی افسران نے مغربی جنگی اصولوں کے مطابق ان کی تنظیم نوکی، نیٹو کے ساتھ مشترک مشقین کی گئیں، اور انہیں جدید اسلحہ فراہم کیا گیا۔ اس منصوبے کے تحت یوکرین کو نیٹو کے معیار کے مطابق ایک فوجی طاقت میں بدل دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ سب روس کی سلامتی کے لیے براہ راست خطرہ تھا۔ اس سازش کا نشانہ شروع ہی سے روس تھا۔

سنہ 2021 کے آخر تک پوتن کے لیے تصویر واضح تھی۔ ایک مغربی تربیت یافتہ فوج، امریکی اسلحہ، اور کیف میں نیٹو کے اتحادی، یہ سب روس کے دروازے پر کھڑے تھے۔ روس پر یہ جنگ مسلط کی جا چکی تھی۔ نتیجہ وہی نکلا جو دنیا نے 2022 میں دیکھا، اس سے پہلے کہ نیٹو اتحادی یوکرائینی پر اکسی کے ذریعے روس پر چڑھ دوڑتے، روس نے حملہ کر کے یوکرائینی فوجوں کو پچھے دھکلیل دیا۔ مغرب نے فوراً اپنی عالمی پروپیگنڈہ مشینری کو میدان میں اتارا۔ یہ تاثر دیا گیا کہ روس نے یورپ کو دوسری جنگ عظیم کے بعد کی سب سے بڑی جنگ میں جھونک دیا ہے۔ اس جنگ کے شروع میں یہ تاثر دیا جاتا رہا کہ روس اقتصادی طور پر دیوالیہ ہونے والا ہے۔ اتحادی یہ جنگ جیت جائیں گے۔ روس کے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ امریکہ اور یورپ خود دیوالیہ ہونے کے قریب پہنچ چکے ہیں اور یوکرائن کے مسئلے پر آپس میں ال جھتے نظر آتے ہیں۔

امریکہ کی موجودہ قیادت اس جنگ سے نکلا چاہتی ہے۔ یورپی مالک کسی بھی قیمت پر روس کو شکست دینا چاہتے ہیں۔ یوکرائن میں پسپائی کا مطلب پورے مشرقی یورپ میں سے پسپائی ثابت ہو سکتا ہے۔

اس دہلی کے اثرات بہت گہرے تھے۔ سیاسی طور پر یوکرین میں مغربی کٹھپتلی حکومت کی تعیر مکمل ہو چکی تھی۔ جس طرح امریکہ نے مغربی جرمی، اٹلی اور یونان میں جمہوری اداروں کے ذریعے مکمل کنٹرول کا نظام بنایا تھا وہی نظام یوکرائن میں بنانے کا مخالف نظریات کا نام و نشان ہی مٹا دیا گیا۔ یوکرائن میں روسی زبان بولنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ یوکرائن میں ایک بہت بڑی آبادی روس سے اچھے تعلقات رکھنا چاہتی ہے مگر وہ نقطہ نظر ہی مکمل طور پر ختم کر دیا گیا۔ اور یوکرائن نے اپنی شناخت روس کے مخالف کے طور پر مکمل کر لی۔ اب وہ ملک جو کبھی ایک بہترین توازن کے ساتھ چل ہا تھا مغرب کی کٹھپتلی بن چکا ہے۔ چند سال پہلے روس کا دوست ملک اس وقت امریکہ اور یورپی مالک کے اشارے پر روس کے ساتھ جنگ میں اپنے شہریوں کو ایسے جھونک رہا ہے جیسے کسی بھٹی میں کونہ پھیکا جاتا ہے۔ مغرب نے یوکرین کے ذریعے پر اکسی وار لڑکے روس کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ امریکہ اور یورپ کے لیے شروع میں، یہ ایک بڑی کامیابی ثابت ہوئی، کیونکہ بغیر اپنے فوجی میدان میں اتارے انہوں نے روس کو الجھایا تھا۔

اس سازش کا سب سے بڑا نقصان یوکرائن کو اٹھانا پڑا، مغربی مفادات کی قیمت بہت بھاری ثابت ہوئی۔ لاکھوں لوگ بے گھر ہو گئے، شہر اجڑ گئے، معیشت تباہ ہو گئی اور پورا معاشرہ ایک طویل جنگ میں جھونک دیا گیا۔ عالمی سطح پر اس جنگ نے تو انائی اور خوارک کے بھراں پیدا کیے، اور مغرب و مشرق کے درمیان ایک نئی تقسیم کھڑی کر دی۔ چین اور بھارت سمیت خط کے دیگر ممالک اب اسی تقسیم کے درمیان اپنی جگہ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

سنہ 2004 سے 2014 تک کا یہ پورا سلسلہ آج کی جنگ کی جڑ ہے۔ امریکی حکمتِ عملی نے یوکرین کو ایک ایسے تنازع میں دھکیل دیا جس کے اثرات شاید کئی نسلوں تک ختم نہ ہوں۔ یورپ اسوقت تیزی سے زوال کا شکار ہے۔ کریمیا، دونباس، اور کئی علاقے یوکرائن کے ہاتھ سے نکل چکے ہیں اور یہ سلسلہ رک نہیں پا رہا۔ ایسے لگ رہا ہے کہ اگر یوکرائن بچا بھی تو ایک بالکل مختلف جغرافیائی شکل میں بچے گا۔ آج یہ بات روس کے ساتھ ساتھ پوری دنیا پر واضح ہو چکی ہے کہ مغرب روس کو توڑنے کی

ہم پر ہے۔

آج جب آپ یو کرائن کی جنگ کو دیکھتے ہیں تو آپ کو سمجھنا چاہیے کہ یہ کہانی بچھلے چند مہینوں یا برسوں کی نہیں بلکہ اس وقت کی ہے جب امریکہ نے پہلی بار یو کرائن کی سیاست میں برداشت مداخلت کی اور ایک پ्रامن قوم کو اپنے مفادات کی خاطر جنگ کی راہ پر ڈال دیا۔ اس مداخلت نے صرف یو کرائن ہی کو نہیں بلکہ پورے مشرقی یورپ کو جنگ کے قریب پہنچا دیا ہے۔

آج جب ٹرمپ یو کرائن میں امن کی بات کرتا ہے تو وہ یہ کام چین کے ساتھ جنگ کی تیاری کیلئے کر رہا ہے۔ یہ بات بھی پوری دنیا جان چکی ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ ابرہیم معاهدے کی ذریعے زبردستی کی دوستی ہو یا پھر دنیا بھر میں جنگ بندیوں کی کوششیں، سب ایک ڈرامہ ہے۔ یہ فیصلہ کن جنگ شروع کرنے سے پہلے کی تیاری ہے۔ صدیوں پرانا یورپی سامراج اس وقت خطرے میں ہے۔ انہیں اس خطرے سے نمٹنے کا واحد راستہ جنگ ہی میں نکلتا دکھائی دیتا ہے۔

-----فائل EU-20 کا اختتام-----

## تجزیہ

یہاں سے آخری باب شروع ہوتا ہے جو سب سے اہم ہے۔ اس باب میں ہم تجزیہ کریں گے کہ ورلڈ وار 2 کے بعد مغربی ممالک نے دنیا بھر میں جو کچھ کیا، اس کے محکمات کیا تھے۔ اور ان اقدامات کے کیا نتائج نکلے اور دنیا پر کیا اثرات مرتب ہوئے۔ چار برا عظموں میں ہونے والے 80 سے زیادہ بڑے واقعات کی مختصر کہانیاں پڑھ کر آپ یہاں تک پہنچے ہیں۔ ان واقعات کے تجزیے سے ہمیں 13 ایسے پہلو نظر آتے ہیں جنہیں مغرب نے اپنی خارجہ پالیسیز کا حصہ بنایا، جن کے دنیا پر بہت منفی اثرات پڑے۔

اس باب میں آپ ان تیرہ اہم ترین پہلوؤں کے متعلق جانیں۔ جہوری حکومتوں کو کیسے ہٹایا گیا، ظالم ڈلٹیئرز کی مدد کیوں اور کیسے کی گئی، معاشی لوٹ مار کیسے ہوئی، ذہنوں کی جنگ کیسے لڑی گئی، اور قانون کے دو الگ الگ پیمانے کیسے استعمال ہوئے۔ اس تجزیے میں ہم واقعات گنے پر اکتفا نہیں کریں گے بلکہ گہرائی میں جا کر ان واقعات میں چھپے ٹرینڈز کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔ آپ کوپتہ چلے گا کہ طاقت کیسے استعمال ہوئی، سیاسی مقاصد کیا تھے، اور اخلاقی طور پر کتنا بڑا اتضاد موجود تھا۔

اس باب کا مقصد یہ ہے کہ آپ کے سامنے ایک مکمل اور سچی تصویر آجائے۔ آپ خود دیکھ سکیں کہ مغربی طاقتیں کیا کہتی ہیں اور اصل میں کیا کرتی ہیں، اور ان دونوں میں کتنا فرق ہے۔

آئے ان تیرہ پہلوؤں کی روشنی میں مغربی جہوریت، امن و آزادی اور انسانی حقوق کے دعووں کا جائزہ لیں۔

## مغرب کا جاسوسی کا نظام:

دوسری عالمی جنگ کے دوران تشكیل پانے والے مغربی جاسوسی کے سڑکرنے دنیا کی طاقت کے توازن کو مغربی سامراج کے حق میں موڑ دیا تھا۔ اس کی ابتداء اس وقت ہوئی جب برطانیہ اور امریکہ کے خفیہ کوڈ توڑنے والے ماہرین نے 1941ء میں پہلی مرتبہ اپنی معلومات کا تبادلہ کیا۔ برطانوی ماہرین نے بتایا کہ وہ جرم "انگلما" کوڈ توڑ چکے ہیں جبکہ امریکیوں نے جاپان کے "پرپل" سفارتی ساقفر کی تفصیلات شیئر کیں۔ یہ باہمی اشتراک ایک ایسے معابدے میں ڈھل گیا جو 1946ء میں "یوکے" یا اسے ایگر یمنٹ کہلا�ا۔ اس کے تحت امریکہ اور برطانیہ کی خفیہ اجنبیسیاں ایک مشترک سکنڈ انٹلی جسٹ نیٹ ورک میں جڑ گئیں۔ بعد میں کینڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ بھی شامل ہوئے، اور یہ نظام "فائیو آئیز" کے نام سے جانا جانے لگا۔

یہ اتحاد محض معلومات کے تبادلے تک محدود نہ رہا بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ ایک ہمہ گیر نگرانی کے سڑکریں تبدیل ہو گیا۔ سرد جنگ کے دوران "اچیلن" کے نام سے ایک وسیع پروگرام کے ذریعے سوویت یونین کے گرد نگرانی کے اڈے قائم کیے گئے۔ ان مراکز نے زمینی، فضائی اور سیٹلائزڈ ریئن سے لاکھوں پیغامات روزانہ حاصل کرنا شروع کیے۔ جیسے جیسے ٹینکنالوجی ترقی کرتی گئی، یہ نظام ٹیلی فون، فیکس، انٹرنیٹ اور فاہر آپلک نیٹ ورکس تک پھیل گیا۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد جب نظریاتی دشمن غائب ہو گیا، تو مغربی خفیہ اداروں نے اپنا رخ دہشت گردی، مشرق وسطیٰ کے تنازعات، اور ابھرتی ہوئی طاقتوں کی جانب موڑ دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نظام کسی مخصوص دشمن کے خلاف نہیں بلکہ مغربی سامراج کی اجارہ داری قائم رکھنے کے لیے کام کرتا ہے، جس کے مرکز میں مغربی طاقتوں کے سیاسی اور اقتصادی مفادات ہیں۔

سنہ 2001ء کے بعد یہ نیٹ ورک ایک نئی شکل میں ابھرا۔ نائن الیون کے بعد امریکہ، برطانیہ، اور ان کے اتحادیوں نے اپنی تمام خفیہ معلومات نیٹو کے دائرے میں کھول دیں۔ بڑے ٹیلی کمپنیکشن اداروں میں خفیہ آلات نصب کیے گئے جن کے ذریعے دنیا بھر کی ڈیجیٹل سرگرمیاں ریکارڈ ہونے لگیں۔ کینڈا نے ڈیٹا کے تجزیے کے نئے طریقے متعارف کرائے، آسٹریلیا کے اڈوں سے مشرق وسطیٰ کے علاقوں میں نگرانی کی جانے لگی، اور یورپی ممالک کو بھی اس ڈیٹا تک محدود رسائی دی گئی۔ اس اتحاد کا حقیقی مقصد دہشت گردی سے نہیں بلکہ معلومات کی بالادستی قائم رکھنا تھا۔ ڈیجیٹل دور میں طاقت کا اصل پیمانہ اب اس بات پر منحصر ہے کہ کون سا ملک زیادہ اور بہتر معلومات رکھتا ہے۔

اس نظام نے بین الاقوامی تعلقات میں ایک نئی درجہ بندی پیدا کی۔ اس کے تحت چند ممالک کو "سینکڑ پارٹی ٹرست" کا درجہ ملا۔ یہ وہ ممالک تھے جنہیں فائیو آئیز کے اندرونی حلقے تک جزوی رسائی ملی۔ ان پر کچھ حد تک اعتماد کیا گیا، اس لیے انہیں مغربی نظام میں شامل ہونا آسان ہوا۔ مثال کے طور پر، جاپان، جنوبی کوریا، یا نیٹو کے چند منتخب اتحادی سینکڑ پارٹی ٹرست کا حصہ ہیں، جبکہ باقی دنیا خود بخود شکوک و شبہات کے دائرے میں آگئی۔ فرانس اور جرمنی جیسے ممالک، جو مغربی دنیا کے قریبی اتحادی تھے، بھی اس اندرونی حلقے سے باہر رہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "فائیو آئیز" صرف ایک انسٹیلی جنس نیٹ ورک نہیں بلکہ ایک تہذیبی و سیاسی اتحاد ہے جس کی بنیاد انگریزی بولنے والی دنیا کی باہمی وابستگی پر ہے۔

معاشی اور ٹیکنالوجی کے میدان میں بھی اس اتحاد کے اثرات گھرے ہیں۔ جب چین نے یورپ میں اپنے "ہواوے" نیٹ ورک کی توسعہ کی کوشش کی، تو امریکہ اور برطانیہ نے اسے خفیہ معلومات کے خطرے کے طور پر پیش کیا۔ نتیجیہ نکلا کہ یورپ کے اکثر ممالک نے چین کو اپنے 5G نظام تک رسائی نہیں دی۔ بظاہریہ تجارتی فیصلہ تھا، مگر در حقیقت یہ خفیہ معلومات تک رسائی اور مغربی ڈیٹا پر کنٹرول برقرار رکھنے کا مستسلہ تھا۔ اس طرح مغرب نے ایک بار پھر ٹیکنالوجی کو سیاسی اثرورسون کے آئے کے طور پر استعمال کیا۔

تاہم مغرب کی اس کامیابی نے غیر مغربی طاقتوں کو اپنے دفاع کے نئے طریقے تلاش کرنے پر مجبور کر دیا۔ روس نے اپنی ابلاغی لائنیں مقامی سطح پر محدود کر لیں اور سیٹلاتٹ نظام "GLONASS" کے ذریعے مغربی نگرانی سے بچنے کی کوشش کی۔ چین نے "گریٹ فائز وال" کے ذریعے انٹرینیٹ ٹریک پر مکمل کنٹرول حاصل کیا تاکہ ملکی ڈیٹا یا رسائی رسائی سے محفوظ رہے۔ بھارت، برازیل اور جنوبی افریقہ نے تبادل "BRICS کیبل" تجویز کی تاکہ ان کی معلومات مغربی راستوں سے نہ گزرے۔ یہاں تک کہ یورپ میں بھی "کیا ایکس" جیسا منصوبہ سامنے آیا تاکہ یورپی ڈیٹا امریکی نگرانی سے محفوظ رہ سکے۔

یہ تمام اقدامات اس حقیقت کی تصدیق کرتے ہیں کہ معلومات کی طاقت اب فوجی قوت سے زیادہ اہم ہو چکی ہے۔ جو ملک اپنی ڈیجیٹل خود مختاری قائم نہیں رکھ سکتا، وہ اپنی پالیسی بھی آزادانہ نہیں چلا سکتا۔ مغربی دنیا کے لیے اصل چیلنج اب یہ نہیں کہ وہ اپنا خفیہ اتحاد برقرار رکھے، بلکہ یہ ہے کہ وہ اپنی ٹیکنالوجی کی برتری کب تک قائم رکھ سکتی ہے۔ مصنوعی ذہانت، کو انٹم کمپیوٹنگ،

اور بھی سیٹلائز کمپنیوں نے وہ صلاحیت عام کر دی ہے جو کبھی صرف ریاستوں کے پاس تھی۔ ایک عام ڈرون یا کھلاسافت ویبر آج وہ کام کر سکتا ہے جو پہلے کسی خفیہ ایجنسی کے بغیر ممکن نہیں تھا۔

آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ 1941 میں بلیچلی پارک کے ایک خاموش کمرے میں جو اشتراک شروع ہوا تھا، وہ اب عالمی سیاست کی ریڑھ کی ہڈی بن چکا ہے۔ مگر جس رفتار سے دنیا میں انفارمیشن ٹیکنالوجی پھیل رہی ہے، اسی رفتار سے مغرب کے اس "آل سینٹنگ آئی" کے سامنے نئے چیلنج ہو رہے ہیں۔ نیلیجنس کی قابلیت چھلے 75 سالوں میں مغرب کی اجارہ داری کا ایک بڑا اہم ذریعہ رہی ہے مگر اب یہ کام مغرب کیلئے آسان نہیں رہا اور اگر دنیا میں ملٹی پور نظم قائم ہوتا ہے تو اسکی ایک وجہ نیلیجنس پر سے مغرب کی اجارہ داری کا خاتمه ہو گا۔

مغربی ممالک، بالخصوص امریکا، کی جانب سے عسکری یا سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے دہشتگرد گروہوں کو پرائیسی کے طور پر استعمال کرنے کی پالیسی کو سمجھنے کے لیے ہمیں بین الاقوامی طاقت کے ساختی ڈھانچے اور اس میں اخلاقیات کے مقام کو جانا ضروری ہے۔ یہ رجحان بینادی طور پر بیسویں صدی کے سرجنگ کے دور میں ابھرا تھا، جب دنیا میں کلونیل ازم کی تباہیوں کے نتیجے میں کیونزم تیزی سے پھیلنے لگا تھا۔ مغربی طاقتیں کیونزم کا راستہ رونے کیلئے ہر جنگ آذانے کو جائز سمجھ رہی تھیں۔ اس صورت حال نے عالمی سیاست کو ایک ایسا میدان جنگ بنا دیا جہاں ماقومی تنازعات بھی عالمی طاقتوں کی کشمکش کا حصہ بن گئے۔ ایسے میں امریکہ کی زیر قیادت مغربی طاقتوں نے اکثر ایسے عسکریت پسند گروہوں کو اسلحے سے لیس کیا، مالی اور تربیتی مدد فراہم کی تاکہ وہ سوویت یونین یا اس کے اتحادیوں کے خلاف مغربی پرائیسیز کے طور پر براہ راست جنگ لڑ سکیں۔ اس پالیسی کا واضح مقصد یہ تھا کہ دشمن کو کم سے کم وسائل صرف کر کے زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچایا جائے، مگر اس کے پچھے کار فما طاقت کے ڈھانچے اور اخلاقی تضادات نے اسے تاریخ کا ایک انتہائی تنازع اور خطرناک عمل بنادیا۔

طاقت کے ان ڈھانچوں کا تجویز کرتے ہوئے یہ بات واضح ہے کہ مغربی خارجہ پالیسی میں اکثر شارٹ سیاسی مفادات، لانگ ٹرم اخلاقی تحفظات پر غالب رہے ہیں۔ افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف مجاہدین کی حمایت اس کی واضح مثال ہے۔ اس وقت امریکی پالیسی سازوں کی نظر میں ان مجاہدین کی مذہبی بیناد پرستی یا ان کے طویل المدى عزم کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ اصل ہدف سوویت فوج کو ایک ایسی جنگ میں الجھا کر اسے ناکوں چنے چھوانا تھا جیسا امریکا خود ویتنام میں چبا چکا تھا۔ اس مقاصد کے حصول کے لیے پاکستان کے اداروں کے ساتھ مل کر اربوں ڈالر کی خطیر رقم اور جدید ترین اسلحہ ان گروہوں تک پہنچایا گیا جن میں سے کئی کی نظریاتی بینادیں انتہا پسندانہ تھیں۔ اس مقاصد کیلئے خصوصی طور پر پاکستان میں اور عمومی طور پر پوری اسلامی دنیا میں اسلامی مدرسوں کا جال بچھایا گیا، جہادی لڑیچر تیار کیا گیا۔ وہابیت، سلفیت اور تکفیریت جیسے شدت پسندانہ نظریات کو فروغ دیا گیا۔ اس حکمت عملی کو فوری طور پر کامیابی ضرور حاصل ہوئی اور سوویت یونین کو شکست ہوئی، لیکن اس عمل نے ایک ایسی عسکریت پسند تحریک کو جنم دیا جس نے اپنے ہی خالقین کو نشانہ بنانا تھا۔ القاعدہ، داعش، بوکو حرام اور الشباب جیسے تمام شدت پسند گروہوں کی جڑیں اسی پالیسی میں ملتی ہیں۔ مغرب کی لگائی اس آگ نے دنیا بھر کے مسلمان ممالک کو کسی حد تک اپنی لپیٹ میں لے لیا اور یہ آگ آج بھی بھڑک رہی ہے۔

دہشتگرد گروہوں کو پر اکسیز کے طور پر استعمال کرنے کی امریکی پالیسی صرف مسلم ممالک تک محدود نہیں تھی بلکہ یہ پالیسی دنیا بھر میں ایک حکمت عملی کے طور پر اپنانی گئی تھی۔ نکاراگوا میں کونٹرا باغیوں کی حمایت اس پالیسی کے ایک اور پہلو کو واضح کرتی ہے۔ یہاں پر امریکا کا مقصد ایک بائیں بازو کی سو شلست حکومت کا تختہ الثنا تھا۔ کانگریس کی جانب سے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے باعث پابندی کے باوجود، انتظامیہ نے خفیہ طور پر اس حمایت کو جاری رکھا، یہاں تک کہ ایران کے ساتھ خفیہ اسلحہ سودے سے حاصل ہونے والے فنڈر بھی اس مقصد کے لیے استعمال کیے گئے۔ اس عمل سے دو اہم باتیں عیاں ہوتی ہیں۔ پہلی یہ کہ مغربی جمہوری اداروں اور جمہوری احتساب کے باوجود، خارجہ پالیسی کے اہم ترین فصیلے خفیہ اسجنڈے کے تحت چلائے جاتے ہیں، جہاں طاقت کا مرکز صرف چند پالیسی سازوں تک محدود ہوتا ہے۔ دوسری یہ کہ جمہوریت اور انسانی حقوق کے عالمی چیمپئن ہونے کا دعویٰ کرنے والا ملک ایسے گروہوں کی حمایت کر رہا تھا جن کے ہاتھوں عام شہریوں کے بنیادی حقوق پامال ہو رہے تھے۔ اس کا نتیجہ نکاراگوا اور خلطے کے دیگر ممالک میں معاشی تباہی، سماجی انتشار اور ایمیگریشن کی ایک ایسی لہر کی صورت میں نکلا جو آج امریکا کے لیے ایک بڑا مستسلہ بنی ہوئی ہے۔ یہی مسئلہ یورپ کا بھی ہے۔ جن ممالک میں سستی فائدے کیلئے تباہی پھیلانی تھی وہاں کے ہمارے آج یورپ میں بیٹھے ہیں۔

سرد جنگ کے خاتمے کے بعد بھی یہ حکمت عملی ختم نہیں ہوئی بلکہ اس نے نئے روپ دھار لیے۔ عراق میں شارت ڈرم مقاصد کیلئے سنی تحریک کو یوسفی گئی جسے ایک فوجی کامیابی کے طور پر دیکھا گیا۔ سنی جنگجوؤں کو شروع میں القاعدہ کے خلاف مسلح کیا گیا۔ مگر یہ ایک عارضی شرکت تھی۔ جیسے ہی امریکا نے عراق چھوڑا، انہی سنی آبادیوں میں امریکی جنگ سے پیدا ہونے والی محرومی اور سیاسی عدم شمولیت نے داعش جیسے گروہ کو پہنچنے کا موقع دیا۔ اسی طرح لیبا اور شام میں انتہا پسند گروہوں کو مسلح کیا گیا۔ دہشتگرد گروہوں کو پر اکسیز کے طور پر استعمال کرنے کی پالیسی آج بھی جاری ہے۔

ان تمام واقعات کا تجزیہ ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ مغربی ممالک کی پر اکسی دہشتگرد گروہوں کو سپورٹ کرنے کی پالیسی نے شارت ڈرم فوجی یا سیاسی فوائد تو حاصل کیے تھے، لیکن اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا علاقائی عدم استحکام، دہشت گردی کے نئے نیٹ ورکس، اور عوامی سطح پر پھیلنے والا عدم اعتماد ان فوائد سے کہیں زیادہ نقصانہ ثابت ہوا ہے۔ آج ایک بار پھر دنیا میں

طاقت کے نئے محاڑ کھل رہے ہیں، تاریخ کے ان اسپاٹ کو نظر انداز کیا گیا تو دنیا کو دوبارہ دھشتگردی کے خلاف ایک نئی جنگ دیکھنی پڑے گی۔

گذشتہ صدی میں عالمی سیاست پر مغربی ممالک بالخصوص امریکا اور یورپی طاقتوں کے اثر کا ایک ایسا جامع نظام قائم ہوا ہے جس کی مثال تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔ یہ اثر صرف فوجی یا معاشی مداخلت تک محدود نہیں رہا بلکہ اس نے ایک پیچیدہ سڑک پر کی شکل اختیار کر لی ہوئی ہے، جس میں سیاسی امجدنڈے تشکیل دینا، دانشورانہ رجحانات کو ہموار کرنا، اور شفاقتی اقدار کو تبدیل کرنا بھی شامل تھا۔ اس پورے عمل کو سمجھنے کے لیے محض واقعات کی ترتیب پر اکتفا کرنا کافی نہیں، بلکہ اس کے پس پر وہ کارفما قوتوں، انکے مفادات اور اخلاقی تضادات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

مغربی سیاسی و فکری اثرات کی بنیادیں دراصل کلو نیل دور سے جا ملتی ہیں، لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد اس نے ایک منظم اور باقاعدہ شکل اختیار کر لی۔ سرد جنگ کے دوران امریکا نے صرف عالمی سطح پر اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے اتحاد بنائے بلکہ ایسی دانشورانہ فضاء بھی تشکیل دی جس میں سرمایہ دارانہ جمہوریت کو واحد قابل تقلید نظام کے طور پر پیش کیا گیا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے سی آئی اے جیسے اداروں نے بظاہر غیر جانب دار شفاقتی فورم، تحقیقی جرائد اور یونیورسٹی پروگراموں کو خفیہ طور پر فنڈز فراہم کیے۔ یہ کوششیں محض کمیونزم کے خلاف رو عمل نہیں تھیں، بلکہ ان کا ایک وسیع تر مقصد تھا کہ عالمی رائے عامہ کو اس طرح تشکیل دیا جائے کہ مغربی مفادات کو اخلاقی برتری حاصل ہو۔ اس عمل میں دانشوروں، ادبیوں اور صحافیوں کو بے خبری میں یا شعوری طور پر اس امجدنڈے کا حصہ بنایا گیا۔

اس خفیہ مداخلت کے سیاسی محرکات کی سطحیوں پر کام کر رہے تھے۔ ایک طرف تو مغربی طاقتوں اپنے جیو اسٹریجیک مفادات کا تحفظ چاہتی تھیں، دوسری طرف وہ ایک ایسا عالمی نظام قائم کرنا چاہتی تھیں جس میں ان کے معاشی اور تہذیبی اقدار کو فویت حاصل ہو۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے بین الاقوامی مالیاتی اداروں جیسے عالمی بینک اور آئی ایم ایف کو بھی ایک اوزار کے طور پر استعمال کیا۔ ان اداروں کے ذریعے دی جانے والی شرائط اکثر ترقی پذیر ممالک کی خود مختاری پر حملہ ثابت ہوتی تھیں۔ معاشی امداد کے بدلے میں ڈکٹیٹ پالیسیاں لاگو کرانا دراصل ایک نئی قسم کا کلو نیل ازم تھا، جس کا مقصد ان ممالک کے وسائل تک رسائی اور ان کی پالیسیوں پر کنٹرول حاصل کرنا تھا۔

اس پورے عمل میں ایک واضح اخلاقی تضاد بھی نظر آتا ہے۔ مغربی ممالک اپنے داخلی معاملات میں جمہوریت، انسانی حقوق اور خود ارادیت کے اصولوں کی پر زور وکالت کرتے ہیں، لیکن یونی ممالک میں انہی اصولوں کو مفادات کی خلاف ورزی کرتے

ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔ کتنی ایسے آمرانہ حکمران جنہیں عوامی حمایت حاصل نہیں تھی، مغربی طاقتوں کی پشت پناہی سے ہی طویل عرصے تک برسر اقتدار رہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ مغرب اصولوں کی پاسداری محض اس وقت تک کرتا ہے جب تک کہ وہ انکے مفادات سے متصادم نہ ہوں۔ یہ دوہر امعیار عالمی سطح پر عدم اعتماد اور بد ظنی کا باعث بنتا ہے۔

نئی صدی میں یہ اثر و رسوخ نئی شکلیں اختیار کر چکا ہے۔ ڈیجیٹل دور نے معلومات کے تبادلے کو آسان بنایا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ مغربی ثقافتی یلغار اور پروپیگنڈے کا ایک زبردست ذریعہ بھی بن گیا ہے۔ سو شل میڈیا پلیٹ فارمنز، خبروں کے بین الاقوامی چینلز، اور تفریحی صنعت کے ذریعے ایک مخصوص طرز زندگی اور سوچ کو عالمی سطح پر مسلط کیا جا رہا ہے۔ اس کا نتیجہ مقامی ثقافتوں کے بدرجیخانے اور قومی شناخت کے بحران کی صورت میں نکل رہا ہے۔ یہ ثقافتی کلو نیل ازم دراصل سیاسی کلو نیل ازم سے کہیں زیادہ گہرے اور دیر پا اثرات رکھتا ہے۔

اس پورے عمل کا تحریز کرنے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مغربی سیاسی و فکری اثرات کا جال دراصل ایک ایسا سڑکچرل نظام ہے جو طاقت، معیشت اور علم کے درمیان گہرے تعلق پر مبنی ہے۔ یہ محض چند واقعات یا پالیسیوں کا سلسلہ نہیں، بلکہ ایک ایسا پیچیدہ سڑکچر ہے جو اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے ہر دور میں نئے ٹولز اور حریبے استعمال کرتا ہے۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ نہ صرف اس کی تاریخ اور طریقہ کار کو سمجھا جائے، بلکہ اپنی دانشورانہ اور ثقافتی خود مختاری کو برقرار رکھنے کے لیے بھی مربوط کوششیں کی جائیں۔ مستقبل میں عالمی طاقت کے توازن میں تبدیلیاں یقینی ہیں، لیکن اگر سڑکچرل عدم مساوات برقرار رہی تو طاقت کے نئے مرکز بھی پرانے طریقے ہی اپنائیں گے۔ اس لیے حقیقی خود مختاری صرف اسی وقت ممکن ہے جب فکری، ثقافتی اور سیاسی سطح پر ایک تبادل نظریہ تشکیل دیا جائے جونہ صرف طاقت کے موجودہ ڈھانچے کو سمجھے بلکہ اس کے اثرات سے بھی آزاد ہو۔

ورلڈ وار 2 کے بعد سے عالمی سیاست پر مغربی ممالک کے اثر و رسوخ کا جائزہ لیا جائے تو ایک واضح تضاد نظر آتا ہے۔ ایک طرف جمہوریت، انسانی حقوق اور خود ارادیت کے اصولوں کا عالمی سطح پر چار کیا جاتا رہا، دوسری طرف انہی اصولوں کو مفادات کی خاطر یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔ یہ دوہرा معیار محض چند واقعات کا سلسلہ نہیں بلکہ ایک سڑک پر مسئلہ ہے جو مغربی خارجہ پالیسی کے مرکز میں موجود رہا ہے۔ اس کا تجویز کرنے سے پہلے چلتا ہے کہ طاقت کے حصول اور برقرار رکھنے کی جدوجہد میں اخلاقی اصولوں کو ہمیشہ معمولی حیثیت حاصل رہی ہے۔

سر جنگ کے دوران اس رویے کی واضح مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ اشتراکی نظریے کے خلاف جنگ میں مغربی طاقتوں نے کسی بھی آمانہ حکومت کو اپنا اتحادی بنایا جس نے ان کے مفادات کا تحفظ کیا۔ گونٹے مala، چلی اور ارجمندان جیسے ممالک میں جمہوری طور پر منتخب حکومتوں کے خلاف کی گئی مداخلت اس کی واضح مثالیں ہیں۔ ان ممالک میں نہ صرف جمہوری اداروں کو کمزور کیا بلکہ ایسے فوجی حکمرانوں کو اقتدار تک پہنچایا گیا جنہوں نے اپنے ہی عوام کے خلاف وحشیانہ کارروائیوں کو رواج دیا۔ ان اقدامات کے پچھے کارفرما محکمات کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ مغربی طاقتیں اپنے معاشی مفادات کے تحفظ کو اولین ترجیح دیتی تھیں۔ گونٹے مala میں یونائیٹڈ فروٹ کمپنی کے مفادات کا تحفظ یا ایران میں تیل کی ملکیت کے قومیائے جانے کے خلاف رد عمل اس کی واضح مثالیں ہیں۔

نانن الیون کے بعد کے دور میں اس رویے میں کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آتی۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر ایسے ممالک سے اتحاد قائم کیا گیا جن کے انسانی حقوق کے ریکارڈ انتہائی خراب تھے۔ سعودی عرب، مصر اور ایکسٹان جیسے ممالک کو اسٹریجیک اتحادی کے طور پر تسلیم کیا گیا حالانکہ ان ممالک میں جمہوری ادارے موجود نہیں تھے اور شہری آزادیوں پر سخت پابندیاں عائد تھیں۔ اس صورت حال کا تجویز کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مغربی طاقتوں کے لیے انسانی حقوق کا احترام ہمیشہ مشروط رہا ہے۔ جہاں ان مفادات کو خطرہ لاحق ہوا، وہاں ان اصولوں کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا۔

اس دوہرے معیار کے دور میں نتائج سامنے آتے ہیں۔ گلوبل ساؤتھ کے ممالک میں مغربی انسانی حقوق کے بیانات پر شکوہ و شبہات پیدا ہوتے ہیں۔ بین الاقوامی فورمز پر مغربی ممالک کی اخلاقی قیادت کو چیلنج کیا جانے لگا ہے۔ اس کے علاوہ، ان پالیسیوں آمریتوں کو مضبوط کیا ہے۔

موجودہ دور میں بھی یہ رجحان جاری ہے۔ یوکرین جنگ کے دوران مغربی رد عمل اور غزہ کے بحران پر خاموشی کے درمیان واضح تضاد نے اس دوہرے معیار کو مزید عیاں کر دیا ہے۔ مشرق و سطحی میں اسرائیل کے ساتھ غیر مشروط اتحاد اور فلسطینیوں کے انسانی حقوق کو نظر انداز کرنا اس بات کی واضح مثال ہے کہ مفادات اصولوں پر فوقيت رکھتے ہیں۔ اسی طرح بھارت میں اقلیتوں کے حقوق کی پامالی پر خاموشی چین کے خلاف بیانات کے بر عکس ہے۔

اس تمام صورتحال کا گہرائی سے جائزہ لینے سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مغربی طاقتوں کی خارجہ پالیسی میں انسانی حقوق کا احترام ایک ایسا نظریہ ہے جسے عملی شکل دینے میں مسلسل ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس ناکامی کی بنیادی وجہ طاقت اور مفادات کے حصول کی وہ دوڑ ہے جس میں اخلاقی اصولوں کی قربانی دی جاتی رہی ہے۔ مغربی طاقتوں کو اپنے بیان کردہ اصولوں اور عملی اقدامات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنی پڑے گی۔ انسانیت کے مستقبل کے لیے یہ انتہائی اہم ہے کہ طاقت اور اخلاق کے درمیان توازن قائم کیا جائے، ورنہ روانڈا، سوڈان اور غزہ جیسے واقعات جاری رہیں گے۔

سرد جنگ کا دور بین الاقوامی تعلقات میں مذہب کے استعمال کی ایک منفرد مثال پیش کرتا ہے جہاں مغربی طاقتوں نے اپنے جیو اسٹریجیک مقاصد کے حصول کے لیے مذہبی جذبات اور اداروں کو بطور ہتھیار استعمال کیا۔ یہ عمل محض چند واقعات کا سلسلہ نہیں تھا بلکہ ایک منظم اور سوچی سمجھی حکمت عملی تھی جس کے اثرات آج تک محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ اس پالیسی کے پیچے کا فرمांہ محرکات، اس کے نفاذ کے طریقہ کار، اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سڑکچرل تبدیلیوں کا جائزہ اس بات کو واضح کرتا ہے کہ کس طرح مذہب کو عالمی سیاست کا ایک اہم عنصر بنانے کا پیش کیا گیا۔

سرد جنگ کے ابتدائی سالوں میں سوویت یونین کے الحادی نظریے نے مغربی طاقتوں کے لیے ایک ایسا موقع پیدا کیا جہاں وہ مذہب کو اشتراکیت کے خلاف ایک طاقتور ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتی تھیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے امریکہ نے دو مختلف خطوں میں دو مختلف مذہبی قوتوں کے ساتھ کام کیا۔ یورپ میں کیتوولک چرچ اور پوپ کو روحاںی اتحادی کے طور پر استعمال کیا گیا جبکہ مشرق و سلطی اور جنوبی ایشیا میں اسلام کی ایک مخصوص تشریع کو اشتراکیت کے خلاف ڈھال کے طور پر پروان چڑھایا گیا۔ اس دو طرفہ حکمت عملی کا بنیادی مقصد سوویت یونین کے اثرو رسوخ کو روکنا تھا، چاہے اس کے لیے کسی بھی قسم کے مذہبی روحانات کو ہوا دینا پڑے۔

سنہ 1979 کا سال اس حوالے سے ایک اہم موڑ ثابت ہوا جب ایک طرف پولینڈ میں پوپ جان پال دوم کے دورے نے عوامی تحریک کو جنم دیا اور دوسری طرف افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف جہاد کو بین الاقوامی حمایت حاصل ہوئی۔ ان دو واقعات کے درمیان ایک واضح مثالست پائی جاتی ہے۔ دونوں صورتوں میں مذہب کو عوامی جذبات کو متحرک کرنے کے لیے استعمال کیا گیا اور دونوں ہی معاملات میں مغربی طاقتوں نے اس عمل میں فعال کردار ادا کیا۔ پولینڈ میں کیتوولک کلیسا کے ذریعے عوامی مزاحمت کو تقویت پہنچائی گئی جبکہ افغانستان میں مجاہدین کو مالی اور عسکری امداد فراہم کی گئی۔ اس دوہری پالیسی کے پیچے کا فرمांہ منطق یہ تھی کہ اشتراکیت کے خلاف ہر ممکنہ مجاز کو استعمال کیا جائے، چاہے اس کے لیے کتنے ہی متضاد عناصر کو اکٹھا کرنا پڑے۔

اس پالیسی کے نتیجے میں جن سڑکچرل تبدیلیوں نے جنم لیا، وہ انتہائی دور رس ثابت ہوئیں۔ افغانستان میں مجاہدین کی حمایت نے در حقیقت ایک ایسی عسکریت پسند تحریک کو جنم دیا جو بعد ازاں عالمی دہشت گردی کی شکل اختیار کر گئی۔ سعودی عرب

کی مالی معاونت سے پاکستان میں قائم ہونے والے مدرسون نے صرف افغان جہاد کے لیے فوجی کارکن فراہم کیے بلکہ ایک ایسی مذہبی سوچ کو بھی پروان چڑھایا جو شدت پسندی پر مبنی تھی۔ اس کے برعکس پولینڈ میں مذہب کی بنیاد پر چلنے والی تحریک نسبتاً پر امن طریقے سے اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب رہی۔ اس تضاد کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مذہب کو بطور ہتھیار استعمال کرنے کے نتائج اس خط کی سیاسی اور شفاقتی ساخت پر منحصر ہوتے ہیں۔

سرد جنگ کے خاتمے کے بعد بھی مذہب بین الاقوامی تعلقات کا اہم عنصر بنا رہا۔ افغانستان میں طالبان کی حکومت قائم ہوئی اور القاعدہ جیسی تنظیمیں وجود میں آئیں۔ اور پھر ان تنظیموں کو ختم کرنے کے نام پر ایک نئی جنگ شروع کرنے کا بہانہ مل گیا۔

مغربی طاقتوں نے سرد جنگ کے دوران و قتی فائدے کے لیے جن مذہبی روحانیات کو ہوا دی، وہ بعد ازاں پوری دنیا کے لیے مستسلہ بن گئے۔ افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف کامیابی نے درحقیقت عالمی دہشت گردی کے نتے دور کا آغاز کیا۔

موجودہ دور میں بھی مذہب بین الاقوامی تعلقات میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ مشرق وسطیٰ اور افغانستان میں دہشت گرد تنظیمیں اپنے آپ کو مذہبی جنگجو قرار دے رہی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ مغربی ممالک کو مذہب کے حوالے سے اپنی پالیسیوں کا زیر و سے جائزہ لینا چاہئے اور مذہب کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے سے پہلے اس کے ممکنہ نتائج کا صحیح اندازہ لگانا چاہئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مغرب ایسا کرے گا؟ مغرب کی اجارہ داری مذہب کے سیاسی استعمال سے قائم ہوئی تھی۔

بیسویں صدی کے وسط میں دوسری جنگ عظیم کے بعد جب عالمی طاقتوں کا نیا توازن قائم ہوا، تو جمہوریت کے فروغ اور خود ارادیت کے حق کا عالمی چارٹر میں اعلان کیا گیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی سرد جنگ کے آغاز نے بین الاقوامی تعلقات میں ایک نئی قسم کی مداخلت کو جنم دیا جہاں طاقتوں مالک نے دوسری خود مختار قوموں کے داخلی معاملات میں مداخلت کرنا شروع کی۔ اس مداخلت کی سب سے منافقاںہ شکل وہ تھی جہاں جہوری طریقے سے منتخب ہونے والی حکومتوں کو غیر جہوری طریقوں سے تبدیل کیا گیا۔ یہ عمل محض چند واقعات پر مشتمل نہیں تھا بلکہ ایک ایسی نظام کی شکل اختیار کر گیا جس کے اثرات آج تک محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

سنہ 1953 میں ایران کا واقعہ اس سلسلے کی پہلی کڑی ثابت ہوا جہاں برطانیہ اور امریکہ کی مشترکہ خفیہ کارروائی کے ذریعے منتخب وزیر اعظم محمد مصدق کی حکومت کا تحفظ المٹ دیا گیا۔ مصدق نے ایران کی تیل صنعت کو قومیانے کا فیصلہ کیا تھا جو برطانوی مفادات کے بر عکس تھا۔ سی آئی اے کی جانب سے آپریشن ایجنس کے تحت ایران میں سیاسی عدم استحکام پیدا کیا گیا، احتجاجی مظاہرے منظم کیے گئے، اور آخر کار شاہ محمد رضا پهلوی کی بحالی عمل میں لائی گئی۔ اس عمل نے نہ صرف ایران کی جہوری ترقی کو روک دیا بلکہ ایک ایسی آمرانہ حکومت قائم کی جس کے خلاف ۱۹۷۹ کی انقلاب برپا ہوا۔

اسی طرح گوتے مالا میں جہوری طریقے سے منتخب ہونے والے صدر جیکوبو آرینز کی حکومت کو امریکی سی آئی اے کے ایک اور خفیہ آپریشن کے ذریعے تبدیل کیا گیا۔ آرینز کی زینتی اصلاحات کی پالیسی امریکی کمپنی یونائیٹڈ فراؤٹ کے مفادات کے خلاف تھی۔ اس کے بعد کے عشروں میں گوتے مالا میں فوجی حکومتیں قائم ہوئیں جنہوں نے مقامی آبادی کے خلاف پرتشدد کارروائیوں کو رواج دیا۔

سرد جنگ کے دور میں یہ رجحان لاطینی امریکہ، ایشیا اور افریقہ میں پھیل گیا۔ چلی میں صدر سالاوادور آلینڈے کی منتخب سو شلسٹ حکومت کے خلاف فوجی بغاوت میں امریکی مداخلت ثابت ہو چکی ہے۔ ڈی کلاسیفاٹڈ دستاویزات کے مطابق امریکہ نے چلی کی فوجی بغاوت کو ممکن بنایا۔ اس کے نتیجے میں آگسٹو پونو شے کی سترہ سالہ آمریت قائم ہوئی جس میں ہزاروں افراد لاپتہ ہوئے اور تشدد کا نشانہ بنے۔

ان تمام واقعات میں ایک واضح تضاد نظر آتا ہے۔ ایک طرف تو مغربی مالک جمہوریت اور انسانی حقوق کے عالمی چمپئین کے طور پر ابھرے، دوسری طرف انہوں نے ایسی حکومتوں کے خلاف کام کیا جو جمہوری طریقے سے منتخب ہوئی تھیں۔ سرد جنگ کے خاتمے کے بعد بھی یہ رویہ مکمل طور پر ختم نہیں ہوا۔ سنہ 2000 کے بعد کے دور میں جمہوریت کے فروغ کے نام پر مختلف مالک میں مداخلت کے نئے طریقے متعارف ہوئے۔ انتخابی عمل میں مداخلت، سیاسی جماعتوں کو فنڈر فراہم کرنا، اور مقامی میڈیا کو متاثر کرنا ان میں شامل ہیں۔ وینزویلا میں 2002 میں ہو گوچاویز کے خلاف ناکام بغاوت میں امریکی مدد کے شواہد ملے ہیں۔

ان مداخلتوں کے دور رسمتاج سامنے آئے ہیں۔ ایران میں 1953 کے رجیم چینچ آپریشن نے ایران کی سیاست میں ایسی ہلچل پیدا کی جس کے اثرات آج تک قائم ہیں۔ چلی میں پنوشے کی ڈلٹیرشپ نے معاشرے میں گہری تقسیم پیدا کی۔ گوئٹے مالا میں نسلی تنازعات آج بھی جاری ہیں۔

موجودہ دور میں یہ مستعلہ اور بھی چیخیدہ ہو گیا ہے۔ سنہ 2013 میں یوکرین میں ہونے والی حکومتی تبدیلیوں میں مغربی مالک کے کردار کا سب کوپتہ ہے۔ لاطینی امریکہ کے کئی مالک میں اب بائیں بازو کی حکومتیں دوبارہ اقتدار میں آ رہی ہیں جو ان مداخلتوں کی تاریخ کو دہرا رہی ہیں۔

جمہوریت انسانیت کا مستقبل ہے لیکن مغرب کی جمہوریت دشمنی کی پالیسی نے اس نظام پر سوال اٹھادیے ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ اس مسئلے کو دنیا کے سامنے لایا جائے تاکہ اس نظام کو بچایا جاسکے۔

جمهوری اقدار کی دعویدار مغربی طاقتوں نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے آرانہ حکومتوں کو سیاسی، فوجی اور معاشی حمایت فراہم کی۔ یہ رشتے محض و قتی مفادات تک محدود نہیں تھے بلکہ انہوں نے عالمی طاقت کے توازن کو اس طرح تشکیل دیا کہ جس کے اثرات آج تک محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

انیس سو پچاس کی ہائی میں لاٹینی امریکہ میں یہ رجحان واضح ہوا جب امریکہ نے گونئے مالاکے فوجی حکمران کارلوس کاستیلو کو حمایت دی۔ اس کے بعد کے عشروں میں یہ پالیسی جاری رہی اور چلی میں آگستو پنوشے کی فوجی بغاوت کو خفیہ حمایت حاصل رہی، جس کے نتیجے میں سترہ سالہ آمریت قائم ہوئی جس دوران ہزاروں شہری لاپتہ ہوئے یا انہیں تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اسی دوران مشرق و سلطی میں امریکہ نے ایران کے شاہ محمد رضا پہلوی کو مضبوطی سے سپورٹ کیا، جس کی سیکرٹ پولیس ساوک نے ہزاروں ایرانی شہریوں کو تشدد کا نشانہ بنایا۔

اسی عرصے میں ایشیا میں انڈونیشیا کے صدر سہارتو کو مغربی ممالک کی بھرپور حمایت حاصل رہی، حالانکہ ان کے دور میں لاکھوں افراد کا قتل عام ہوا۔ سہارتو کی حکومت کو سرجنگ کے دوران کمیونزم کے خلاف اہم اتحادی سمجھا جاتا تھا۔ افریقہ میں زائر کے صدر موبو تو سیسی سیکلو کو بھی مغربی طاقتوں کی حمایت حاصل رہی، جنہوں نے تین ہائیوں تک ملک پر حکومت کی اور قومی غزانے سے اربوں ڈالرز ذاتی استعمال کے لیے نکالے۔

مغرب نے کمیونزم کے خلاف جنگ میں کسی بھی قسم کے اتحادی کو قبول کر لیا۔ جنرل ایوب، جنرل ضیا الحق، جنرل پارک، سوہارتو، مارکوس، نوریگا، ڈکٹیٹر زایک طویل لسٹ ہے جن کو امریکہ اور اسکے مغربی اتحادیوں نے فوجی، مالی، سیاسی، سفارتی، ہر قسم کی حمایت دی تھی۔ دنیا بھر کے بادشاہوں کے پیچھے مغرب کی حمایت تھی۔ یہاں تک کہ دنیا بھر میں دہشتگردوں کو بھی مغربی اتحادی مدد دیتے رہے۔

مغرب نے کمیونزم کے خلاف جنگ میں کسی بھی قسم کے اتحادی کو قبول کر لیا۔ جنرل ایوب، جنرل ضیا الحق، جنرل پارک، سوہارتو، مارکوس، آگستو پنوشے، فونخنسیو باتیستا، انستاسیو سوموزا ڈیبیانے، رافیل ٹرو خیلو، سنگ میں رہی، محمد رضا پہلوی، خورخے رافیل ڈیلا، الفریدو اسٹرو سرن، سہارتو، ڈکٹیٹر زایک طویل لسٹ ہے جن کو امریکہ اور اسکے مغربی اتحادیوں نے فوجی،

مالی، سیاسی، سفارتی، ہر قسم کی حمایت دی تھی۔ دنیا بھر کے بادشاہوں کے پچھے مغرب کی حمایت تھی۔ یہاں تک کہ دنیا بھر میں دہشتگردوں کو بھی مغربی اتحادی مدد دیتے رہے۔

سرد جنگ کے خاتمے کے باوجود یہ رجحان ختم نہیں ہوا۔ نائن الیون کے بعد دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکہ نے ازبکستان کے صدر اسلام کریموف، پاکستان کے جنرل مشرف، مصر کے جنرل سیسی، جیسے حکمرانوں سے تعاون کیا، حالانکہ ان کے دور میں انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیاں ہوئیں۔ اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ شام کے نتے حکمران الجولانی کے ساتھ مغربی مالک نے شرکت داری قائم کر لی ہے۔ الجولانی کو دہشتگرد قرار دے کر اس کے سرکی قیمت کر رکھی تھی۔ امریکہ نے الجولانی کو دہشتگردوں کی لسٹ سے اسی سال باہر نکالا ہے۔

ان تعلقات کے نتیجے میں دنیا بھر میں جمہوریت اور جمہوری ادارے کمزور ہوتے، سول سوسائیٹیز کا خاتمہ ہوا، اور فوجی و سیاسی بیورو کریسی نے طاقت پر قبضہ جمانتے رکھا۔ بیشتر مالک میں معاشی عدم مساوات میں اضافہ ہوا اور قدرتی وسائل پر ایک چھوٹی سی اشرافیہ کا کنٹرول قائم ہو گیا۔ بین الاقوامی تعلقات میں اس دوہرے معیار نے مغربی مالک کے اخلاقی اختیار کو کمزور کیا اور گلوبل ساؤنچ کے مالک میں ان کے خلاف بداعتمادی پیدا کی۔

اگر مغربی طاقتیں اپنی خارجہ پالیسی میں اصولوں اور مفادات کے درمیان بہتر تو ازن قائم نہ کر سکیں تو جمہوریت کا مستقبل تاریک سے تاریک تر ہوتا چلا جائے گا۔

دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر جب بریٹن ووڈز کانفرنس میں بین الاقوامی مالیاتی نظام کی بنیاد رکھی گئی تو اس کا ظاہری مقصد جنگ زدہ مالک کی تعمیر نو اور عالمی معاشی استحکام کو یقینی بنانا تھا۔ تاہم، جلد ہی یہ ادارے سرد جنگ کے جیو پالیٹکس کا اہم حصہ بن گئے۔ بین الاقوامی مالیاتی فنڈ (آئی ایم ایف) اور عالمی بینک نے ترقی پذیر مالک کو قرضے فراہم کرنے کے لیے شرائط عائد کرنی شروع کیں جنہیں سٹرکچرل ایڈ جسمٹنٹ پروگرام کا نام دیا گیا۔ ان شرائط میں حکومتی اخراجات میں کمی، بخکاری، اور مارکیٹ کے لیے دروازے کھونا شامل تھا۔ یہ پالیسیاں درحقیقت مغربی معاشی مفادات کے تحفظ کا ذریعہ بن گئیں۔

انیس سو ستر کی دہائی میں تیل کے بحرانوں نے کتنی ترقی پذیر مالک کو قرضوں کے دلدل میں پھنسا دیا۔ اس موقع پر آئی ایم ایف نے بیل آؤٹ پیکچر پیش کیے جن کے ساتھ سخت شرائط وابستہ تھیں۔ لاطینی امریکہ میں میکسیکو، برازیل اور ارجنتائن جیسے مالک کو ان شرائط کو قبول کرنا پڑا۔ ان شرائط میں سب سڑیز ختم کرنا، درآمدی رکاوٹیں ہٹانا، اور کرنٹی کی قدر میں کمی شامل تھی۔ ان پالیسیوں کے نتیجے میں ان مالک میں غربت میں اضافہ ہوا اور مقامی صنعتیں بین الاقوامی مقابلے کا سامنا نہ کر سکیں۔ ایشیا میں فلپائن ایک اور مثال پیش کرتا ہے جہاں مارکوس حکومت کے دور میں قرضوں کے بدلتے میں امریکی فوجی اڈوں کو بحال رکھا گیا۔

انیس سو نوے کی دہائی میں سوویت یونین کے انهدام کے بعد مشرقی یورپ کے مالک کو "شاک تھرپی" کے نام پر اسی قسم کے پروگرام پیش کیے گئے۔ روس سمیت کئی مالک نے بخکاری کے وسیع پروگرام شروع کیے جن کے نتیجے میں ایک نئی دولت مند اشرافیہ وجود میں آئی جبکہ عام عوام کی معاشی حالت بدتر ہو گئی۔ افریقہ میں اس دور کے سٹرکچرل ایڈ جسمٹنٹ پروگرام نے تعلیم اور صحت کے شعبوں کو بری طرح متاثر کیا کیونکہ حکومتوں کو ان شعبوں کے اخراجات میں کٹوتی کرنی پڑی۔

ان پالیسیوں کے سیاسی اثرات بھی گہرے تھے۔ قرضوں کی شرائط نے مالک کی پالیسی سازی کی خود مختاری کو محدود کر دیا۔ حکومتیں اپنے عوام کے مفادات کے بجائے قرض دہنڈکان کی شرائط پوری کرنے پر مجبور ہو گئیں۔ کتنی مالک میں ان پالیسیوں کے خلاف عوامی احتجاج ہوا جو بعض اوقات پر تشدید شکل اختیار کر گئے۔ وینزویلا میں 1989 کے کیراکازو فسادات اس کی ایک مثال ہیں جب ایندھن کی قیمتیوں میں اضافے کے خلاف مظاہرین پر فوج نے گولیاں چلائیں۔

اکیسوں صدی میں یہ رجحان نئی شکل میں سامنے آیا ہے جس میں مغربی ممالک نے Build Back Better World یعنی منصوبے پیش کیے ہیں۔

ان مالیاتی طریقوں کے طویل المدى اثرات نے ترقی پذیر ممالک کے سیاسی اور معاشی ڈھانچے کو نہ صرف شکل دی ہے بلکہ ان کی خود مختاری کو بھی متاثر کیا ہے۔ آج بھی کئی ممالک اپنے بھٹ کا بڑا حصہ قرضوں کی ادائیگی پر خرچ کرتے ہیں جس کی وجہ سے ترقیاتی منصوبوں کے لیے وسائل کم ہو جاتے ہیں۔ دنیا کو بین الاقوامی مالیاتی نظام میں اصلاحات کی اشد ضرورت ہے۔ دنیا میں غربت ختم کرنے کیلئے ایک ایسا نظام چاہئے جو ترقی پذیر ممالک کو زیادہ انصاف پسندانہ شرائط پر قرضے فراہم کرے۔ دنیا میں امیر سے امیر ترین بننے کی دوڑ ختم ہو اور اس کے ساتھ ہی غربت کا بھی خاتمه ہو۔

بین الاقوامی تعلقات میں پابندیوں کے استعمال کا سلسلہ جدید دور سے کہیں پرانا ہے، لیکن بیسویں صدی میں یہ ہتھیار ایک منظم اور طاقتور خارجہ پالیسی کے آئے کے طور پر ابھرا۔ پابندیوں کا بنیادی مقصد ممالک کے رویے میں تبدیلی لانا رہا ہے، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ یہ سیاسی دباؤ، معاشی جنگ اور حتیٰ کہ رجیم چینچ آپریشن کا ذریعہ بھی بن گئی ہے۔

سرد جنگ کے دوران پابندیوں کا استعمال نظریاتی جنگ کا حصہ بنا۔ یہ سلسلہ 1948 سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ سنہ 1960 میں کیوبا پر امریکی پابندیاں اس کی ایک اہم مثال ہیں اور یہ پابندیاں آج تک جاری ہیں اور کیوبا کی میشیٹ پر بدترین اثرات مرتب کرتی ہیں۔

سرد جنگ کے خاتمے کے بعد پابندیوں کے استعمال میں ایک نئی قسم کا ارتقا دیکھنے میں آیا۔ عراق پر 1990 میں کویت پر قبضے کے بعد اقوام متحده کی طرف سے عائد کی گئی پابندیاں تاریخ کی سب جامع پابندیوں میں سے ایک تھیں۔ ان پابندیوں کے نتیجے میں عراقی میشیٹ تباہ ہو گئی اور عام شہریوں کی زندگیاں بری طرح متاثر ہوئیں۔ اندازوں کے مطابق پانچ لاکھ سے زیادہ بچے پابندیوں کی وجہ سے سییدا ہونے والی غذائی قلت اور ادویات کی کمی کا شکار ہوتے۔ اس بحران نے "اسمارٹ سینکشنز" کے تصور کو جنم دیا جس کا مقصد حکمران اشرافیہ کو نشانہ بنانا تھا نہ کہ عام عوام کو۔

نانن الیون کے بعد کے دور میں پابندیوں کا دائرہ کار اور بڑھ گیا۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں امریکہ نے ایک نئی قسم کی مالیاتی پابندیوں کا نظام متعارف کرایا۔ یعنکوں پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ مشکوک لین دین کی نگرانی کریں اور دہشت گردگروہوں سے مسلک اکاؤنٹس کو منجد کریں۔ ایران کے خلاف جوہری پروگرام کو روکنے کے لیے عائد کی گئی پابندیاں ایک اور مثال ہیں جن کو استعمال کر کے 2015 میں جوہری معاهدہ کیا گیا۔ مگر 2018 میں امریکہ یکطرفہ طور پر اس معاهدے سے نکل گیا اور پابندیاں دوبارہ عائد کر دی گئیں۔

پابندیوں کے اثرات کے بارے میں ماہرین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ کچھ معاملات میں جیسے جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز کے خاتمے میں پابندیاں کامیاب رہیں، جبکہ دوسرے معاملات میں جیسے شمالی کوریا یا ویزوویلا میں وہ مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ پابندیوں کے انتخاب میں سیاسی مفادات کا عمل دخل واضح نظر آتا ہے۔ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے

باوجود سعودی عرب یا اسرائیل جیسے اتحادی ممالک پر پابندیاں عائد نہیں کی جاتیں، جبکہ دشمن ممالک پر معمولی خلاف ورزیوں پر سخت پابندیاں لگائی جاتی ہیں۔

پابندیوں کے انسانی اثرات انتہائی گہرے ہوتے ہیں۔ عام شہریوں تک ادویات اور خوارک کی رسائی متاثر ہوتی ہے۔ صحت کے نظام کمزور ہو جاتے ہیں اور اموات کی شرح میں اضافہ ہوتا ہے۔ میشینیں ڈاؤن سائز ہو جاتی ہیں، روزگار کے موقع کم ہوتے ہیں، اور غربت میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ تمام عوامل مل کر عوامی عدم اطمینان پیدا کرتے ہیں، لیکن یہ عدم اطمینان صرف حکومتوں کے خلاف بغاوت کی وجہ ہی بنتا بلکہ اب پابندیاں لگانے والی بیرونی طاقتوں کے خلاف غم و غصے کا باعث بھی بنتا جا رہا ہے۔ لوگ ان سیاسی ہتھکنڈوں کو سمجھنے لگے ہیں۔

موجودہ دور میں پابندیاں بین الاقوامی تعلقات کا ایک مستقل حصہ بن چکی ہیں۔ روس کے خلاف یوکرین جنگ پر عائد کی گئی پابندیاں، چین کے خلاف ٹیکنا لو جی پابندیاں اس کی تازہ مثالیں ہیں۔ مستقبل میں پابندیوں کے استعمال میں مزید اضافے کا امکان ہے، خاص طور پر ڈیجیٹل پابندیوں کے نئے طریقے متعارف ہو رہے ہیں۔ تاہم، ان کے انسانی اثرات کو کم کرنے اور انہیں زیادہ موثر بنانے کے لیے بین الاقوامی کوششوں کی ضرورت ہے۔ پابندیوں کا استعمال ایک پچیدہ اخلاقی سوال ہے جس کا تعلق طاقت، انصاف اور بین الاقوامی قانون کے درمیان توازن سے ہے۔ اگر پابندیوں کو مغرب کے سیاسی ہتھیار کی بجائے اقوام متحده کی سفارتی طاقت بنایا جائے تو ان سے ڈسٹرکٹری اور ڈیٹیٹری شپ کے خلاف جنگ جیتی جا سکتی ہے۔ جینو سائیڈ رو کے جاسکتے ہیں۔ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں میں کمی آسکتی ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز میں ہی عالمی طاقتوں کی خارجہ پائیں گے اور کارپوریٹ مفادات کے درمیان گہرا تعلق واضح ہونے لگا تھا۔ یہ تعلق محض اتفاقی نہیں تھا بلکہ ایک منظم اور سوچی سمجھی حکمت عملی تھی جس کے تحت قدرتی وسائل تک رسائی حاصل کرنے کے لیے بین الاقوامی تعلقات کو استعمال کیا جاتا تھا۔ اس عمل نے نہ صرف متعدد ممالک کے مقدار کو بدلا بلکہ بین الاقوامی قانون اور اخلاقیات کے بارے میں بنیادی سوالات کو بھی جنم دیا۔

سنہ 1954 میں ایران میں ہونے والا واقعہ اس سلسلے کی پہلی کڑی ثابت ہوا جب برطانوی اور امریکی خفیہ اداروں نے مل کر ایران کے جمہوری طور پر منتخب وزیر اعظم محمد مصدق کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ اس اقدام کا بنیادی محرک ایرانی تیل کی صنعت کے قومیانے کا فیصلہ تھا جو اینگلو-ایرانی آئل کمپنی کے مفادات کے برابر راست متصادم تھا۔ مصدق کی حکومت کے خاتمے کے بعد شاہ ایران کی بحالی نے نہ صرف ایرانی تیل پر مغربی کثروں کو یقینی بنایا بلکہ ایران میں ایک ایسی آمرانہ حکومت قائم کی جس کے خلاف آخر کار انقلاب برپا ہوا۔ اسی طرح کے محركات گوتے مالا میں جمہوری حکومت کے خلاف بغاوت کا باعث بنے جہاں یونائیٹڈ فروٹ کمپنی کے مفادات کو خطرہ لاحق ہوا تھا۔

لاٹینی امریکہ میں یہ روحان خاص طور پر واضح رہا ہے۔ چلی میں 1973 کی فوجی بغاوت کے دوران امریکی کوپر کمپنی نے صدر سالوادور آلیندے کی حکومت کو غیر مسٹحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ آلیندے کی حکومت نے تانبے کی صنعت کو نیشنلائز کرنے کا فیصلہ کیا تھا جو امریکی معاشی مفادات کے خلاف تھا۔ اس کے بعد قائم ہونے والی آگستو پنوشے کی فوجی حکومت نے نہ صرف تانبے کی صنعت پر امریکی مفادات کو بحال کیا بلکہ میشیٹ کو بھی بیرونی سرمایہ کاروں کے لیے کھول دیا۔ اسی طرح کی کہانی وسطی افریقہ میں کانگو کے صدر پڑیس لومومبا کے قتل کے پس پرده بھی کار فرماتھی، جو بیلچیم اور امریکی مفادات کے تحفظ کے لیے کی گئی ایک کارروائی تھی جس کا مقصد کانگو کے معنی وسائل پر کثروں حاصل کرنا تھا۔

ناجیہریا میں شیل آئل کمپنی کے ساتھ حکومت کے تعلقات نے ملک کی سیاست کو گہرے طور پر متاثر کیا ہے۔ ناجیہریا کے علاقے میں تیل کی نکاسی کے دوران ماحولیاتی تباہی اور مقامی آبادی کے حقوق کی پامادی کے باوجود کمپنی نے اپنے مفادات کا تحفظ جاری رکھا۔ انڈونیشیا میں سوہارت کی حکومت کو مغربی ممالک کی حمایت حاصل رہی جس کے دوران فرانسی پورٹ مکموران جیسی کمپنیوں نے پاپوا کے علاقے میں سونے اور تانبے کے وسیع ذخائر پر کثروں حاصل کیا۔

انیس سونوے کی دہائی میں اس رجحان نے نئی شکلیں اختیار کیں۔ ناجیریا کے اوقاوونی لینڈز میں ماحولیاتی ماہر کین سارو و واکی پھانسی نے بین الاقوامی توجہ اپنی جانب مہنگوں کروائی، جس نے شیل آتل کمپنی کے خلاف ماحولیاتی تخریب کاری کے خلاف آواز اٹھائی تھی۔ ایک اور معاملے میں کیروں میں سدہ دریائی منصوبے کے خلاف احتجاج کو زبردستی کچل دیا گیا، جسے عالمی یونک کی حمایت حاصل تھی۔

اکیسویں صدی میں یہ رجحان اور بھی پچیدہ ہو گیا ہے۔ عراق جنگ کے بعد تیل کے معابدوں پر دستخط ہوئے جس میں مغربی تبل کمپنیوں کو وسیع مراعات حاصل ہوئے۔ افغانستان میں جنگ کے دوران معدنی وسائل کے حصول کی دوڑ جاری رہی جس میں یتھیم اور دیگر قیمتی معدنیات شامل ہیں۔ لاطینی امریکہ میں وینزویلا کے خلاف امریکی پابندیوں کے پس پرده تیل کے وسیع ذخائر اہم محرک ہیں۔

ان مداخلتوں کے لانگ ٹرم اثرات انتہائی گہرے رہے ہیں۔ متعدد ممالک میں جمہوری ادارے کمزور ہوئے ہیں، فوجی حکومتیں قائم ہوئی ہیں، اور شہری معاشروں کا خاتمہ ہوا ہے۔ وسائل کی لوٹ مارنے معاشی عدم مساوات کو ہوادی ہے اور مقامی آبادیوں کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم کیا ہے۔ بین الاقوامی تعلقات میں مغربی ممالک کا یہ دوہرا معیار ترقی پذیر ممالک میں بداعتمادی پیدا کرتا ہے۔

بین الاقوامی قانون کے نفاذ میں دوہرے معیار کا مستند درحقیقت مغربی طاقتون کے مفادات اور اخلاقی اصولوں کے درمیان ایک بنیادی تضاد کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ تضاد اس وقت واضح ہوتا ہے جب ایک طرف تو بین الاقوامی عدالت انصاف اور اقوام متحده جیسے اداروں کے ذریعے عالمی قانون کی پاسداری کی بات کی جاتی ہے، لیکن دوسری طرف طاقتور ممالک اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے انہی قوانین کی خلاف ورزی کرتے نظر آتے ہیں۔

سرد جنگ کے دوران اس دوہرے معیار کی متعدد مثالیں سامنے آئیں۔ وینام جنگ کے دوران امریکہ نے کامبوجیا اور لاوس پر بمباری کی جو بین الاقوامی قانون کی کھلی خلاف ورزی تھی، لیکن اس کے خلاف کوئی موثر بین الاقوامی کارروائی نظر نہیں آئی۔ اسی دور میں فرانس نے الجزائر میں جو جنگیں لڑیں، ان میں بڑے ہممانے پر انسانی حقوق کی پامالیوں کے باوجود فرانس پر کوئی پابندیاں عائد نہیں کی گئیں۔ اس کے بعد جب سوویت یونین نے ہنگری یا چیکوسلوواکیہ میں مداخلت کی تو مغربی ممالک نے اس کی سخت مذمت کی۔

سرد جنگ کے خاتمے کے بعد اس رجحان میں کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آئی۔ سنہ 1999 میں کو سووچنگ کے دوران نیٹو نے سربیا پر بمباری کی جو اقوام متحده کی سلامتی کو نسل کی منظوری کے بغیر تھی۔ اس اقدام کو بین الاقوامی قانون کی کھلی خلاف ورزی قرار دیا جا سکتا تھا، لیکن مغربی ممالک نے اسے انسانی بینادوں پر جواز فراہم کیا۔ اسی طرح 2003 میں عراق پر امریکی حملہ اقوام متحده کی منظوری کے بغیر کیا گیا، جسے بین الاقوامی قانون کے ماہرین نے غیر قانونی قرار دیا۔ ان واقعات کے بعد، جب روس نے 2013 میں یوکرین کے کریمیا علاقے پر قبضہ کیا تو اسے بین الاقوامی قانون کی سنگین خلاف ورزی قرار دیا گیا اور روس پر سخت پابندیاں عائد کی گئیں۔

بین الاقوامی عدالت انصاف اور بین الاقوامی فوجداری عدالت کے حوالے سے بھی یہ دوہرے معیار واضح ہے۔ افریقی ممالک کے یئڑوں کے خلاف مقدمات چلانے کے باوجود امریکہ، چین اور روس جیسے ممالک کے اہلکاروں کے خلاف کارروائی نہیں ہو پاتی۔ امریکہ نے تو بین الاقوامی فوجداری عدالت کے خلاف دوسرے ممالک پر یہ دباؤ ڈالا کہ وہ امریکی شہریوں کے خلاف مقدمات نہ چلانیں۔ اسرائیل کے معاملے میں بھی دوہرے معیار کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ اسرائیل نے کتنی دہائیوں سے فلسطینی علاقوں پر قبضہ جاری رکھا ہوا ہے اور بین الاقوامی قانون کی متعدد خلاف ورزیاں کی ہیں، لیکن سلامتی کو نسل میں امریکی ویٹو کی وجہ سے

اس رائیل کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہو پاتی۔ اس کے برعکس ایران یا شمالی کوریا جیسے ممالک پر معمولی خلاف ورزیوں پر سخت پابندیاں عائد کی جاتی ہیں۔

اس دوہرے معیار کے نتیجے میں بین الاقوامی اداروں کی ساکھ متأثر ہوئی ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں یہ احساس پایا جاتا ہے کہ بین الاقوامی قانون صرف طاقتور ممالک کے مفادات کا تحفظ کرتا ہے۔ اس کے نتیجے میں بین الاقوامی تعاون میں رکاوٹیں پیدا ہوتی ہیں اور عالمی مسائل کے حل مشکل ہو جاتے ہیں۔

موجودہ دور میں یہ مسئلہ اور بھی گمبھیر ہو گیا ہے۔ یوکرین جنگ کے دوران بین الاقوامی رد عمل اور غزہ کے بحران پر رد عمل میں واضح فرق نے اس دوہرے معیار کو مزید عیاں کر دیا ہے۔

اگر بین الاقوامی قانون کے نفاذ میں یکسانیت پیدا نہیں کی گئی تو بین الاقوامی اداروں کی افادیت مزید کم ہوتی جائے گی۔ عالمی قانون کی بالادستی کے لیے ضروری ہے کہ تمام ممالک کے ساتھ یکسان سلوک کیا جائے، چاہے وہ طاقتور ہوں یا کمزور۔ ورنہ بین الاقوامی تعلقات طاقت کے توازن پر بنی رہیں گے اور قانون کی حکمرانی ایک خواب بن کر ہی رہ جائے گا۔ انسانیت جنگوں کی آگ میں جھلسی رہے گی۔

بیسویں صدی میں نفسیاتی جنگ درحقیقت روایتی جنگ کا ایک ناگزیر حصہ بن چکی تھی، جس کا مقصد دشمن کے مورال کو توڑنے کے ساتھ ساتھ عالمی رائے عامہ کو متاثر کرنا بھی تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران اس کی ابتدائی شکلیں دیکھی جا سکتی ہیں جہاں نازی پروپیگنڈا مشنری نے ریڈیو اور پرنٹ میڈیا کے ذریعے اپنے نظریات کو پھیلایا، جبکہ اتحادی افواج نے بھی اسی ہتھیار کا استعمال کیا۔ تاہم سرد جنگ کے آغاز کے ساتھ ہی نفسیاتی جنگ نے ایک نئی اور زیادہ منظم شکل اختیار کر لی۔

سرد جنگ کے دوران امریکہ نے نفسیاتی جنگ کو اپنی خارج پالیسی کا اہم حصہ بنایا۔ ریڈیو فری یورپ اور ریڈیو لبرٹی جیسے اداروں کے ذریعے امریکہ نے مشرقی یورپ میں کمیونسٹ نظریات کے خلاف پروپیگنڈا پھیلایا۔ اسی دوران سی آئی اے نے کانگریس فارکلچرل فریڈم جیسے اداروں کے ذریعے دانشوروں اور فنکاروں کو مالی مدد فراہم کی تاکہ وہ سرمایہ دارانہ نظام کی برتری کو فروغ دے سکیں۔

سنہ 1979 میں ایران کے انقلاب اور افغانستان میں سوویت یونین کی مداخلت نے خطے میں نفسیاتی جنگ کو ایک نیا رخ دیا۔ افغانستان میں مجاہدین کی امریکی حمایت نے صرف عسکری بلکہ نظریاتی محاڑ کھول دیا۔ اس دور میں مذہبی بیانات اور جہادی لٹریچر کو نفسیاتی جنگ کے طور پر استعمال کیا گیا۔ سعودی عرب کی مالی معاونت سے پاکستان میں قائم ہونے والے مدرسون نے نہ صرف مجاہدین تیار کیے بلکہ ایک خاص قسم کی مذہبی سوچ کو بھی پروان چڑھایا۔

سنہ 1990 کی دہائی میں انٹرنیٹ کے ظہور نے نفسیاتی جنگ کی نوعیت ہی بدل دی۔ اب معلومات کی جنگ کا میدان وسیع ہو گیا اور اس کی رفتار میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ نائن الیون کے بعد کے دور میں امریکہ نے اسلامی بنیاد پرستی اور شدت پسندی کے بارے میں اس قدر پروپیگنڈا کیا کہ پوری مسلم دنیا پر دہشتگردی کا ٹیک لگا دیا گیا جس نے شدید ترین اسلاموفوبیا کو جنم دیا۔

اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں عرب بھار کے دوران سو شل میڈیا نے نفسیاتی جنگ میں ایک اہم کردار ادا کیا۔ مغرب کی حمایت یافتہ احتجاجی تحریکوں نے آن لائن پلیٹ فارمز کو اپنے پیغامات پھیلانے کے لیے استعمال کیا۔ اس کام میں fake news، bots، trending topics بنانے جیسی تکنیکوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ موجودہ دور میں نفسیاتی جنگ نے مصنوعی ذہانت اور ڈیپ فیلکس جیسی نئی ٹیکنا لو جیز کو اپنا لیا ہے۔ اب جعل سازی کرنا اور حقیقت جیسے جعلی مواد تیار

کرنا ممکن ہو گیا ہے۔ مغربی طاقیں اب information warfare کے نئے طریقے متعارف کرا رہی ہیں جبکہ گلوبل ڈاؤن ٹک میں بھی ان کے جواب میں ڈیجیٹل رد عمل بڑھ رہا ہے۔

نفسیاتی جنگ کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ اس کے اثرات بھی گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ معاشروں میں اعتماد کا بحران پیدا ہو رہا ہے، حقیقت اور جعل سازی میں فرق کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے، اور جمہوری عمل کو سنگین خطرات لاحق ہو رہے ہیں۔ مستقبل میں یہ رہجان مزید پیچیدہ ہونے کا امکان ہے جبکہ augmented reality اور virtual reality جیسی ٹکنالوجیز نفسیاتی جنگ کے نئے میدان کھولیں گی۔ اس صورت حال میں شہریوں کی ڈیجیٹل خواندگی کو بڑھانا اور میڈیا کے استعمال کے بارے میں آگاہی پیدا کرنا وقت کی اہم ضرورت بن گئی ہے۔

ابھی حال ہی میں بنگلہ دیش، نیپال، انڈونیشیا، فلپائن اور مڈغاسکر میں چلنے والی تمام تر تھاریک سو شل میڈیا پر چلانی گئی تھیں۔ نیپال میں کنیر ٹیکر حکومت ایک ڈسکوئرڈ سرور پر ووٹنگ کے ذریعے منتخب ہوئی تھی جس میں انڈیا میں موجود لوگوں نے بھی ووٹنگ میں حصہ لیا تھا۔ تمام حالیہ تھاریک میں سب سے اہم فیکٹر جنریشن ذی کی شرکت تھی۔ اگر ان عوامل پر قابو نہ پایا گیا تو چھوٹے ملکوں کی حکومتیں مغرب میں بنے الگورنمنٹ میں طے کریں گے۔

بیسویں صدی کے وسط سے مغربی سیاسی اور خفیہ حکمت عملیوں کے نتیجے میں عالمی سطح پر جو تبدیلیاں رونما ہوئیں، انہوں نے بین الاقوامی تعلقات کے دائرے کو ازسر نو تشكیل دیا ہے۔ ان اقدامات کے فوری اور لانگ ٹرم اثرات نے نہ صرف خطوط کی سیاسی جغرافیائی شکل تبدیل کی بلکہ عالمی سطح پر مغربی قیادت اور اقدار کے بارے میں رویوں میں بھی بنیادی تبدیلیاں پیدا کیں۔ سرد جنگ کے دوران لاطینی امریکہ میں کی گئی مداخلتوں کے نتائج آج بھی اس خط کی سیاست کو متاثر کر رہے ہیں۔ گوئٹے مالا میں کی فوجی بغاوت کے بعد قائم ہونے والی فوجی حکومتوں کے خلاف بائیں بازو کی گوریلا تحریکوں نے تین دہائیوں تک خانہ جنگی کو جنم دیا، جس کے نتیجے میں دو لاکھ سے زائد افراد ہلاک ہوئے جن میں سے 93 فیصد مقامی حکومت کے ہاتھوں مارے گئے۔ چلی 1973 کی فوجی بغاوت نے نہ صرف ایک جمہوری حکومت کا خاتمه کیا بلکہ ایک ایسی آمرانہ حکومت قائم کی جس کے دوران تین ہزار سے زائد افراد لاپتہ ہوئے یا انہیں تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ ان واقعات نے لاطینی امریکہ میں امریکہ کے خلاف گہری بداعتمادی پیدا کی، جو آج بھی خط میں بازو کی تحریکوں کی مقبولیت کی بنیادی وجہ ہے۔

مشرق و سطحی میں ایرانی بغاوت کے نتائج نے خط کی سیاست کو ایک نئی سمت دی۔ شاہ ایران کی بحالی نے عوامی غم و غصے کو ہوا دی جو بالآخر اسلامی انقلاب کا باعث بنی۔ اس انقلاب نے نہ صرف ایران کو ایک مذہبی جمہوریہ میں تبدیل کیا بلکہ خط میں امریکی مخالف سیاست کا ایک طاقتو مرکن پیدا کیا۔ افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف جہاد کو امریکی حمایت نے القاعدہ جیسی بین الاقوامی دہشت گرد تنظیموں کے عروج میں اہم کردار ادا کیا جس کے نتیجے میں دہشت گردی کی جنگ نے کئی ملکوں کو تباہ و بر باد کر ڈالا اور مغرب میں تارکین وطن کا بحران پیدا ہوا۔

ایشیا میں انڈونیشیا کے قتل عام کے بعد سہارتو کی حکومت کو مغربی حمایت نے ایک طویل عرصے تک قائم رکھا، جس کے نتیجے میں ملک میں جمہوری ادارے کمزور ہوئے اور بد عنوانی کو فروغ ملا۔ اس کے اثرات آج بھی انڈونیشیا کی سیاست میں محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ ویت نام جنگ نے نہ صرف ویت نام بلکہ امریکہ کے اندر بھی گھرے زخم چھوڑے، جہاں اس جنگ کے خلاف عوامی تحریک نے امریکی معاشرے میں ایک گہری تقسیم پیدا کی۔

افریقہ میں کانگو کے وزیر اعظم پریس لومومبا کے قتل کے بعد موبوتو سیسی سیکو کی حکومت کو مغربی حمایت نے تین دہائیوں تک قائم رکھا، جس کے دوران ملک کے قدرتی وسائل کی لوٹ مار ہوئی اور عوامی فلاح و بہبود کے شعبوں کو یکسر نظر انداز کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں کانگو آج تک سیاسی عدم استحکام اور معاشی بحران کا شکار ہے۔

سرد جنگ کے بعد کے دور میں عراق پر حملے نے مشرق و سطحی میں عدم استحکام کو ہوا دی۔ اس حملے کے نتیجے میں نہ صرف صدام حسین کی حکومت کا خاتمہ ہوا بلکہ ملک میں فرقہ وارانہ تنازعات نے جنم لیا، جس نے بعد میں داعش جیسی تنظیم کے عروج کا راستہ ہموار کیا۔ اس جنگ کے خلاف عالمی سطح پر وسیع یہمانے پر مظاہرے ہوتے، جو مغربی پالیسیوں کے خلاف بڑھتے ہوئے عوامی غم و غصے کا اظہار تھے۔ لپیما، شام، سوڈان، یمن، ان سب ممالک میں ہونے والے امریکی اقدامات کے اثرات ان ممالک کو ہی نہیں پوری دنیا پر پڑیں گے

ان واقعات کے نتیجے میں عالمی سطح پر کئی اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ترقی پذیر ممالک میں مغربی اقدار اور جمہوریت کے بارے میں شکوک و شبہات میں اضافہ ہوا۔ بین الاقوامی فورمز پر مغربی ممالک کی طرف سے انسانی حقوق اور جمہوریت کے فروغ کے بیانات کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا جاتا۔ دنیا بھر میں غیر جمہوری رویے مضبوط ہوتے جا رہے ہیں۔

موجودہ دور میں یہ رد عمل نتی شکلیں اختیار کر رہا ہے۔ لاطینی امریکہ میں بائیں بازو کی حکومتوں کا عروج، مشرق و سطحی میں ایران کے اثر و رسوخ میں اضافہ، اور ایشیا میں چین کی بڑھتی ہوئی طاقت اس بات کی علامت ہیں کہ عالمی طاقت کا توازن تبدیل ہو رہا ہے۔ مستقبل میں اس کے اثرات مزید گھرے ہونے کا امکان ہے، جہاں مغربی طاقتوں کو اپنی پالیسیوں کے نتیجے میں یہاں ہونے والی مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بین الاقوامی تعلقات میں اصولوں اور مفادات کے درمیان بہتر توازن قائم کیے بغیر مغربی قیادت کا بحران مزید گھرا ہو گا۔